رنگا رنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریدہ
ماہنامہ
نئے افق
کراچی
aanchalpk.com
aanchal.com.pk
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
www.paksociety.com

نئے افق

مدیر اعلیٰ
مشتاق احمد قریشی
مدیر
عمران احمد
مدیر معاون
اقبال بھٹی
مدیر خصوصی
طاہر احمد قریشی
منتظمین
نورالدین

جلد	38
شمارہ	03
فروری	2014

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز
رکن چیمبر آف کامرس
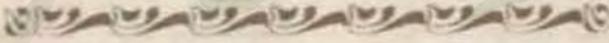
پاکستان (فی پرچہ)............40 روپے
پاکستان (سالانہ)............500 روپے

اشتہارات اور دیگر معلومات
0300-8264242
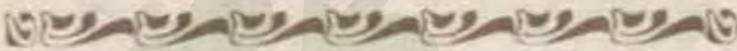
naeyufaqonlinemagzine
aanchal.com.pk
aanchal.com.pk/blog
onlinemagazinepk.com/recipes
editorufaq@aanchal.com.pk

ابتدائیہ

مغرب سے انتخاب

ناول

سلسلے وار ناول

پبلشر، مشتاق احمد قریشی، پرنٹر طاہر قریشی، مطبوعہ نئے افق پرنٹر، کھنڈو گوٹھ بلاک B نارتھ ناظم آباد کراچی
دفتر کا پتہ 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی

متفرق کھانیاں

مستقل سلسلے

پبلشر: مشتاق احمد قریشی، پرنٹر طاہر قریشی، مطبوعہ نئے افق پرنٹرز کھنڈو گوٹھ بلاک B نارتھ ناظم آباد کراچی
دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی

دستک

مشتاق احمد قریشی

موجودہ صورت حال میں اخبارات کا کردار......!

چھپے ہوئے الفاظ کی اہمیت کا احساس آج کے دور میں اخبارات میں شائع ہونے والے الفاظ و تحریر سے خوب ہوتا ہے جب کوئی چھپا ہوا لفظ ملک کے طول و عرض میں آگ لگا دیتا ہے۔ آج کا دور جدید دور ہے۔ خصوصاً ذرائع ابلاغ کی اہمیت نے اپنی حیثیت کو دنیا بھر میں منوالیا ہے۔ خصوصاً پاکستان جیسے ترقی پذیر ممالک میں ان کی اہمیت میں مزید اضافہ ہوگیا ہے گو کہ برقی ذرائع ابلاغ خصوصاً ٹیلی ویژن پرنٹ میڈیا کی اہمیت پر کس قدر اثر انداز ہوا لیکن پرنٹ میڈیا کی اپنی ہی اہمیت ہے اخبارات خصوصاً قومی سطح کے اخبارات جو نہ صرف قومی عوامی مزاج شناس ہوتے ہیں وہی عوامی رائے اور مزاج پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کی ذہنی فکری رہنمائی بھی کرتے ہیں اور معاشرے کے عکاس بھی ہوتے ہیں ایک اچھا اخبار نویس کسی ماہر ڈاکٹر ماہر نفسیات کی مانند ہوتا ہے وہ اپنے پڑھنے والوں پر براہ راست اثر انداز ہوتا ہے ان کی سوچ کے دھاروں کو اپنے قلم کی لکیروں کے ساتھ ساتھ چلاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آج کل اخبارات نے موجودہ صورت حال کو جس تناؤ کھنچاؤ میں کھینچ لیا ہے کہ عدالت کیا کررہی ہے۔ انتظامیہ کیا کررہی ہے۔ حکمران کیا کررہے ہیں اور انہیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ اس سے عوام ایک طرح کے ہیجان میں مبتلا ہوچکے ہیں اوپر سے حکومت گرنے کے عوامل کا پرچار کیا جارہا ہے کرپشن بدعنوانی کو اچھالا جارہا ہے۔ اس سے جہاں عوام میں بے چینی بے کلی پھیل رہی ہے وہیں عوام خصوصاً غریب عوام میں خوف و دہشت کا عنصر نمایاں ہورہا ہے۔ جس طرح خوف زدہ شخص حواس باختہ ہوجاتا ہے بالکل اسی طرح اندرونی و بیرونی دہشت گردی کی خبروں کو اخبارات جس طرح نمایاں کرکے شائع کرتے ہیں اس سے نا صرف دہشت گردوں کو شہہ مل رہی ہے بلکہ عوام میں بھی مایوسی اور ناامیدی پیدا ہورہی ہے۔ چھپے ہوئے لفظوں کی حرمت مٹتی جارہی ہے پہلے اخبار ایک مشن ایک عزم کا نام تھا۔ جب سے اخبار کو صنعت بنایا گیا اس کا وہ اثر وہ قوت ختم تو نہیں ہوئی ہاں کم ضرور ہوگئی ہے۔ ہمیں سوچنا چاہیے سمجھنا چاہیے اور موجودہ صورت حال میں اخبارات کے کردار کو دیکھنا چاہیے آج کی اخبار نویسی خبر تک رسائی سے زیادہ خبر سے رسوائی زیادہ ہوگئی ہے۔ خبر کی اہمیت کو اہلِ اخبار یا اخبار نویسیوں نے بدل کر رکھ دیا ہے۔ اب خبر کے پیچھے نہیں بھاگا جاتا بلکہ خبر خود ہی بھاگتی ناچتی پھرتی ہے۔ اخبارات کن علاقوں میں آج بھی اپنی اثر پذیری قائم رکھے ہوئے ہیں وہ بھی اہم قومی اخبار ہر اخبار نہیں۔ آج بھی ان علاقوں میں جنہیں اہلِ سیاست اور اہلِ علم حضرات کم پڑھے لکھے یا دیہی علاقے کہتے ہیں جہاں ان کے حساب سے تعلیم کا اوسط نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے پورے علاقے یا گاؤں دیہات میں ایک آدھ ہی پڑھا لکھا ہوتا ہے یا زیادہ تر افراد علاقے کے پرائمری اسکول تک پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ وہاں آج بھی قومی اخبارات کا نہ صرف احترام و وقار برقرار ہے بلکہ ان کی خبریں ان کے مضامین و تبصرے ان لوگوں پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں بعض جگہ تو اخبار کی چھپی خبر پر وہ ایمان کی حد تک بھروسا و اعتماد کرتے دیکھے گئے ہیں۔ یقین کی حد تک ان خبروں تبصروں پر اعتماد و اعتبار کیا جاتا ہے' لیکن شہروں میں جہاں تعلیم کا تناسب تقریباً سو فیصد ہوتا ہے وہاں نہ اخبار کی اہمیت باقی رہی نہ ان میں چھپے ہوئے الفاظ کی اہمیت برقرار ہے۔ آج کے معاشرے کے بگاڑ میں دیکھا جائے تو تمام ہی اخبارات کا بڑا حصہ وہاتھ ہے جب کہ ہر روز نت

نئے ناموں سے نکلنے والے اخبارات ان کا تو معاملہ ہی دیگر ہے کیونکہ وہ اخبارات کسی خاص مقصد کسی خاص نظریے کے تحت منظر عام پر لائے جاتے ہیں اور ان میں اکثر برساتی انداز کے ہوتے ہیں۔ جب نکالنے والوں کے مقاصد پورے ہوجاتے ہیں یا ان کا سرمایہ ان کی ناتجربے کاری کی نذر ہوجاتا ہے تو وہ اخبار یا تو کسی طرح غلط لوگوں کے غلط ہاتھوں پڑ جاتا ہے یا بند ہوجاتا ہے لیکن جتنے عرصے بھی نکلتا ہے وہ اپنی ڈفلی اپنا ہی راگ الاپتا ہے۔

آج کا اخبار نویس الفاظ کی اہمیت خصوصاً چھپے ہوئے الفاظ کی اہمیت سے یا تو ناواقف ہے یا اگر کسی طرح ہے بھی تو وہ بھولتا جارہا ہے یا پھر اسے اتنی فرصت ہی نہیں کہ وہ اپنے لکھے ہوئے چھاپے ہوئے الفاظ کے زیروبم پر نظر رکھے اور دیکھے بھالے کہ اس سے کیا اثرات مرتب ہوئے یا ہوسکتے ہیں۔ پہلے کے اخبار نویس جو اخبار نکالا کرتے تھے وہ پوری ذمہ داری کے احساس کے ساتھ لکھتے تھے چھپتے تھے اور بھرپور انداز میں اثر انداز ہونا جانتے تھے اور واقعی اثر انداز ہوتے بھی تھے آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے شائع ہونے والے اخبارات اپنی تعداد اشاعت میں محدود ہوا کرتے تھے آج کی طرح ہزاروں لاکھوں میں تو نہیں شائع ہوتے تھے لیکن جتنے بھی جیسے بھی شائع ہوتے تھے وہ اپنے اندر ایک قوت ایک روشنی ایک اثر ضرور رکھتے تھے۔ لوگ انہیں آج کے اخبارات کی مانند ردی میں نہیں تولا کرتے تھے۔ وہ چند سو والی اشاعت کے اخبارات آج بھی کسی نہ کسی اہم اور بڑی لائبریری میں ضرور محفوظ مل جاتے ہیں لیکن جدید دور کے جدید اخبارات کا ریکارڈ ان کے اپنے دفاتر میں مشکل سے دستیاب ہوتا ہے تو پھر لائبریری میں ملنے کا کیا سوال اور جواز ہوسکتا ہے۔ ہاں جو بڑے اور اہم قومی اخبارات ہیں وہ اپنی اہمیت کے باعث نا صرف اپنے دفاتر میں بلکہ تمام پبلک لائبریریوں میں ہی محفوظ کیے جاتے ہیں' لیکن ان کے لب ولہجے نے اب اپنا وہ اثر کھودیا ہے جو آج سے بیس تیس سال پہلے تک قائم تھا۔ آج وہ بھی اس بھیڑ چال کا شکار ہوکر رہ گئے ہیں بلکہ اگر یوں کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ صحافت کے حمام میں اب سب ہی برہنہ ہوگئے ہیں ہر کسی کو قوم سے کہیں زیادہ اپنے وہ بھی ذاتی مفادات عزیز ہوچکے ہیں' اگر کوئی اخبار کسی طرح کی جرأت رندانہ دکھانے کی کوشش بھی کرتا ہے تو پس پردہ حقیقت کچھ اور ہی ہوتی ہے آج کا دور مول تول کا دور ہے اگر گھی سیدھی انگلی نہیں نکل رہا ہوتا تو ان بے چاروں کو مجبوراً اپنی انگلیاں ٹیڑھی کرنا پڑتی ہیں بلکہ آنکھیں بھی ٹیڑھی ہوجاتی ہیں یہی وجہ ہے کہ جس طرح ملک میں صرف اور صرف مفادات اور وہ بھی ذاتی مفادات قومی اور عوامی نہیں کی سیاست ہورہی ہے۔ بالکل اسی طرح آج کی صحافت بالکل تجارتی پیمانے پر مفادات اور ہوس کی صحافت ہورہی ہے۔ اب جب کہ حالات اور واقعات بھی زیادہ اور حادثات بھی پہلے سے کہیں زیادہ رونما ہوتے ہیں یعنی خبریں آسانی سے اور زیادہ حاصل ہورہی ہیں۔ ایسے ہی کالم نگار وقائع نگار بھی بھرپور انداز میں لکھ رہے ہیں۔ لیکن ان کے پس پردہ حقیقتوں سے کون واقف ہے۔ یہاں تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ کس کس کو روئیں کس کس کی فریاد کریں ملک کی تنزلی اور ترقی معکوس میں ہم سب کے ساتھ ساتھ ان اخبارات کا بھی بڑا حصہ ہے جو سچ کو سچ نہیں لکھتے اور جھوٹ اور فریب کو ایسی رنگ آمیزی اور خوب صورت بنا بنا کر پیش کرتے ہیں کہ لوگ اش اش کر اٹھیں۔ اللہ ہمیں اور ہمارے اہل سیاست اور صحافت کو ہی ہدایت نہ دے بلکہ ہم اہل پاکستان کو بھی ہدایت دے اور سیدھی راہ پر لگائے۔ آمین

گفتگو

عمران احمد

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مومنوں کی مثال آپس میں محبت، وابستگی اور ایک دوسرے پر رحم وشفقت کے معاملے میں ایسی ہے جیسے ایک جسم کی حالت ہوتی ہے کہ اس کے کسی عضو کو تکلیف ہو تو سارا جسم بخار اور بے خوابی میں مبتلا ہوتا ہے۔'' (بخاری ومسلم)

عزیزانِ محترم...... سلامت باشد

فروری 2014ء کا شمارہ حاضر خدمت ہے

عالم اسلام فلسطین، عراق، شام خصوصاً ہمارے وطنِ عزیز پاکستان میں جاری قتل وغارت کے باوجود قوم نے نئے عیسوی سال کا جشن پہلے سے زیادہ جوش وخروش سے منایا اس حوالے سے ایک محتاط اندازے کے مطابق اربوں ڈالر کے قرضہ میں جکڑی قوم نے تمام تر پابندیوں کے باوجود کروڑوں روپے پھونک دیئے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ یہ سب کچھ تعلیم سے آراستہ نوجوان لڑکے لڑکیوں بلکہ خاندانوں نے کیا۔ یہ سوچے سمجھے بنا کہ ہمارے ملک کی بڑی آبادی پینے کے صاف پانی، تعلیم اور صحت کی سہولتوں سے محروم ہے صرف اس لیے کہ اس مد میں فنڈ کی کمی کا سامنا ہے۔ دوسرے یہ ہمارا دینی قومی اور ثقافتی تہوار بھی نہیں ہے ہمارے نئے سال کا آغاز تو محرم سے ہوتا ہے جس کی ابتدا دنیا کے سب سے بڑے منصف مزاج مسلمانوں کے خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قربانی سے ہوتا ہے۔ سال کا اختتام ہمارے پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے جدامجد حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی سے ہوتا ہے مگر ہم بس آنکھیں بند کیے غیروں کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ اب خیر سے ایک اور فواحش سے بھرا تہوار ویلنٹائن ڈے آرہا ہے اس تہوار میں تو اللہ تعالیٰ معاف کرے ہم نے انتہائی میچور خواتین کو بھی سرخ لباس میں یا کم از کم سرخ دوپٹہ نما دھجی کاندھوں پر ڈالے دیکھا ہے۔ اللہ ہمارے حال پر رحم فرمائے۔

نئے افق کی کہانیوں میں کچھ تبدیلی کی گئی ہے اسے آپ سب نے محسوس بھی کیا ہوگا۔ اب ہم کہانیوں کا انداز تبدیل کرنے کا سوچ رہے ہیں۔ معاشرے میں ہمارے اردگرد عجیب وغریب ڈرا دینے والے واقعات رونما ہوتے ہیں یا ایسے واقعات جو ماورایت کی بنا پر ہمیں متاثر کرتے ہیں اس طرح کے واقعات قلم بند کیجیے اور ہمیں لکھ بھیجیں۔ اس سلسلے میں ایک اشتہار شائع کیا جارہا ہے جس میں ساری تفصیل موجود ہے اسے پڑھیں اور اس قسم کی کہانیاں لکھنا شروع کردیں۔

آج کل ملک کے طول وعرض میں مدتوں بعد موسم سرما نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں، کئی علاقوں میں تو برفباری اور سردی کا پچاس سالہ ریکارڈ تک ٹوٹ گیا ہے جہاں یہ موسم زحمت بنا ہے وہاں رحمت کا باعث بھی ہے۔ پہاڑوں پر برفباری سے ہمارے ذخیرہ آب میں بھی اضافہ ہوگا جب ڈیم بھریں گے تو بجلی کی پیداوار میں اضافہ ہوگا۔ بجلی ہوگی تو صنعتیں چلیں گی، صنعت کا پہیہ چلے گا تو ملک ترقی کرے گا اس ترقی کے ساتھ قوم بھی خوشحال ہوگی اللہ تعالیٰ اس قوم اور پورے عالم اسلام کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔

ہم ادارہ نئے افق کے اراکین طاہرہ جبین تارا لاہور کے ماموں کے انتقال پر غم زدہ ہے اللہ تعالیٰ تارا اور ان

کے اہل خانہ کو صبر جمیل کی توفیق دے اور ان کے ماموں کو جنت الفردوس میں جگہ دے تمام قارئین طاہرہ اور ریحانہ کے ماموں کے لیے دعائے خیر کریں۔ علاوہ ازیں ہمارے اور سب قارئین کے دیرینہ رفیق فقیر محمد بخش صابر لنگاہ ادنوں شدید علیل ہیں۔ اللہ رب العزت انہیں صحت کاملہ عطا فرمائے' ان کے لیے بھی خصوصی دعا کیا اپیل ہے۔

طاہرہ جبین تارآ...... لاہور سے رقم طراز ہیں محترمی عمران صاحب آداب! امید ہے خیریت سے ہوں گے گیا برس جاتے جاتے بہت بڑا صدمہ دے گیا میرے ماموں جو نئے افق کے خاموش قاری تھے ہمیں داغ مفارقت دے گئے ماموں بہت تھوڑی عمر لے کر آئے تھے ان کی اچانک ڈیتھ نے ہمیں توڑ کر رکھ دیا ہے مجھے اور ریحانہ کو نئے افق اور سی آئی ڈی ڈرامے سے انہوں نے ہی متعارف کروایا تھا اور پھر ہم کہانیوں پر اور ڈراموں پر خوب بحث کرتے تھے سب سے چھوٹا اور فرینڈلی ہونے کی وجہ سے ان سے سب فرینک تھے ان کی موت بھولتی نہیں ہے یکم محرم تو واقعی ہمارے لیے محرم ثابت ہوا۔ نئے افق کا ٹائٹل بھی خزاں کا تاثر لیے ہوئے تھا ٹنڈ منڈ درخت زوال کی کہانی سنا رہا ہے یعنی ہر چیز کو زوال ہے انکل مشتاق کی دستک لمحہ فکریہ ہے ہم سود در سود قرض میں جکڑے ہوئے ہیں حکمران اپنا بینک بیلنس بنا رہے ہیں اور غریب غریب تر ہو رہے ہیں طاہر صاحب کی اقراء نے دل کو روشن کر دیا کاش ہم نیکی اور بدی میں تمیز کر کے اپنی عاقبت سنوار سکیں' آتش زیر پا' سب سے بہترین جا رہی ہے سطر سطر پر تجسس یعقوب بھٹی صاحب ویل ڈن' قلندر ذات اور جگت سنگھ' بھی بہت زبردست ہیں جنھوں نے نئے افق کو چار چاند لگا دیئے ہیں' درندہ' کی اس دفعہ کی قسط کچھ بہتر تھی' دلدل' ایک سبق آموز کہانی تھی مغرب پرستی نے ہم سے حرام اور حلال کا فرق چھین لیا ہے اللہ ہمیں سیدھے راستے پر چلائے گواہی بے گناہ کا خون ضرور رنگ لاتا ہے' چہرہ شناس' ماں اپنی اولاد کے لیے اس کو خوش دیکھنے کے لیے ہر قدم اٹھا لیتی ہے' انگلی کا ہنگامہ' "انگلش مووی کا گمان ہوا" "آخری خط" والدین کو اولاد کی بات ضرور سننی چاہیے ورنہ دونوں کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے عرفان کا کردار اچھا لگا جس نے محبت پر والدین اور بہنوں کو ترجیح دی محبت قربانی کا نام ہے بدنامی کا نہیں "گورکھ دھندہ" "بس ٹھیک ہی تھی" "جوا" لالچ بری بلا ہے مستقبل کے لئے انسان محنت کرتا ہے کسی کے جذبات سے نہیں کھیلتا بہت سے ساتھی غائب ہیں حاضری دیں عمر فاروق صاحب صنف نازک ڈرامہ باز نہیں ہاں ہوسکتا ہے آپ نے ڈرامہ بازی کی ہو کسی کے ساتھ کیونکہ مرد ڈرامہ باز ہوسکتا ہے عورت نہیں اللہ نے عورت کو بہت حساس دل دیا ہے اس لیے وہ ذرا سے دکھ پر تڑپ اٹھتی ہے اس کی تڑپ کو ڈرامہ بازی کا نام دینا غلط بات ہے شہناز آپی میری مٹھائی بھجوا دیں اسعد بھائی کو منگنی کی بہت بہت مبارک ہو لیکن مٹھائی ڈیو ہے فقیر انکل آپ کہاں ہیں ہمیں آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے کہانی لکھی ہے مگر ابھی ادھوری ہے جلد ہی مکمل کر کے میل کروں گی سب قارئین کی خدمت میں سلام عرض کر دیں اور نئے افق سجانے والوں کی خدمت میں بھی سلام عرض ہو نیا سال سب کے لیے نوید سحر ثابت ہو بہت ساری دعاؤں کے ساتھ اللہ حافظ۔

ایمن شاہین...... واہ کینٹ۔ اہالیان نئے افق/عمران بھائی ڈھیروں دعائیں اور نئے سال کی مبارک باد۔ مبارک دینے سے یاد آیا کہ مبارکبادیں تو بھی دے دیتے ہیں پر کسی کو سال مبارک آتا ہے اور کسی کو نہیں خیر دعا تو یہی ہے کہ یہ نیا سال سب کے لیے خوشیوں کی نوید لائے اور مصائب و آفات سے بچائے اور یہ تبھی ممکن ہے جب اعمال کی درستگی کی جائے۔ قریشی صاحب کی دستک پڑھ کر ان سے اتفاق کرتے ہیں کیونکہ یہ سب سلسلے سالوں سے جاری ہیں یہ وہ تاریکیاں ہیں جن کی سحر ہونے کا کوئی یقین نہیں اور نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ

آئندہ سال میں دہشتگردی ختم ہوگی یا بے روزگاری بہر حال امید پر دنیا قائم ہے اور دعاؤں میں اثر ہے اللہ تعالیٰ کا سہارا ہے۔ راہنمائی کے لیے کتاب عظیم ہے اور اطاعت الٰہی اور سنت رسولؐ پر چلنے میں نجات ہے علم بہت سوں کے بہت پاس ہے بس عمل کی ضرورت ہے۔ گفتگو میں عمران صاحب کا کہا ہر ایک لفظ بھی سچ ہے اگر میں لکھوں تو میرا بیان بھی یہی ہوگا ویسے کیا ہم نے کبھی سوچا کہ ہمارے نبی پاکؐ نے ہمارے لیے کتنا کچھ کیا تو کیا ہم بروز محشر ان کا سامنا کر پائیں گے۔ سر اٹھا پائیں گے ایک ہم ہیں کہ اپنے سوا اللہ رب العزت سے کسی اور کی بھلائی تک نہیں مانگتے۔ خیر صدارتی کرسی پر تشریف فرما شہناز آنٹی کو سلام اور مبارک باد شکریہ آپ کا اسم گرامی ایک بار پھر فہرست میں شامل ہوگیا۔ دلی خوشی ہوئی آنٹی دعاؤں کی طلبگار ہوں آپ جانتی ہیں نا کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے میرے ساتھ سو جبھی اپنی خصوصی دعاؤں میں یاد رکھیے گا اسعد علی بھائی کی منگنی کی مبارکباد۔ عمر فاروق صاحب سلام آپ کے لیے کہہ سکتی ہوں کہ تسی کمال بندے ہو جی ٹھاہ کر کے تبصرہ کرنے والے۔ ریاض بھائی سلام تبصرہ خوب تھا۔ انجم صاحب فہرست میں آپ اس بار بھی غائب ہی ہیں اور کہنے والے تو کچھ بھی کہہ دیتے ہیں پر (سہنے) سننے والے کو کمال کر دینا چاہیے۔ بشیر احمد صاحب آپ کی باتوں سے متفق ہوں۔ نئے افق کے بارے میں محمد اسلم نہایت مختصر تبصرے کے ساتھ تشریف فرما ہوئے۔ ریاض حسین کے ساتھ ساتھ این شاہین بھی اپنے لنگاہ انکل کے لیے فکر مند ہے اور دعا گو انکل حاضری لگا کر تسلی کر دیجیے منتظر ہیں سب گفتگو والے۔ آخر میں مبارک علی صاحب کا تبصرہ پڑھنے کو ملا۔ ہائیں یہ کیا اس بار صرف 8 ہی خطوط باقی سب کہاں گئے بھئی، شہنی صاحبہ، عالیہ صاحبہ، مقبول جاوید صاحب، حیدر صاحب، عصمت صاحبہ اور عبداللہ شاہد صاحب اور بہت سے لوگ بھی معذرت سب سے کیونکہ اگر نام لکھنے لگ جاؤں تو اور کچھ لکھنے کو جگہ ہی نہیں رہے گی۔ اقرأ میں طاہر صاحب نے بہت ہی پیاری حدیث بیان کی۔ نیکی اور گناہ کے بارے میں اسے پڑھنے والے تو بہت سے ہوں گے عمل کرنے والے شاذ و نادر ہی کیونکہ گناہ دل میں کھٹکتا تو ضرور ہے پر دل کی اس معاملے میں سنتا ہی کون ہے کیونکہ گناہ کی لذت ہی کچھ عجیب لگتی ہے اور جو لذتوں کے عادی ہو جائیں ان کے دل میں گناہ کا احساس بھی مٹ جاتا ہے اللہ پاک معاف فرمائے۔ کہانیوں میں آتش زیر پا کی تیسری قسط پڑھنے کو ملی زبردست رہی کمالا جٹ ایک مصیبت سے نپٹ کر بارڈر تو کراس کر گیا مگر اب کون سی نئی بلا سے پالا پڑنے والا ہے اس کے لیے اگلے ماہ کا انتظار کرنا ہوگا۔ ناصر چغتائی کی ''چہرہ شناس'' بھی خوب تھی۔ ماں اپنی اولاد کے لیے کچھ بھی کر گزرتی ہے پر اولادیں کم ہی ہوتی ہیں جو ماؤں کی قدر کرتی ہیں۔ اسرار احمد صاحب کی انگلی کا ہنگامہ بھی سبق آموز ہی تھی جرم چاہے سات پردوں میں ہی کیوں نہ کیا جائے ایک نہ ایک دن سامنے آ ہی جاتا ہے چاہے کتنے ہی جتن کیے گئے ہوں۔ ''درندہ'' اس بار کچھ بہتر ہی رہی۔ خلیل جبار کی ''جوا'' سے یہی پتا چلتا ہے کہ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے ندیم نے بے شک قربانی دی مگر ساتھ ہی اپنی جان بھی خطرے میں ڈال دی اور یہ سب ہونے کی وجہ یہ بھی ہے نا کہ مصیبت کے وقت مشکل فیصلہ کی اس گھڑی میں دوست ساتھ دینے کے بجائے تنہا ہی کر گئے وہ دوست ہی کیا جو مشکل میں ساتھ چھوڑ جائے۔ شہناز بانو آنٹی جی کی ''دلدل'' سے سبق حاصل کرنے کے بعد ''قلندر ذات'' کی باری ہے۔ زبردست رہی اب پتا نہیں جمال صاحب قتل کر کے بھاگتے ہی رہیں گے یا کچھ اور بھی کریں گے۔ درخشاں انجم کی ''روح کی گواہی'' بھی خوب رہی پسند آئی۔ ریاض بٹ صاحب کا ''آخری خط'' پڑھنے کو ملا شکر ہے کہ اس بار کچھ بھی قتل و غارت کے بغیر ہی انجام اچھا ہوگیا۔ آشبہ مخدوم کی کہانی عجیب سی لگی پتا نہیں ''گورکھ دھندہ'' ہے یا ''گورہ دھندہ'' روحانی علاج کے بعد خوشبوئے سخن میں جھانکا بھی نظمیں، غزلیں

ٹھیک ہی تھیں۔ ''ذوق آ گہی'' کی تمام تحریریں بے مثال تھیں۔ آخر میں ''جگت سنگھ'' جو کہ میں ہمیشہ پہلے پڑھتی ہوں کیونکہ میری سب سے پسندیدہ یہی ہے اور اس کا تو مجھے بے صبری سے انتظار رہتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس بار کا شمارہ ختم ہوتا ہے اور میرا خط بھی ان شاء اللہ زندگی رہی تو پھر حاضر ہوں گی کیونکہ پچھلے چند ماہ سے بے حد مصروفیت تھی اور بیماری بھی سو تمام قارئین ساتھیوں سے دعا کی اپیل کرتی ہوں اور تمام غلطیوں کی کوتاہی یا کسی کی بھی دل آزاری ہوگئی ہو تو کھلے دل سے معافی چاہتی ہوں اپنا ڈھیر سارا خیال رکھیے گا۔ اللہ پاک ہم سب کا اور پاکستان کا حامی وناصر ہو آمین۔ اللہ حافظ

عمر فاروق ارشد...... فورٹ عباس۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔ لیں جناب ٹھنڈے ٹھار موسم میں تبصرے کا گرم گرما ٹوکرا اٹھائے محفل میں شرکت کے لیے ہم بھی پہنچ ہی گئے۔ جنوری کا نئے افق توقع سے بہت پہلے ہاتھوں میں آ گیا۔ ٹائٹل پت جھڑ کی بے دردی کا عکاس ثابت ہوا۔ بات یہ ہے کہ خزاں زندگی میں ہو یا موسم میں بڑی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ بہرحال ہمت کر کے اندر داخل ہوئے دستک اور اقرا کی کرنوں سے فیض یاب ہوتے ہی سیدھا خطوط کا رخ کیا۔ ماشاء اللہ سے گفتگو کی محفل خاصے ہنگامے لیے ہوئے تھی۔ کرسی صدارت پر غالباً شہناز بانو نے مسلسل ڈیرا جمایا ہوا ہے چلیں جی اپنی اپنی قسمت ان کا تبصرہ اچھا تھا لیکن مجھے ایک بات ہضم نہیں ہو رہی ایک طرف محترمہ درندہ نامی ناول کے مصنف کو مفید مشورے دے رہی ہیں جبکہ دوسری طرف خود اپنی کہانی کا آغاز ہی انتہائی کھلے ڈھلے اور نازیبا سے الفاظ کے ساتھ کیا۔ یقین کریں مجھے اتنی حیرت ہوئی کہ کیا بتاؤں قول وفعل میں اتنا تضاد؟ شہناز بانو صاحبہ عورت کے متعلق آپ کے نظریات واحساسات سے ایسا لگتا ہے کہ جیسے عورت کی اس دنیا میں سوائے جسمانی لذت کے اور کوئی اہمیت نہیں۔ آپ کو قبلہ درست کرنے کی ضرورت ہے۔ انجم فاروق صاحب کی آنکھ کافی دیر سے کھلی اور پورا تبصرہ ہی اپنے دفاع میں کر دیا۔ یار میں یہ سمجھتا ہوں کہ تنقید کرنے والے چاہے کیسی بھی تنقید کریں جائز یا ناجائز لکھاری کو دماغ ٹھنڈا رکھنا چاہیے۔ اگر لکھاری اپنی صفائیاں دینے بیٹھ جائیں تو یہ ان کی ناپختگی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ ٹیکنیکل خامی کیا ہوتی ہے؟ اس کی وضاحت بھی آپ کر دیتے تو اچھا ہوتا۔ شاید آپ کو یہ نہیں معلوم کہ نقاد اور انجینئر میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی کہانی پر تبصرہ کرنا اور کسی مشین کو کھول کر دیکھنا دو مختلف کام ہیں ویسے اگر آپ کو اپنی کہانی میں ٹیکنیکل نقص کی تلاش ہے تو کسی قابل انجینئر سے رابطہ کریں امید ہے کہ وہ کہانی کے ساتھ ساتھ آپ کے پرزے بھی اچھی طرح ڈھیلے کر دے گا۔ باقی ہم تو بس سادہ سے انداز میں ہی اصلاح کر سکتے ہیں۔ دوسرے ساتھیوں کے تبصرے اچھے تھے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف ''انگلی کا ہنگامہ'' اس ماہ کی سب سے اچھی تحریر رہی۔ لکھاری تجسس اور دلچسپی آخر تک قائم کرنے میں کامیاب رہے۔ ''دلدل'' کے بارے میں پہلے ہی اپنا نقطہ نظر واضح کر چکا ہوں کہانی اگرچہ ٹھیک تھی لیکن بہنا کا قلم بار بار بھٹکتا رہا۔ امید کرتا ہوں کہ آئندہ شہناز بانو صاحبہ اتنے بولڈ انداز میں کہانی لے کر نہیں آئیں گی۔ روح کی گواہی اور گورکھ دھندا دونوں تحریریں پراسراریت پیدا کرنے میں تقریباً کامیاب رہیں۔ اس دفعہ ریاض بٹ صاحب نے بھی واقعی کمال کر دیا۔ ریاض بھائی مجھے آپ کی یہ کہانی بہت پسند آئی ہے۔ اس طرح کی کہانیاں چاہے آپ روزانہ کی بنیاد پر شائع کروایا کریں۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ (ہاہاہا) اللہ آپ کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ جہاں تک سلسلے وار ناول کا تعلق ہے تو فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کس کو بہترین قرار دیا جائے۔ ویسے آتش زیر پا زیادہ متاثر کر رہا ہے۔ امجد جاوید صاحب بھی پورے وزن کے ساتھ میدان میں موجود ہیں۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ خوش بو سخن میں ریحانہ سعیدہ نے عمدہ

لکھا۔ اس کے علاوہ نیر رضوی کا انداز غزل قابل ستائش ہے۔ بہت ہی اچھی غزل تھی ان کی۔ مجموئی طور پر شمارہ کامیاب کہلوانے کا حقدار ہے۔ سال کا پہلا شمارہ ہونا بھی ایسا چاہیے تھا۔ عمران بھائی جاتے ہوئے آپ کو ایک خوش خبری سناؤں کہ ہم چند دوستوں نے اپنے کالج میں نئے افق کی ترسیل کو اسٹوڈنٹس میں زیادہ سے زیادہ بڑھانے کے لیے افق انجمن کی بنیاد رکھ دی ہے جس کا اولین مقصد یہ ہے کہ نئے افق کو زیادہ لوگوں تک پہنچایا جائے۔ اس کے لیے ہمارا پہلا ٹارگٹ 20 شمارے ہیں بس آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔ جلد ہی میری سربراہی میں اس کام کو بھرپور انداز میں آگے بڑھایا جائے گا۔ خیر آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عالم اسلام کو کفر کی سازشوں سے محفوظ رکھے آمین والسلام۔

شجاع جعفری...... تلہ گنگ۔ السلام علیکم! امید ہے کہ آپ قارئین اور نئے افق کا تمام اسٹاف بخیر و عافیت ہوں گے۔ اس دفعہ ماہنامہ 24 تاریخ کو مل گیا۔ سرورق ہمیشہ کی طرح اپنی مثال آپ تھا۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ بالخصوص جگت سنگھ اور دلدل۔ خوشبوئے سخن میں تمام شعرا کا کلام اچھا تھا۔ بالخصوص نظم ''دسمبر پھر سے لوٹ آؤ'' اور ''گیت'' اس کے ساتھ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو سچا پاکستانی، اسلامی اور نیک بننے کی توفیق عطا فرمائے آمین

بشیر احمد بھٹی...... بہاولپور۔ محترم جناب عمران احمد صاحب السلام علیکم۔ آپ کو آپ کے تمام اسٹاف کو قارئین نئے افق کو نیا سال مبارک ہو۔ جنوری 2014ء کا نئے افق لیا ٹائٹل سینری خوب صورت ہے۔ اس دفعہ کتابت میں کچھ غلطیاں ہیں۔ ذوق آگہی میں نماز کے بارے میں آپ نے میرا مضمون شائع کیا شکریہ۔ عجیب و غریب کہانیوں کا اشتہار باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے ابھی تک یہ سلسلہ شروع نہیں ہوا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ شاید اگلے شمارے میں یہ سلسلہ شروع ہو جائے۔ ماضی میں نئے افق اور نیا رخ میں انگریزی ناولوں کے ترجمہ موجود ہوتے تھے۔ کبھی کبھار ایک انگریزی ناول کا ترجمہ بھی شائع کر دیا کریں۔ مرحوم ابن صفی کے ناول پڑھے ایک عرصہ گزر چکا ہے۔ عمران، جولیا ایکسٹو کے کردار تھے جو قارئین کے ذہنوں پر آج بھی نقش ہیں۔ نئے افق کے صفحات بڑھا کر ایک بار پھر ماضی کے وہ ناول شائع فرمائیں، شکریہ۔ اللہ حافظ

فقیر محمد بخش صابر لنگاہ...... خانیوال۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ عزیزمن عمران احمد و ہم نوا ساتھی، بہن بھائی بزرگو میں فقیر محمد بخش صابر لنگاہ کافی عرصہ سے شوگر، ہائی بلڈ پریشر کا مریض تو چلا آ رہا تھا لیکن مورخہ 12 اکتوبر 2013ء کو فالج کا اٹیک بھی ہو گیا جس کا زیادہ اثر بائیں سائیڈ کو مفلوج کر گیا چلنے پھرنے کی طاقت ختم ہو گئی اور اس کا اثر آنکھوں پر بھی آیا۔ علاج کی مد میں نشتر ہسپتال ملتان اور لیہ میں ڈاکٹر خالد رفیق صاحب کی بہتر اور توجہ سے مسیحائی و توجہ اور میرے دونوں صاحب زادوں محمد شفاعت حسنین صابر لنگاہ، محمد ثقلین صابر لنگاہ اور میرے دوستوں حاجی محمد سلیم چوہدری ADF، عاشر عظیم DOF صاحبان کی ان تھک دوڑ دھوپ اور لگن نے مجھے کچھ نہ کچھ بہتر کر دیا ہے کہ اب میں اٹھ کر بیٹھ سکتا ہوں اور قلم بھی تھوڑا بہت چلانے کی طاقت پیدا ہو گئی ہے علاج تا حال جاری ہے یہ ہے میرے خیر و خیریت سے ہونے کی اطلاع۔ نئے افق متواتر بروقت بذریعہ ڈاک موصول ہو رہا ہے لیکن بوجہ سخت بیماری کے مطالعہ نہیں کر پا رہا بس میز کی دراز میں جمع کیا جا رہا ہے صحت یاب ہو جانے کے بعد جمع شدہ تمام شماروں کا مطالعہ کروں گا۔ سب سے زیادہ عزیز ہستی جو مجھے ملی اور اللہ پاک نے عطا کی وہ عرصہ پانچ سال ہوئے مجھے دنیا کی بھیڑ میں اکیلا چھوڑ کر اللہ پاک کے حضور چلی گئی اور میں ادھورا ہو کر بیمار ہو کر رہ گیا۔ اللہ تعالیٰ میری اہلیہ کو جنت نصیب کرے۔ ماہنامہ نئے افق نے مجھے بہت

خوب صورت رشتوں سے نوازا جن میں بہن شہناز بانو بیٹی عالیہ انعام الٰہی وشبنی ارشاد بیٹا سرور شاد فاروق انجم ساحلی بھائی ابن مقبول جاوید احمد صدیقی' ریاض بٹ صاحب اور دیگر کئی اہم ہستیاں خواتین وحضرات موجود ہیں جنہوں نے مجھے بھرپور محبت اور دعاؤں سے نوازا لیکن شاید وہ اب مجھے بالکل بھول گئے ہیں مجھے کسی سے کوئی ناراضگی نہیں کیونکہ اسی کا نام زندگی ہے دیگر ماہنامہ کے مدیر و مدیر اعلیٰ صاحبان نے بھی مجھے بھلا دیا کہ فقیر زندہ بھی ہے یا اللہ پاک کو پیارا ہو گیا۔ باقی جن دوستوں بہن بھائیوں نے مجھے یاد رکھا ان کا بھی شکریہ اور جو لوگ مجھے بالکل بھول گئے ان کے لیے بھی دعائے خیر اور سب کے لیے سلام محبت کا نذرانہ پیش ہے۔ 2014ء کا آغاز ہو چکا ہے اس کے لیے بھی دعا کہ سب کے لیے خیر و برکت کا سال ثابت ہوا۔ طاہرہ جبیں تارا' ابن شاہین' ریاض احمد صاحب' دلشاد حسین صاحب' سمیرا صابر بیگ' حنا ناز' حاجی نور الٰہی جٹ' تہمینہ بشیر وسدرہ بشریٰ ہاشمی' ناصر احمد خان ڈاھا کے لیے ماہ نامہ کی وساطت سے گفتگو خصوصاً سلام و دعا میری صحت کے لیے آپ سب دعا کریں' شکریہ۔ دیگر زندگی رہی تو پھر محفل خاندان نئے افق گفتگو کے سنگ ملاقات ہوگی کے بعد ڈھیر ساری دعائیں' پیار' سلام محبت کے بعد والسلام۔

ریاض حسین قمر ...... منگلا ڈیم۔ محترم ومکرم عمران احمد صاحب سلام مسنون' امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ آپ اور آپ کا مخلص عملہ ماہ فروری کے شمارے کی نوک پلک سنوارنے میں مصروف ہوں گے' رب ذوالجلال آپ سب کو ہمت اور حوصلہ عطا فرمائے' آمین۔ نئے سال کا پہلا شمارہ پیش نظر ہے' ٹائٹل بہت خوب صورت ہے اور سردیوں کے موسم کی صحیح عکاسی کررہا ہے' مصور صاحب لائق مبارک باد ہیں۔ دستک میں محترم ومکرم مشتاق احمد قریشی صاحب کی دردمندی واضح ہے' کاش ہمارے رہنماؤں کی آنکھیں اور کان ہوتے اور وہ کونے کونے سے بلند ہوتی آوازوں کو سن سکتے اور وطن عزیز میں رونما ہونے والے واقعات کو دیکھ سکتے اے کاش۔ گفتگو کا آغاز حسب معمول ایک پیاری حدیث مبارک سے ہوا' گفتگو شروع کرنے سے پہلے آپ نے مختصر بات میں بہت کچھ کہہ دیا ہے' کاش کوئی اس کو سمجھ سکے۔ کرسی صدارت پر براجمان شہناز آپی اس بار قارئین کے لیے دلدل کا تحفہ بھی لائی ہیں' ویل ڈن آپی شہناز بانو! دلدل اچھے موضوع پر ایک اچھی تحریر تھی۔ عمران بھائی اس بار گفتگو کے انداز سے تھوڑی سی بے توجہی ظاہر ہو رہی تھی خلاف توقع کل سات قارئین کے خطوط شامل تھے' محفل کا رنگ بہت حد تک پھیکا تھا۔ نئے افق میں گفتگو ایک ایسا حصہ ہے جس میں چاہتوں کے پھول کھلتے ہیں' قارئین ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں۔ روٹھتے ہیں اور مناتے ہیں مگر اس بار کی گفتگو میں ان باتوں کا فقدان تھا۔ پلیز کوشش کریں کہ گفتگو میں پرانا رنگ پھر بھر آئے۔ اس بار خوشبوئے سخن کے لیے بہت کم صفحات مختص کیے گئے تھے لامحالہ بہت کم شاعروں کو شمولیت کا موقع مل سکا پلیز ان باتوں پر پوری توجہ مرکوز فرمائیں۔ گفتگو میں شامل قارئین نے اپنا اپنا حق ادا کیا ہے' پرانے دوستوں سے ملاقات کو بہت جی چاہتا ہے' کاش وہ سب لوٹ آئیں تو محفل کا پھر وہی رنگ ابھر آئے۔ خوش خبری یہ ہے کہ میرے منجھلے بیٹے الخیر محمد عثمان کو اللہ تعالیٰ نے شادی کے ساڑھے چار سال بعد چاند سا بیٹا عطا فرمایا ہے' اس کا نام محمد عمر عثمان رکھا ہے۔ یہ میری اور میری بیوی کی گڑگڑا کر مانگی گئی دعاؤں کا ثمر ہے' خداوند کریم محمد عمر عثمان کو نیک بنائے اور اسے اپنے والدین کا تابع فرمان رکھے' آمین۔

ریاض بٹ ...... از حسن ابدال۔ السلام علیکم! نئے سال 2014ء کا خوب صورت منفرد اور دیدہ زیب سرورق لیے شمارہ میری نگاہوں کے سامنے ہے' سرورق کے منظر کے کیا کہنے۔ اس کے بعد

اشتہارات سے مستفید ہوتے ہوئے نگاہیں ابتدائیہ پر جا ٹھہریں۔ اس بار پھر میری کہانی موجود ہے بہت بہت شکریہ۔ عمران بھائی و دیگر اسٹاف نئے افق' دستک میں مشتاق احمد قریشی صاحب جو کچھ فرما رہے ہیں حقیقت کی عکاسی کررہا ہے۔ ہمارا پیارا اور جان سے عزیز ملک قدرت کے بے شمار ذخائر (نعمتوں) سے مالا مال ہے۔ ہر قسم کی معدنیات یہاں موجود ہیں لیکن ان سے استفادہ نہیں کیا جارہا؟ غیر آ کر فائدہ اٹھارہے ہیں۔ مہنگائی اور بلوں سے عوام کی چیخیں نکل رہی ہیں اور ارباب اختیار اپنی عیاشیوں میں لگے ہوئے آخر کب تک یہ سب کچھ چلے گا' اب بڑھتے ہیں اپنی محفل کی طرف یہاں صرف آٹھ خطوط ہیں' باقی بھائی اور بہنیں کہاں غائب ہیں' جلدی آیئے اور محفل کو رونق بخشئے۔ سب سے پہلا خط بہن شہناز بانو کا ہے' بہن سب سے پہلے مبارک باد قبول کیجیے اسعد علی کی منگنی کی۔ خدا بزرگ و برتر سے دعا گو ہوں کہ وہ آپ کو ہزاروں خوشیاں نصیب کرے' آمین۔ آپ کا تبصرہ تعریف کے قابل ہے' میری کہانی پسند کرنے کا بے حد شکریہ' مجھے آپ سے کافی رہنمائی ملی ہے۔ آپ کی کہانی ''دلدل'' بہت اچھی ہے' خاص کر آج کل کی بچیوں کے لیے اس میں ایک سبق ہے۔ عمر فاروق' ارشد بھائی میری کہانی آپ کو پسند آئی' بہت بہت شکریہ۔ بھائی اب میں عمر کے اس حصے میں ہوں جہاں نہ تو غصے سے میرے کان لال ہوتے ہیں اور نہ ان سے دھواں نکلتا ہے پر لگتا ہے آپ ذرا جلدی غصے میں آجاتے ہیں۔ انجم فاروق ساحلی صاحب اس بار آپ نے ابن صفی (مرحوم) صاحب کے جس ناول کا ذکر کیا ہے وہ میری نظروں سے بھی گزر چکا ہے' ان کی یہ بات ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے کہ جس طرح لکھنے کا فن ہوتا ہے اسی طرح کہانی پڑھنے اور اس پر تبصرہ کرنے کا فن بھی ہوتا ہے۔ بشیر احمد بھٹی صاحب آپ کی باتیں بھی قابل غور ہیں' محمد اسلم جاوید صاحب امید ہے آپ آئندہ تفصیلی خط کے ساتھ آئیں گے۔ ریاض حسین قمر بھائی کیسے ہیں؟ خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے اور آپ اسی طرح تبصرے کے ساتھ تشریف لاتے رہیں' میرا تبصرہ پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ حکومتی ڈرون حملوں کی بات آپ نے خوب کی ہے' چوہدری مبارک علی آپ کا خط بھی اچھا ہے اور تبصرہ بھی منفرد۔ لو جی خطوط کی محفل تو تمام ہوئی باقی سلسلوں پر پہلے تھوڑی سی بات ہوجائے پھر بڑھیں گے کہانیوں کی طرف۔ اقراء میں طاہر قریشی صاحب ہمیں نیکی اور بدی کی پہچان کروار ہے ہیں' یہ باتیں ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ خوشبوئے سخن میں سب ہی غزلیں اور گیت وغیرہ اچھے ہیں لیکن ریحانہ سعیدہ' ارشد محمود ارشد' قدیر رانا اور عبداللہ شاہد ٹاپ پر ہیں۔ ذوق آگہی میں کاشف نصیر گوہل کافی عرصہ بعد نظر آئے ہیں اور خوب آئے ہیں۔ بشیر بھٹی کی نماز کی معافی نہیں ذہن کے در وا کررہی ہے اور قدرت انعام کی نماز کی عظمت بھی' بہت اچھی ہے۔ ثوبیہ رحمان کی محبوبہ سے بیوی تک پڑھ کر بے ساختہ لبوں پر ہنسی کے پھول کھل اٹھے۔ بہت خوب صفحہ صفحہ بکھری کترنوں میں بشریٰ علوی کی بہشت اور ذرا مسکرایئے میں احمد علی کی ذرا مسکرایئے بھی پسند آئی۔ اب باری آتی ہے کہانیوں کی خلیل جبار کی ''جوا'' ایک اچھی کاوش ہے۔ میرے خیال میں ندیم کو سب کچھ بتادینا چاہیے یعنی پہلے ہی...... بہر حال اس کی قربانی اپنی جگہ اہمیت کی حامل تھی۔ گواہی ڈاکٹر درخشاں انجم کی اچھی کاوش ہے۔ مغربی ادب سے چہرہ شناس اور انگلی کا ہنگامہ خوب رہیں۔ البتہ گورکھ دھندا' گورکھ دھندا ہی ثابت ہوئی۔ قسط وار کہانیاں آتش زیرپا' جگت سنگھ اور قلندر ذات کی قسطیں بھی خوب رہیں' دونوں ابھی زیر مطالعہ ہیں' اب اجازت دیجیے اگلے ماہ ان شاء اللہ ضرور حاضر ہوں گا' والسلام۔

اقراء

ترتیب: طاہر قریشی

نیکی اور بدی کی پہچان

''حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ نیکی اور گناہ کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: نیکی اچھے اخلاق کا نام ہے اور گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے اور تم اس بات کو برا سمجھو کہ لوگ اس پر مطلع ہوں۔'' (رواہ مسلم)

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو سوال کیے گئے ایک نیکی کے بارے میں دوسرا گناہ کے بارے میں۔

اسلامی تعلیمات میں نیکی اور گناہ کے لیے بنیادی اصول یہ ہے کہ جو عمل اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے مطابق ہو وہ نیکی ہے اور اگر اس کے خلاف ہو تو وہ گناہ ہے۔ حتیٰ کہ عبادات جو کہ سراسر نیکی ہیں اگر وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے خلاف کی جائے تو بجائے نیکی کے گناہ کا سبب بن جاتا ہے مثلاً نماز پڑھنا بہت بڑی عبادت ہے' لیکن سورج کے طلوع ہوتے وقت' غروب ہوتے وقت نماز پڑھنا مکروہ ہے' اگر کوئی شخص ان مکروہ اوقات میں نماز پڑھے تو وہ گناہ کا سبب بن جائے گا۔ اسی طرح روزہ رکھنا عظیم عبادت ہے' لیکن عید کے دن چونکہ روزہ رکھنا ممنوع ہے اس لیے اگر عید کے دن روزہ رکھا تو یہ گناہ کا سبب ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نیکی اصل میں اطاعت الٰہی کا نام ہے اللہ رب العزت نے اسلام کے ذریعے ہمیں اچھے اخلاق کی تعلیم دی، حسن خلق یعنی لوگوں سے اچھا برتاؤ کرنا بہت بڑی نیکی ہے۔

علامہ خازن اپنی تفسیر میں حسن خلق کے اجزاء بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''لوگوں سے محبت کرنا' معاملات کی درستگی' اپنوں اور بیگانوں سے اچھے تعلقات رکھنا' سخاوت پورا کرنا۔'' امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے حسن خلق کے بارے میں بڑی قیمتی بات کہی، وہ فرماتے ہیں۔ ''حسن خلق کا ثمرہ الفت ہے اور برے اخلاق کا پھل بیگانگی اور دلوں کی دوری ہے۔''

دراصل اچھے اخلاق سے لوگوں کو فائدہ ہی پہنچے گا اور نیکی وہی ہو سکتی ہے' جس سے مخلوق کو فائدہ پہنچے جب لوگوں کو کسی کام سے فائدہ پہنچتا ہے' تو وہ اس کام کو پسند کرتے ہیں اور خود کام کرنے والا بھی اس بات کو فطری طور پر چاہتا ہے کہ میرے اچھے کام لوگوں کو معلوم ہوں' چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نیکی کے برعکس گناہ کی پہچان یہ بتائی کہ ''گناہ وہ عمل ہے' جس کے کرنے کے بعد آدمی دل کے اندر کھٹکا محسوس کرے۔'' حقیقت یہی ہے کہ مومن کا دل ہی نیکی اور بدی کی کسوٹی ہے۔ جب انسان سے برا کام سرزد ہو جاتا ہے تو پھر وہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ لوگوں کو میرا یہ برا کام معلوم ہو اور وہ اسے چھپانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے' لیکن اب ایک بات ذہن میں پیدا ہوتی ہے کہ بہت سے لوگ رشوت لیتے ہیں اور سر عام

خود کہہ کر لیتے ہیں اور اس کا اعتراف بھی کرتے ہیں اور ان کا دل بھی رشوت لینے کو برا نہیں سمجھتا تو پھر کیا یہ کام برا نہ ہوا اس بات کی وضاحت کے لیے ایک بات ضرور ذہن میں رکھنی چاہیے کہ جس دل کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اس سے مراد قلب سلیم یعنی تندرست دل مراد ہے، بیمار دل مراد نہیں اور بیمار دل وہ ہوتا ہے جو نیکی اور گناہ میں تمیز نہ کر سکے۔ جیسے تندرست زبان کے ذریعے آپ میٹھے اور کڑوے کو بالکل صحیح طور پر معلوم کر سکتے ہیں لیکن جس شخص کو بخار ہو جائے تو پھر اسے چینی بھی کھلائیں تو وہ اسے کڑوی محسوس ہوگی۔ اسی طرح تندرست دل وہ ہوتا ہے جو گناہ کا عادی نہ ہو جب انسان کو کسی گناہ کی عادت پڑ جائے تو پھر اس کا دل بیمار ہو جاتا ہے کیونکہ اس کے دل کے اندر گناہ کو گناہ سمجھنے کا احساس ہی ختم ہو جاتا ہے۔

اب مثال کے طور پر رشوت کے گناہ کا تذکرہ ہوا تو کسی ایسے شخص کو دیکھیے جس نے کبھی رشوت نہ لی ہو اگر کوئی شخص زبردستی اسے رشوت دینے کی کوشش کرے تو وہ لینے سے انکار کرے گا بہت اصرار ہوا تو جب وہ لینے کے لیے ہاتھ بڑھا رہا ہو تو آپ غور سے دیکھیے اس کے ہاتھ کانپ رہے ہوں گے دل کی دھڑکن تیز ہو جائے گی اور سردی کے موسم میں بھی اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نظر آئیں گے اور وہ شخص ادھر ادھر دیکھ رہا ہوگا کہ کوئی مجھے رشوت لیتے ہوئے دیکھ تو نہیں رہا۔ یہ سب کیفیات بتا رہی ہیں کہ اس کے دل میں رشوت سے نفرت ہے لیکن خدا نہ کرے اس شخص کو شیطان نے بہکا دیا اب وہ رشوت لینے کا عادی ہو گیا تو پھر اب اس کے دل میں وہ رکاوٹ اور کھٹکا ختم ہو جائے گا۔ اس لیے دل کو تندرست رکھنے کے لیے سب سے بڑی پابندی یہ اختیار کرنی ہوگی کہ وہ انسان کسی بھی گناہ کا عادی نہ ہونے پائے اور گناہ کی عادت سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ جب گناہ سرزد ہو تو فوراً اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لے، توبہ اور استغفار کرے، بس یہ شخص اس گناہ کا عادی نہیں بن سکتا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اچھے اخلاق سے آراستہ ہونے اور گناہ سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے اور ایسا قلب سلیم عطا فرما دے جو نیکی اور گناہ میں پہچان کر لیا کرے۔

بشکریہ: ''درس حدیث'' مولانا حافظ فضل الرحیم اشرفیؒ
نائب مہتمم واستاد الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور

قسط نمبر 5

آتش زیرپا

یعقوب بھٹی

وہ ظلم کی گرد سے اٹھنے والا ایک طوفان تھا' جس نے ظلم کا پنجہ مروڑ دیا' جس کے سبب وہ قانون کا بھی مجرم ٹھہرا۔
حالات کی بے رحم کروٹ اسے جرم و گناہ کی سفاک دنیا میں دھکیل کر لے گئی' اس کے سینے میں آتش فشاں دہکتے تھے اور پیروں میں انگارے سلگتے تھے جس کے سبب اسے ایک پل کو چین نہ تھا۔ مجرم اس کی سفاکی سے لرزتے تھے جرم کے بڑے بڑے چراغ اس نے چٹکی میں بجھادیئے تھے۔ قانون کے لمبے ہاتھ اس نے قانون کی ہی گردن میں باندھ دیئے تھے اس کا نام بڑے بڑوں کا پتا پانی کردیتا تھا۔ بہت کم لوگوں کو معلوم تھا اس سفاک شخص کے سینے میں ایک نرم و گداز دل دھڑکتا ہے' ایک نازک سی لڑکی اس کی کل کائنات ہے
پھر ایک دشمن جاں نے شب خوں مارا اور اس کی کائنات اجاڑ دی۔
اس کی وحشت دو چند ہوگئی' وہ آتش زیرپا قاتل کی تلاش میں قریہ قریہ بھٹک رہا تھا۔
پھر ایک جوہر شناس نے اس کی وحشت کو لگام دے کر مثبت سمت میں موڑ دیا۔

سطر سطر ہنگامے' لفظ لفظ تجسس' نئے افق کی نئی سنسنی خیز سلسلے وار کہانی

میری نظریں شعلوں کے پار کوئی ہدف ڈھونڈ رہی تھیں۔ کوئی بیگھے ملوں کا سرکردہ شخص یا ان کا نمک خوار ایس ایچ او راپا نوید...... میں اپنی زندگی کی آخری گولیاں کسی ایسے ہی شخص کے سینے میں اتارنا چاہتا تھا۔
آگ کے شعلے خاصے قریب آگئے تھے۔ پٹرول کا ایک شاپر علی اور حسینی کے قریب گرا چند لمحوں بعد اس سے بھی آگ بھڑک اٹھی۔ آگ سے بچنے کے لیے اضطرابی کیفیت میں انہوں نے جگہ بدلنے کی کوشش کی' بارش کی طرح برستی گولیوں میں یہ کوشش بے حد خطرناک تھی' اس کا نتیجہ بھی فوراً نکلا' وہ دونوں ایک طویل برسٹ کی زد میں آگئے تھے۔ شعلوں کے انعکاس میں میری آنکھوں نے اپنے دونوں ساتھیوں کو لہرا کر آگ کے شعلوں پر گرتے دیکھا' علی کی درد میں ڈوبی ''آہ'' اور حسینی کی جان کنی کی تکلیف میں نکلی چیخ میری سماعت میں زہر گھول گئی۔

''علی......'' میرے حلق سے دہاڑ سی نکلی' بے بسی کے احساس نے میرے پورے جسم کو جیسے مفلوج سا کردیا تھا۔
یہی وقت تھا جب میں نے زبردست چکا چوند کے ساتھ ایک زوردار دھماکا سنا۔ درجنوں ہیڈ لائٹس کی روشنی میں' میں نے اس پولیس ڈالے کو فضا میں اچھلتے اور تنکوں کی طرح بکھرتے دیکھا۔ جس کا ٹائر تھوڑی دیر پہلے ہم نے پھاڑ کر پولیس کی پیش قدمی روکی تھی۔
یکے بعد دیگرے چار' پانچ ایسے ہی اور خوفناک دھماکے ہوئے۔ ہم پر برستی گولیوں کی بارش یکلخت تھم گئی۔ پولیس اور بیگھے ملوں کی ''مشترکہ فورس'' میں جیسے کھلبلی مچ گئی تھی۔ میرے لیے موقع غنیمت تھا۔ میں جیسے اڑتا ہوا علی اور حسینی تک پہنچا۔
آہ...... وہ...... دونوں بھی بابو کے پاس جاچکے تھے۔ آگ نے ان کے بے جان جسموں کو لپیٹ

میں لے لیا تھا۔ مجھے جیسے دیوانگی کی دھند نے ڈھانپ لیا تھا۔ دیوانہ وار میں ان سے لپٹ گیا۔ اس کوشش میں، میں بھی جھلس گیا تھا مگر تکلیف کا ذرا بھی احساس نہیں ہوا۔

انہیں دیوانہ وار پکارتے ہوئے میں نے باقی ماندہ گولیاں نہ جانے کس پر چلا دی تھیں اور بیگھے ملوں کو کیا کیا دھمکیاں دی تھیں، مجھے خود بھی ٹھیک سے معلوم نہیں ہے۔

آج سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ میں زندہ کیسے ہوں؟ میری جذباتیت تو بہت پہلے مجھے چاٹ گئی ہو گی۔

شوکا اور وجاہت پروانوں کی طرح مجھ سے آ لپٹے تھے۔ تین پروانے تو مجھ پر قربان ہو چکے تھے۔ دشمنی کی آگ فزوں تر ہوتی جا رہی تھی۔ ابھی نہ جانے اس نے کس کس کی جان لینی تھی۔

دشمنوں کا پلڑا ابھی خاصا بھاری ہو گیا تھا مگر مجھے یقین تھا کہ اس نے سدا بھاری نہیں رہنا۔

صاف طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ پولیس اور بیگھے ملوں کی فورس پر کسی اور نے ہلہ بول دیا تھا۔ جوان کے مقابلے میں جدید ترین اسلحے اور اعلیٰ تربیت سے لیس ہیں۔

خودکار ہتھیاروں کی واضح برتری لیے فائرنگ اور دستی بموں نے انہیں بکھیر کر رکھ دیا تھا۔

اپنے مقتول ساتھیوں کے پہلو میں ہم حیرت زدہ اور صدمے سے گنگ پڑے تھے۔ یہ کون لوگ تھے جنہوں نے ہماری امداد میں ان شکاری کتوں سے ٹکر لی تھی اور انہیں ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔

ایک جلتی ہوئی پولیس گاڑی کے دھوئیں میں سے جیسے ایک سیاہ ہاتھی جیسی ڈیل ڈول والی لینڈ کروزر نمودار ہوئی اور لہراتی ہوئی تیز رفتاری سے ہماری طرف آئی۔ طاقتور انجن فور وہیل "موڈ" پر کھیتوں کی کیچڑ کو خاطر میں نہیں لا رہا تھا۔

چھپلی ہیڈ لائٹس کے ساتھ ہمارے قریب آ کر لینڈ کروزر نے پہلو کاٹا، فوراً ہی اس کا عقبی دروازہ کھلا اور ساتھ ہی جل جانے والی اندرونی لائٹس میں، میں نے ایک مضبوط کاٹھی کے نوجوان کو دیکھا، بے حد گھنی مونچھوں اور خون اگلتی آنکھیں، اس کے ہاتھ میں سیاہ چمکتی ہوئی جدید ترین رائفل تھی اور جسم پر کمانڈو جیکٹ سے کئی ہینڈ گرینیڈ لٹک رہے تھے۔ اس کی متلاشی نظریں بھوسے کے ڈھیر پر بھٹک رہی تھیں۔ لمحے بھر میں اس نے شعلوں کی روشنی میں ہمیں دیکھ لیا۔ "جلدی سے اندر آ جاؤ!" اس کی بھاری آواز ابھری۔

کیوں؟ اور کیسے؟ جیسے ڈھیروں سوال کلبلائے مگر یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا، ہمارے لیے تو یہ غیبی امداد تھی۔

میں نے حسینی کے بے جان جسم کو اٹھانے کی کوشش کی تو نوجوان جست بھر کر نیچے اتر آیا، لینڈ کروزر کی اوٹ میں ہم کسی بھی اندھی گولی سے محفوظ تھے۔

لینڈ کروزر کی "سن روف" کھل گئی تھی اور فرنٹ سیٹ پر بیٹھا رائفل بردار کا اوپری دھڑ باہر آ گیا تھا۔ اس نے فوراً ہی کسی ہدف کو بھانپ کر اس پر فائر کھول دیا تھا۔

نوجوان نے بھانپ لیا کہ حسینی، علی اور بابو زندہ نہیں ہیں۔ "اسے رہنے دو، اگر کوئی زخمی ہے تو اسے لے لو!" اس کا انداز قطعی اور لہجہ بے حد سرد تھا۔

"آ..... پ..... کو..... ن ہو؟" شوکے نے قدرے ہکلا کر کہا۔ نوجوان سے وہ مرعوب نظر آ رہا تھا۔

"جان جاؤ گے، ابھی ان سوروں کے گلے سے تو

جان چھڑاؤ......" وہ لینڈ کروزر کی طرف مڑا "آؤ۔"

میں نے آخری نظر اپنے مردہ ساتھیوں پر ڈالی۔ سینے میں آگ کی رنگت نیلی ہوتی جا رہی تھی۔ وہاں پل بھر میں، میں نے خود سے عہد کیا کہ ان کا خون رائگاں نہیں جائے گا۔ بیگھے ملوں کو جہاں میرے اور میجر صاحب کے خون کا حساب دینا ہوگا، وہیں ان تینوں کے خون کا بھی حساب دینا ہوگا۔

ہمارے لینڈ کروزر میں سوار ہوتے ہی ہچکولے کے ساتھ وہ رواں ہوگئی، پولیس اور بیگھے ملوں نے ابتدائی دھچکے سے سنبھالا لے لیا تھا اور ان کی طرف سے مزاحمت شروع ہو چکی تھی۔ ہماری لینڈ کروزر پر فائرنگ ہوئی تو یہ خوشگوار احساس ہوا کہ وہ بلٹ پروف تھی۔

فائرنگ کے بعد سن روف والا رائفل بردار اندر آ گیا۔ ریپٹر کا ایک چھرا اچٹتا ہوا سا اس کے گال پر لگا تھا، وہاں سے خون بہہ نکلا تھا۔

نوجوان نے فوراً ہی اپنی طرف کا شیشہ نیچے گرایا اور ایک گرینڈ کی پن کھینچ کر اس ٹولی کی طرف اچھال دیا جہاں سے فائرنگ ہوئی تھی۔

گرینڈ ترالی سے فاصلے پر گرا مگر زوردار دھماکے نے فائرنگ کرنے والوں کو حواس باختہ ضرور کر دیا تھا، ان کی رائفلیں خاموش ہو گئیں۔

"اوئے کوئی گولی شولی تو نہیں لگ گئی؟" نوجوان نے فکرمندی سے پوچھا۔

گال سے بہتے خون کو صاف کرتے ہوئے رائفل بردار نے کہا۔ "نہیں جی، خدا نے رکھ لیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ دوبارہ سن روف سے نکل گیا۔

ڈرائیونگ سیٹ پر گینڈے کی سی جسامت والا ایک ادھیڑ عمر شخص تھا جس کے سر کا اوپری حصہ بالوں سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ وہ بڑی مشاقی سے لینڈ کروزر ڈرائیو کر رہا تھا۔

"پیچھے ہتھیار پڑے ہیں، سنبھال لو اور جو بھی کتے کا جنا سامنے آئے اڑا دو۔" سرخ آنکھیں مجھ پر گاڑھتے ہوئے نوجوان نے سفاک لہجے میں کہا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی غیر انسانی چمک تھی۔ اس پل مجھے اس کا چہرہ کچھ شناسا سا لگا تھا۔

عقب میں کئی رائفلیں اور گرینڈز سے بھرا کریٹ موجود تھا۔ ہم تینوں نے اے کے 47 منتخب کی تھیں۔ اپنی خالی رائفلیں ہم نے بھوسے کے ڈھیر پر ہی چھوڑ دی تھیں۔

"گرینڈ تمہارے ہاتھوں میں چبھتے ہیں کیا؟" نوجوان نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا اور ایک لمبی نال کا پسٹل کھڑکی سے نکال کر آسمان کی طرف رخ کر کے ٹریگر دبا دیا۔ سیٹی جیسی آواز ابھری اور تاریک آسمان پر رنگ برنگی پھلجھڑیاں سی چھوٹ گئیں۔ یہ غالباً کوئی اشارہ تھا میں نے کہا۔ "ہم میں سے کوئی گرینڈ چلانے کی تکنیک سے آگاہ نہیں ہے۔"

نوجوان حلق پھاڑ کر ہنسا۔ "اوئے مراد علی سنا تو نے یہ دشمن دار ہو کر گرینڈ چلانا نہیں جانتے۔" مراد علی ڈرائیور کا نام تھا۔ اس نے دھیمی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔ "ابھی بچے ہیں یہ بادشاہو! جلدی سیکھ جائیں گے۔"

نوجوان نے اپنی جیکٹ سے گرینڈ علیحدہ کر کے مجھے تھمایا۔ اس جان لیوا ہتھیار کی ٹھنڈک نے جیسے میرے وجود میں توانائی بھر دی تھی۔

نوجوان نے میری ہتھیلی میں سمائے گرینڈ کی پن کھینچی تو میرے ساتھیوں کے چہروں پر سراسیمگی پھیل گئی۔ میری کیفیت بھی ان سے مختلف نہیں تھی۔ سنا یہی تھا کہ پن کھینچتے ہی گرینڈ پھٹ جاتا ہے۔

نوجوان کے چہرے پر وحشت آمیز شرارت کھیل رہی تھی۔ "بس یہ پن کھینچی...... ایک سے پانچ

گنا اور پھر......'' اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔
میں نے اپنی طرف کا شیشہ نیچے گرایا۔ گرینڈ کو میری ہتھیلی میں پانچ سیکنڈ ہوا چاہتے تھے۔ سنسنی میرے وجود سے لہر در لہر ٹکرا رہی تھی۔
''پھینک دو بھرا جی!'' شوکے کی جیسے منت کرتی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔
لینڈ کروزر پگڈنڈی پر پہنچ چکی تھی۔ اس وقت میں نے اپنے جیسی ایک اور لینڈ کروزر کو دیکھا' جس ٹریکٹر ٹرالی نے ہماری راہ مسدود کی تھی۔ اس کے عقب سے دوسری لینڈ کروزر پر فائرنگ ہوئی۔ میں نے گرینڈ ٹرالی کی طرف اچھال دیا' گرینڈ سیدھا ٹرالی کے اوپری حصے سے ٹکرایا۔ آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی چمک کے ساتھ زوردار دھماکا ہوا' کئی انسانی چیخوں کے ساتھ میں نے ایک وردی پوش بازو کو فضا میں بلند ہوتا دیکھا۔ لینڈ کروزر نے رخ بدلا تو فوراً ہی منظر میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔
''شاباش......'' نوجوان نے تحسین آمیز انداز میں کہا۔ ''تو...... تو بڑا لائق بچہ ہے اوئے۔'' میرا جسم ابھی تک سنسنا رہا تھا۔ اگلے دس منٹ میں ہم تینوں ساتھیوں نے کوئی درجن بھر گرینڈ برسائے اور ہر اس جگہ پر گولیاں برسائیں جہاں کسی پولیس والے یا بیگھے ملوں کے بندے کا ذرا بھی شبہ ہوا۔ اس دوران ہم برانچ روڈ پر بھی پہنچ گئے تھے۔ جہاں عقب نما آئینے میں دیکھ کر پتا چلا کہ ایسی ایک نہیں بلکہ دو گاڑیاں تھیں جن میں مسلح افراد بھرے ہوئے تھے۔
''نکلنے کی کرو مراد علی!'' نوجوان نے قدرے مضطرب انداز میں کہا۔ ''سارے ضلع کی پولیس کا رخ اس طرف ہو چکا ہوگا۔'' اس کی نظریں مسلسل عقب نما اور سامنے کے جائزے میں مصروف تھیں۔ مراد علی نامی ڈرائیور نے سر ہلا کر رفتار بڑھا دی۔
عقب میں آنے والوں نے بھی پیروی کی۔
جدید اسلحے' بلٹ پروف گاڑیوں اور دلیرانہ لپک کے بل بوتے پر ان لوگوں نے ہمیں بڑی آسانی سے بیگھے ملوں اور پولیس کی مشترکہ فورس کے چنگل سے نکال لیا تھا۔
''مشترکہ فورس'' نے تو ان چند قانون کے باغی نوجوانوں پر شب خون مارا تھا جو محض معمولی رائفلوں اور پسٹلوں سے مسلح تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ عقب سے ان پر کچھ بلائیں ٹوٹ پڑیں گی۔
کچھ ہی دیر میں ہم میدان کارزار سے خاصے فاصلے پر پہنچ گئے تھے۔ نوجوان کی ہدایت پر لینڈ کروزر کی ہیڈ لائٹس جلا لی گئی تھیں۔ کسی کو تعاقب میں آنے کی جرات نہیں ہوئی تھی۔ شاید وہ اپنے زخم چاٹ رہے تھے۔ میرے ذہن کی پھرکی تیزی سے گھوم رہی تھی۔ پاس بیٹھے نوجوان کے ابھرے جبڑے' اندر کو دھنسے گال' تیکھی ناک اور بے حد گھنی مونچھیں' رہ رہ کر ذہن میں ابھر رہی تھیں' یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون ہے؟ آخر کار ذہنی کشمکش سے نجات حاصل کرنے کے لیے میں نے پھر نوجوان سے پوچھا۔ ''کیا میں جان سکتا ہوں کہ ہمارے لیے اپنی جانوں پر کھیلنے والے کون لوگ ہیں؟''
''کبھی شاہد ملتانی کا نام سنا ہے؟'' سرخ آنکھوں والے نوجوان نے بڑے طنزیہ انداز میں الٹا سوال کر دیا تھا۔
میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا تو یاد آ گیا کہ نوجوان کا چہرہ شناسا سا کیوں لگ رہا تھا' بلاشبہ وہی شاہد ملتانی تھا۔ جنوبی پنجاب کے ٹاپ تھری اشتہاریوں میں سے ایک' جس کے سر کی قیمت بیس لاکھ تھی۔ جب مجھے گرفتار کر کے تھانے لے جایا گیا تھا تو میں نے تھانے کے مطلوب ترین افراد والے بورڈ پر اس کی

تصویر دیکھی تھی۔

"نام تو پہلے سنا تھا' آج کام بھی دیکھ لیا ہے۔" میں نے سنبھالا لے کر کہا۔ میرے ساتھیوں کے منہ کھلے ہوئے تھے۔ وہ بھی جان گئے تھے کہ وہ نوجوان کون ہے؟

شاہد ملتانی مسکرایا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "کسی ٹر" قبیلے کے لگتے ہو۔"

"جٹ ہوں" خون کے فخر سے میرا سینہ خود بخود ہی تھوڑا سا تن گیا تھا۔ ساتھ ہی میں یہ سوچ رہا تھا کہ پنجاب کا یہ نامی گرامی اشتہاری ہماری مدد کو کیسے آ گیا۔ یہی سوال دوبارہ میری زبان پر آ گیا۔

شاہد ملتانی بولا۔ "تیرا' میرا کوئی رشتہ ہے اور نہ ہی کوئی تعلق واسطہ...... جٹا! مجھے کسی نے تجھے سوروں کے گلے سے نکال لانے کے لیے کہا اور دیکھ نکال کر لے جا رہا ہوں۔"

"کون ہے وہ ہمدرد؟" میں نے اچنبھے سے پوچھا تھا۔ یہ بات میرے حلق سے اتر نہیں رہی تھی۔

"تھوڑی دیر میں تمہاری ملاقات ہو جائے گی۔" شاہد ملتانی نے اس دفعہ قدرے روکھے انداز میں کہا۔ اس کی تمام تر توجہ دوبارہ بیک مرر کی طرف ہو گئی تھی۔ میں نے بھی اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ذہن میں البتہ کھلبلی سی ضرور مچ گئی تھی۔

تینوں گاڑیاں مناسب رفتار سے حرکت میں تھیں۔ جلد ہی ہم اس نیم پختہ راستے پر تھے جس کے ایک طرف میجر صاحب کے کنوؤں کے باغات اور دوسری طرف پانی کا نالہ تھا۔

تمام تر بجھی لائٹس کے ساتھ جب گاڑیوں نے نیم پختہ راستے کو چھوڑ کر میجر صاحب کے باغات کا رخ کیا تو میں چونکا۔ جلد ہی ہم مین گیٹ پر تھے۔ یہاں درجن بھر سے بھی زیادہ لالٹین بردار پہلے سے موجود تھے۔ ان کے ہاتھوں میں خالی بوریاں دیکھ کر میں مزید حیران ہوا۔

ہماری گاڑی مین گیٹ پر رکی۔ شاہد ملتانی نے اپنی طرف کا شیشہ گرایا تو مجھے باغات کے منیجر قاسم شاہ کی صورت نظر آئی جس پر ہیجان برپا تھا۔ اسی لمحے مجھے معلوم ہو گیا کہ ہمارا "ہمدرد" کون تھا۔ یقیناً وہ میجر صاحب کی فیملی میں سے ہی کوئی تھا۔ میرے تنے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تھے۔

قاسم شاہ کا خاندان کئی پشتوں سے میجر صاحب کی فیملی کا نمک خوار تھا۔ قاسم شاہ نوجوان نسل کا نمائندہ تھا۔ مجھ سے نظریں ملتے ہی وہ ہیجانی انداز میں بولا۔

"ہم لوگ تمہیں بھولے نہیں تھے۔ واجد ترین صاحب نے تم پر ہر پل پر نظر رکھی ہے۔"

"میری طرف سے ان کو شکریہ بول دینا۔" میں نے کہا۔ واجد ترین' میجر صاحب کے سب سے بڑے بیٹے تھے اور امریکہ میں مقیم تھے۔

شاہد ملتانی' قاسم شاہ سے مخاطب ہوا۔ "ٹائروں کے نشانات پر اچھی طرح سے بوریاں پھیروا دو۔ تھوڑی دیر میں یہاں "باؤلے کتوں" کا راج ہو گا۔"

"بے فکر ہو جاؤ ملتانی شہزادے۔" قاسم شاہ نے ہیجان اور مسرت سے ڈوبے لہجے میں کہا۔ "آپ کے سائے تک کا نشان بھی مٹا دیں گے۔"

تھوڑی دیر میں ہم باغ کے اندر تھے۔ تینوں گاڑیاں ایک کھلی جگہ پر پہلو بہ پہلو کھڑی تھیں۔ یہاں بھی درجنوں کھیتوں میں کام کرنے والے مزدور موجود تھے اور ایک طرف بھوسے' جسے پرالی بھی کہا جاتا ہے' اس کا پہاڑ جتنا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

یہاں ہمارا استقبال بنفس نفیس واجد صاحب نے کیا۔ میں نے انہیں صرف ایک دفعہ دیکھا تھا۔

ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی البتہ ان کی قد آدم تصویر میجر صاحب کی کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں درجنوں بار دیکھی تھی۔

واجد صاحب نے مجھے گلے سے لگایا۔ "درد مشترک" نے ہمارے درمیان سے ہر طبقاتی فرق کو مٹا دیا تھا۔

ظالموں نے ہم دونوں سے "باپ" چھین لیے ہیں کمال، کیا بگاڑا تھا انہوں نے ان ظالموں کا؟"

واجد ترین کی آواز آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی اور اشک بھی ضبط کا بند توڑ چکے تھے۔ میرا کندھا بھیگ رہا تھا۔ میری کیفیت بھی ان سے مختلف نہیں تھی۔ فرق تھا تو آنسو بہنے کی بجائے میری آنکھیں جل اٹھی تھیں۔ ان کے کندھے کے اوپر سے میں نے دیکھا تینوں گاڑیوں پر بھوسہ ڈالا جانے لگا تھا اور گاڑیاں تیزی سے بھوسے میں چھپتی جا رہی تھیں۔ شاہد ملتانی اور اس کے ساتھی جن کی تعداد دس، گیارہ تھی ایک طرف کھڑے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اپنا زیادہ تر اسلحہ گاڑیوں میں ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ سبھی شکلوں سے ہی پیشہ ور مجرم نظر آتے تھے۔

"میکھے ملوں نے ہمارے بے گناہ باپوں کو مارا ہے ترین صاحب! میں ان سب کو فنا کر دوں گا۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔" میری آواز میں جانے کیسی وحشت تھی کہ میں نے شاہد ملتانی کو چونک کر اپنی طرف دیکھتے دیکھا۔

"میں، تیرے ساتھ ہوں کمال! تو کہیں مجھے پیچھے نہیں پائے گا۔" انہوں نے مجھے بازوؤں میں بھینچتے ہوئے کہا۔

"وہ تو میں نے دیکھ لیا ہے، آپ نے ہمیں یقینی موت کے چنگل سے نکالا ہے۔"

"بہت سی باتیں کرنی ہیں تم سے۔" جذبات کے دھارے کے مدہم ہوتے ہی وہ "تو" سے "تم" پر آ گئے تھے۔ "فی الحال تم چند دن آرام کرو۔ ہو سکتا ہے اپنی ملاقات بھی نہ ہو پائے پھر تسلی سے مل بیٹھیں گے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

شوکے اور وجاہت پر نظر پڑتے ہی وہ بولے۔ "باقی لوگ کہاں ہیں؟ علی، بابو اور تمہیں پناہ دینے والے میاں بیوی بھی تو تمہارے ساتھ تھے؟"

جواب شوکے اور وجاہت کے آنسوؤں نے دیا۔ واجد ترین کے جبڑے بھنچ گئے۔ انہوں نے استفسار طلب نظروں سے شاہد ملتانی کی طرف دیکھا۔ شوکت ملتانی نے کہا۔

"ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی وہ پار ہو چکے تھے خان صاحب۔"

واجد صاحب نے شوکے اور وجاہت کو بیک وقت گلے سے لگایا۔ وہ بچوں کی مانند بلک بلک کر رونے لگے۔ واجد صاحب کی آنکھیں بھی دوبارہ بھیگ گئیں، میری آنکھوں کے سامنے اپنے ساتھیوں کے لاشے پھرنے لگے۔ میرے سینے میں تین اور قبروں کا اضافہ ہو گیا تھا۔

اس دوران قاسم شاہ کا والد احمد شاہ وہاں آ گیا۔ اس کی آنکھوں میں بھی ہمارے لیے تحسین کے جذبات تھے۔ اس نے واجد صاحب کو دھیمی آواز میں کچھ بتایا۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور بولے۔ "تم سب لوگ شاہ صاحب کے ساتھ جاؤ۔"

شاہد ملتانی کا ٹولہ اور ہم تینوں احمد شاہ کے ساتھ ہو لیے۔ کنوؤں سے لدے پھلدار پودوں کے درمیان ایک پختہ روش پر آتے ہی احمد شاہ نے میرا کندھا چوما۔ "شاوا (شاباش) پرا! تم لوگوں نے جٹوں کی لاج رکھ لی ہے۔ ہر طرف تم لوگوں کے ہی

چرچے ہیں۔" اس نے باری باری شو کے اور وجاہت کو تھپکا۔
شاہد ملتانی قریب ہی تھا' بولا۔ "چاچے' چرچے تو کل ان شیروں کے نامعلوم ساتھیوں کے ہوں گے جو انہیں سوروں کے گلے کے درمیان سے کھینچ کر لے آئے ہیں۔"
"ہاں پتر' تم نے بھی وڈا کام کیا ہے۔" یہ کہتے ہوئے احمد شاہ چونکا۔ "علی اور بابو کہاں ہیں؟" لہجے میں تشویش کا عنصر نمایاں تھا۔
میرا سر جھک گیا۔ "وہ ہمیں چھوڑ کر چلے گئے چاچا!"
احمد شاہ بے حد غمزدہ نظر آنے لگا پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "اچھا' جو خدا سوہنے کی مرضی۔" اس کے بعد ہمارے درمیان بوجھل خاموشی چھا گئی۔
دو' تین چکروں کے بعد پختہ روش کا خاتمہ جدید پراسسنگ یونٹ کی عمارت پر ہوا۔ یہاں کنوؤں کو پراسس کے مراحل سے گزار کر پیکنگ ہال میں بھیجا جاتا تھا۔ پیکنگ ہال بھی پراسسنگ یونٹ کی عمارت سے ملحق تھا۔
احمد شاہ نے جیب میں ہاتھ ڈال کر چابیوں کا ایک مختصر سا گچھا نکالا۔ اس دوران ہم پیکنگ ہال کے بڑے سے گیٹ کے سامنے پہنچ گئے تھے۔ میں یہاں پہلے بھی ایک دفعہ آ چکا تھا۔ اس وسیع و عریض ہال کا ایک حصہ گودام کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا۔
احمد شاہ نے ذیلی دروازے کا لاک کھولا پہلے اندر داخل ہو کر غالباً اس نے مین سوئچ آن کیا تھا۔ ایک کھٹکا سا ہوا اور اندر روشنی پھیل گئی۔ ہم باری باری اندر داخل ہوئے۔ یہ گودام والا حصہ تھا۔ دیوار کے دونوں اطراف بلاشبہ ہزاروں کنوؤں کی دیدہ زیب گتے کی پیٹیاں چنی ہوئی تھیں۔ یہ سب برآمدی مال تھا۔
تھوڑا سا آگے آ کر احمد شاہ نے دائیں طرف کی پیٹیوں کے نچلے حصے والے اسٹینڈ کو جھک کر اپنی طرف کھینچا۔ بارہ فٹ چوڑا اور درجنوں پیٹیوں سے لدا اسٹینڈ بے آواز بال بیرنگز پر چلتا ہوا بڑے آرام سے باہر آ گیا۔ نیچے پختہ فرش نظر آنے لگا۔ ہم تینوں حیرت آمیز دلچسپی سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ جبکہ شاہد ملتانی اور اس کے ساتھی لاتعلق سے کھڑے تھے۔ شاید وہ پہلے ہی یہ منظر متعدد دفعہ دیکھ چکے تھے۔
احمد شاہ نے چار ضرب چار کے ایک بلاک کو تین جگہ سے مخصوص انداز میں دبایا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی بلاک ایک طرف کھسک گیا تھا اور ساتھ ہی جل جانے والی روشنی میں نیچے سیڑھیاں جاتی نظر آ رہی تھیں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہاں مجھے ایک خفیہ تہہ خانہ دیکھنے کو ملے گا۔
شاہد ملتانی اور اس کے ساتھی باری باری سیڑھیاں اترنے لگے۔ میں نے استفہامیہ نظروں سے احمد شاہ کی طرف دیکھا تو اس نے پھر ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بولا۔ "میجر صاحب نے تو یہ تہہ خانہ اسٹور کے طور پر بنوایا تھا۔ اس کے راستے کو چھپانے کا انتظام واجد صاحب نے لاہور سے بندے بلا کر دو دنوں میں مکمل کروایا ہے۔" پھر کچھ یاد آنے پر وہ چونکا اور مضطرب انداز میں بولا۔ "چلو بیٹا! مجھے اور بھی کئی کام ہیں۔"
ہم تینوں بھی سیڑھیاں اتر کر باری باری تہہ خانے میں آ گئے۔ ہمارے اوپر چھت برابر ہو چکی تھی۔ نیچے روشنی کا معقول انتظام تھا۔ تہہ خانہ اسٹور کے برابر ہی وسیع تھا۔ ایک کونے میں تعمیراتی میٹریل اور فولادی ٹکڑوں کا اسکریپ نظر آ رہا تھا۔ دیواروں پر کئی جگہ مکڑیوں کے جالے موجود تھے۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ افراتفری میں یہاں صفائی کر کے رہائش کا انتظام کیا گیا ہے۔ لکڑی کے ایک کیبن کو ایمرجنسی ٹوائلٹ

کی شکل دی گئی تھی۔
دیوار کے ساتھ لمبائی کے رخ درجن بھر ریڈی میڈ فرشی بستر بھی نظر آ رہے تھے اور ان کے سامنے جدید ماڈل کا بڑا سا ٹی وی اور ڈی وی ڈی پلیئر بھی ایک شیشے کے ٹاپ والی ٹرالی پر سجے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں بڑا سا ڈیپ فریزر اور اوون بھی رکھے تھے۔
''اوئے مراد علی!'' تہہ خانے میں شاہد ملتانی کی گونجدار آواز ابھری۔
''حکم بادشاہو۔''
''ان بلونگڑوں کو کئی سور مار کر نکال لائے ہیں۔ اس خوشی میں کوئی جشن ہونا چاہیے یار۔'' بھاری بھرکم مراد علی کی گھنی مونچھوں کے نیچے مسکراہٹ نمودار ہوئی' گروہ کے دو تین افراد نے بھی پسندیدگی کے اظہار کے طور پر سر اثبات میں ہلا ئے۔
میں نے اپنے جاں نثار ساتھی کھوئے تھے' کسی جشن وغیرہ کا تصور ہی میرے لیے سوہان روح تھا مگر میں' شاہد ملتانی وغیرہ کو روک بھی نہیں سکتا تھا۔
اس دوران مراد علی نے کہیں سے اسکاچ کی بڑی سی بوتل اور فریزر میں سے سوڈا وغیرہ نکال لیا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ پولیس اہلکاروں کے لیے شاہد ملتانی نے ہمیشہ نفرت انگیز القابات ہی استعمال کیے تھے۔ میں اس کی کہانی سے واقف تو نہیں تھا مگر مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ بھی محکمہ پولیس کی کالی بھیڑوں کا ڈسا ہوا ہے۔
وہ بھی بستروں پر دائرے کی شکل میں بیٹھ گئے۔ اسکاچ کے ساتھ نمکو بھی چلنے لگی۔ ایک دبلے سے نوجوان نے جو پٹھان لگتا تھا اٹھ کر ٹی وی آن کر دیا۔ فحش اسٹیج گانوں پر مشتمل سی ڈی چلنے لگی۔
ہم تینوں بستروں کے آخری سرے پر ایک دوسرے سے لگے بیٹھے اچنبھے سے ان لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔ جو کچھ دیر پہلے آگ و خون کا کھیل کھیل رہے تھے۔ انہیں شاید معلوم ہی نہیں تھا کہ انہوں نے کچھ دیر پہلے کتنے لوگوں کی جانیں لی ہیں۔
اسکاچ تیزی سے اپنا اثر دکھانے لگی تھی۔ شاہد ملتانی کی سرخ آنکھیں سرخ تر ہو رہی تھیں۔ مراد علی نے خالی بوتل اپنے گنجے سر پر ٹکا کر ٹی وی کی اسکرین پر تھرکتی رقاصہ کے انداز میں ٹھمکا لگانے کی کوشش کی تو بوتل اس کے سر سے گر گئی۔ اس نے پروا نہیں کی اور توند مٹکاتے ہوئے بے ڈھنگے انداز میں ناچتے ہوئے اپنی بے سری آواز میں گانے لگا۔ انہہ نھیڑو ے نہ ہو ولدار وے''
ایک اور بے حد رعب دار نظر آنے والا شخص بھی اٹھ کر اس کا ہم رقص ہو گیا۔ باقی افراد تالیوں اور فحش تبصروں کے ساتھ اس رقص سے محظوظ ہونے لگے۔
بارعب شخص کو ایک تکیے سے ٹھوکر لگی تو وہ بستر پر گرا اور پھر وہیں لیٹے لیٹے ''بھوں' بھوں'' کر کے رونے لگا۔ مراد علی بھی ہانپتے ہوئے گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔
اچانک ہی شاہد ملتانی کی نظر ہم تینوں پر پڑی تو اس نے اشارے سے ہمیں پاس بلایا۔ ہم ہچکچاتے ہوئے اس کے قریب جا بیٹھے۔ اس نے پٹھان لڑکے کو ہمارے لیے جام بنانے کے لیے کہا۔ اس نے نئی بوتل نکال لی۔ میں نے زندگی میں کبھی شراب نہیں پی تھی۔ شوکے اور وجاہت کا پتا نہیں تھا۔ گانے کی آواز جیسے میرے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیل رہی تھی۔ شاہد ملتانی صاحب! مہربانی کر کے اسے تو بند کر دیں۔'' میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔
شاہد ملتانی کی تیز نظروں نے پل بھر میں میری کیفیت بھانپ لی۔ اس نے پٹھان لڑکے کو اشارہ کیا تو اس نے ریموٹ کی مدد سے ٹی وی آف کر کے

کہا"خو چے سوڈا یا پانی؟"
یہ مشکل شوکے نے آسان کی۔"پانی"
شاہد ملتانی نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔"ساتھیوں کا سوگ منا رہے ہو؟"
"جاں نثار ساتھی قتل ہو جائیں تو ان کا سوگ بدلہ لینے تک چلتا ہے۔"
شاہد ملتانی کی سرخ آنکھوں میں پسندیدگی کی چمک ابھری۔"خان صاحب نے سارے" بدلے لینے کے لیے ہی مجھے ہائر کیا ہے۔ یہاں سے فارغ ہو کر میرے ساتھ چلو گے؟"
میں نے کندھے اچکائے۔"زندگی کا مقصد پورا ہو جائے تو پھر جہاں تقدیر لے جائے۔ آپ کے ساتھ یا قبرستان۔"
اس دوران پٹھان لڑکے نے پیگ اور نمکو کی پلیٹ ہمارے سامنے دھر دی تھی۔ بھوں بھوں کر کے رونے والا اب اپنی بے سری مگر درد میں ڈوبی آواز میں گا رہا تھا۔"مائے نی میں کینوں اکھاں"
شاہد ملتانی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اشتہاری کی زندگی ہوا میں جلتا چراغ ہوتی ہے ایک دن میں ایک سال جی لو۔ زندگی کی نعمتوں سے جتنا لطف کشید کر سکتے ہو کر لو۔ اس کی آواز میں اشتہاری زندگی کا تجربہ بول رہا تھا۔ جتنی شراب پینی ہے پی لو، جتنی مکھن ملائی چاٹنی ہے چاٹ لو۔" اس نے آنکھ میچ کر معنی خیز انداز میں کہا۔"کسی وقت کوئی سجن بیلی جس کی آنکھوں پر لالچ یا اپنے مفاد کی پٹی بندھ گئی تو وہ "مخبر" بن سکتا ہے۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا پیگ حلق میں انڈیلا۔ کثرت شراب نوشی کے باوجود اس کی آواز میں ذرا بھی لڑکھڑاہٹ نہیں تھی۔ ہم دم بخود بیٹھے اسے سن رہے تھے۔
"پھر ٹھاہ..... ٹھاہ بندوقیں گرجیں گی اور تم خود کو سوروں میں گھرا ہوا پاؤ گے۔" اس نے محکمہ پولیس کو زہریلی گالیوں سے نوازتے ہوئے کہا۔"ان کا اگر تم باپ بھی مار دو تو انہیں اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی پیٹی بھائی کو مارنے پر ہوتی ہے۔ یہ اپنے پیٹی بھائی کے قاتل کو کبھی نہیں چھوڑتے، مجھے بھی نہیں چھوڑیں گے اور تمہیں بھی۔ آج تمہارے ہاتھوں سے بھی کئی سور مرے ہیں۔" اس پر شراب کا نشہ غالب آنے لگا تھا۔"جانتے ہو آج سے پہلے میں نے کتنے سور مارے تھے؟"
ہم تینوں نے بیک وقت نفی میں سر ہلایا۔
"چودہ کو میں نے اپنے ہاتھ سے گولی ماری ہے اور آج والا تو مشترکہ شکار تھا۔ گنتی صبح معلوم ہو جائے گی۔" زیادہ تر افراد نے بستر سنبھال لیے تھے۔ شراب نے ان کے اعصاب کو وقتی سکون دے کر نیند کی طرف دھکیل دیا تھا۔
شاہد ملتانی کا پیگ دوبارہ سے پٹھان نے بھر دیا تھا۔"کیا یار زنانیوں کی طرح بیٹھے ہو۔"
اس نے قدرے خفگی سے کہا۔"اٹھاؤ گلاس۔"
پہل شوکے نے کی پھر وجاہت نے ہاتھ بڑھایا۔
میری ہچکچاہٹ محسوس کر کے وہ بولا۔"پہلے کبھی نہیں پی؟"
میں نے نفی میں سر ہلایا۔
"شروع کر دو، شراب کے بغیر اشتہاری کا گزارا نہیں ہے۔ سارے غم اس خانہ خراب میں "ڈبو دو!" اس نے طویل گھونٹ بھرا تو چہرہ تمتمانے لگا۔
میں نے زندگی میں پہلی دفعہ اس آگ جیسے سیال کا گھونٹ بھرا حلق سے سینے تک آگ کی سی لکیر کھنچ گئی۔ زور کی کھانسی آئی جسے میں نے بمشکل روکا اور ایک طویل گھونٹ لیا۔
"آہستہ بچے آہستہ" شاہد ملتانی نے حوصلہ افزائی

کے انداز میں سمجھایا۔

پورا پیگ انڈیل لینے کے بعد میرا سر گھوم رہا تھا اور واقعی سارے غم، تکلیفیں، درد خود سے قدرے فاصلے پر کھڑے نظر آنے لگے تھے۔

میرا پیگ دوبارہ سے بھر دیا گیا تھا۔ شوکا اور وجاہت پرانے کھلاڑی لگتے تھے۔ دو دو پیگ لگاتے ہی وہ کھلنے لگے تھے۔ شوکے نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "شاہد صاحب! آپ وردی والوں سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں؟"

اس کے چہرے کی تمتماہٹ بڑھ گئی۔ میں نے بھی دلچسپی لی۔

"تم لوگ کیا ان کے لیے پھولوں کے ہار اٹھائے پھرتے ہو؟"

"نہیں...... مگر آپ کی نفرت ہم سے کئی گنا بڑھ کر ہے۔"

شاہد ملتانی کے غیر انسانی نظر آنے والے چہرے پر میں نے ایک اور چہرہ نمودار ہوتے دیکھا۔ بے پناہ اذیت اور دکھ اس پر نمایاں تھا۔ مجھے لگا نادانستگی میں ہم اس کے زخموں کو چھیڑ بیٹھے ہیں۔

اس نے پیگ چھوڑ دیا تھا۔ سینہ مسلتے ہوئے وہ بستر پر دراز ہو گیا۔

پٹھان لڑکے نے ہمیں خفگی سے گھورا اور اشاروں میں ہمارے "سوال" پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے شاہد ملتانی پر کمبل پھیلا دیا اور خفگی بھری دبی آواز میں بولا۔ "خوچے، تم نے لالے کا موڈ خراب کر دیا ہے۔ لالے کے ساتھ رہنا ہے تو آئندہ ایسی کوئی بات نہ پوچھنا جو لالے کو پہلے کی زندگی یاد دلائے۔" ہم پر تو جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔ اندازہ ہی نہیں تھا کہ شوکے کے سوال کا وہ اتنا گہرا اثر لے گا۔ شاید نشے میں ہر جذبہ زیادہ کھرا اور گہرا ہو جاتا ہے۔ اس لیے عام سے سوال نے زیادہ اثر کیا تھا۔

"تم لوگ کھانا کھائے گا؟" پٹھان لڑکے کی خفگی برقرار تھی۔

ہم نے نفی میں جواب دیا تو پٹھان نے بھی زیادہ مروت نہیں دکھائی۔ اس نے بھی کمبل کھینچ لیا۔ ہم نے بھی ایک طرف پڑے کمبل اٹھا کر اوڑھ لیے۔ تھوڑی دیر میں اس تہہ خانے میں کئی خراٹے گونجنے لگے تھے۔ میرا سر بھی گھوم رہا تھا۔ نیند کی دیوی مجھے اپنی طرف کھینچنے لگی تھی۔

نہ جانے میں کتنی دیر سویا تھا کہ کسی نے میرے اوپر سے کمبل کھینچا۔ بے یقینی سے حالات کے سبب ذہن کا خودکار سسٹم بے حد چوکس تھا۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھا۔ شراب کا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔ اپنے سامنے شاہد ملتانی کو دیکھ کر تنتے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

اس کے ایک ہاتھ میں نیا پیگ اور دوسرے ہاتھ میں چکن لیگ پیس نظر آ رہا تھا۔ سرخ تر آنکھیں اور تمتماتا ہوا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس نے نشے کو ٹوٹنے نہیں دیا۔

"اٹھ، اناڑی کھلاڑی! تجھے بتاؤں کہ میں ان سوروں سے اتنی نفرت کیوں کرتا ہوں۔"

میں نے خنکی کے سبب کمبل لپیٹ لیا۔ تہہ خانے کے باقی بھی مکین سو رہے تھے۔ سوائے پٹھان لڑکے کے...... وہ بھی ابھی ابھی کمبل میں روپوش ہوا تھا۔ شاید شاہد ملتانی کا وہ ایسا ساتھی تھا جو اس کے لیے ذاتی خدمات بھی انجام دیتا تھا۔

شاہد ملتانی نے لیگ پیس پر دانت آزمائے۔ شوکے اور وجاہت کے دھیمے خراٹے بتا رہے تھے کہ وہ گہری نیند میں ہیں۔

شاہد ملتانی، میرے سامنے گاؤ تکیے پر آدھا دھڑ ڈالے نیم دراز ہو گیا۔ "جانتی ہو، جس شاہد ملتانی کا نام سن کر ان سوروں کا موتر خطا ہو جاتا ہے پہلے کیا تھا؟"

میری نفی میں ہلتا سر اس نے شاید دیکھا ہی نہیں۔ اپنی ترنگ میں وہ رواں ہو گیا۔ "وہ یونیورسٹی میں اردو ادب کا طالب علم تھا اور خود بھی محبت، نرم گداز جذبوں اور خوش امیدی کے جذبات کا شاعر تھا۔ اس وقت بھی شاہد ملتانی کے نام سے بہت سے لوگ واقف تھے مگر اس وقت اس کی پہچان قتل و غارت گری نہیں بلکہ پھولوں جیسے شعر تھے۔"

میں دم بخود سا بیٹھا تھا۔ یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ آج جس شخص کے نام سے ایک خلقت کانپتی ہے کبھی شعر کہتا تھا۔ مگر یہ سوچ کر فوراً ہی یقین ہو گیا کہ میں بھی تو ڈاکٹر بننے جا رہا تھا۔ جس ہاتھ میں نشتر بھی کپکپا جاتا تھا آج وہی ہاتھ رائفل اور دستی بموں کو بھی باآسانی سنبھال و استعمال کر لیتے تھے۔

چکن لیگ پیس چباتے ہوئے شاہد ملتانی کی داستان جاری تھی۔ اس کی سرخ تر آنکھوں میں چھپا درندہ سو چکا تھا اور میرے سامنے خوش رنگ جذبوں کا شاعر شاہد ملتانی تھا۔

"ان دنوں یونیورسٹی میں آل پاکستان محفل مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔" اس نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ "مجھے بھی اس مشاعرے میں پڑھنے کا موقع ملا۔ میرے دو شعروں کو بڑی پذیرائی ملی۔ وہ دو شعر سنو گے؟"

زبان کی بجائے میں نے پھر سر کو اثباتی حرکت دی۔

اس نے چکن پیس چھوڑ کر شراب کا ایک بڑا سا گھونٹ لیا اور پھر سینہ مسلتے ہوئے اپنا سر تکیے پر ڈال دیا۔ اس کی نظریں جیسے تہہ خانے کی چھت سے گزر کر تاریک آسمان پر کچھ ڈھونڈنے لگی تھی۔ شاید یونیورسٹی میں گزرے یادگار دن، وہ مشاعرہ، وہ گزرے پل، پھر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور اک پرسوز آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

خشک پتوں کے ڈھیر کے ذرا اس پار دیکھنا
خراماں خراماں چلی آتی ہو گی بہار دیکھنا
ہمیں پہچاننے کو آگ میں پھینک دینا
پھر آگ میں پیدا ہوتے گل و گلزار دیکھنا

میں مبہوت رہ گیا۔ ان دو شعروں نے مجھے خاصا متاثر کیا تھا۔ واقعی وہ اچھا شاعر تھا۔ اس کے سینے کی گہرائیوں سے ایک دلدوز آہ نکلی اور وہ سیدھا ہو بیٹھا۔ "یہ لڑکیاں بھی بڑی عجیب چیز ہوتی ہیں۔ پتا نہیں کیوں یہ شاعر وغیرہ انہیں اچھے لگنے لگ جاتے ہیں۔ بھلا یہ تھوبڑا دیکھو، یہ ایسا ہے کہ کسی کو پسند آجائے اور پسند بھی اتنا کہ کچھ اور نظر بھی نہ آئے؟"

اپنی تھوڑی تھام کر اس نے باقاعدہ اپنے چہرے کو میرے سامنے معائنے کے لیے پیش کیا۔

بلاشبہ وہ ایک خوبرو جوان تھا، حالات کی سختی نے اسے جلا دیا تھا مگر میں تصور کی آنکھ سے دیکھ سکتا تھا کہ یونیورسٹی میں وہ نفیس کپڑوں اجلے چہرے کے ساتھ جب شعر پڑھتا ہو گا تو بہت سے دل اس کے لیے دھڑکتے ہوں گے۔ "بالکل شاہد صاحب! یہ چہرہ ایسا ہے کہ کئی اس پر مرتے ہوں گے۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

وہ حلق پھاڑ کر ہنسا۔ مجھے اس ہنسی میں درد کی واضح آمیزش محسوس ہوئی۔ وہ بولا۔ "تو بھی مراد علی کی طرح خچر ہے، اسے بھی میں شہزادہ گلفام نظر آتا ہوں۔" پھر لہجہ بدل کر اصل موضوع کی طرف آیا۔ "یونیورسٹی کی ہی ایک لڑکی تھی۔ عطیہ بندیال، مشاعرے کے دوران ہی کیوپڈ نے تیر چلایا اور اس کا دل گھائل ہوا۔ وہ میری طرف کھنچی چلی آئی۔ میں نے دامن بچانے کی بہت کوشش کی مگر اس کا رنگ میرے رنگ پر غالب آ گیا۔ وہ اداس آنکھوں، سیاہ بالوں اور تھوڑی پر کالے تل والی لڑکی میری آنکھوں میں پانی بن کر بس گئی۔

رفتہ رفتہ ہماری محبت کے چرچے یونیورسٹی کے درو بام میں سرگوشیاں بن کر ابھرنے لگے۔'' شاہد ملتانی کے لہجے میں گم گشتہ شاعر بولنے لگا تھا۔''سنا ہے ان دنوں میری آنکھوں میں ستارے جھلملاتے تھے اور گالوں پر گلاب چمکتے تھے۔آہ...... منظور بخش کریانہ فروش کا بیٹا جسے فی الحال شاعری کے علاوہ کچھ اور نہیں آتا تھا۔ بخت نصر بندیال ایس پی' پنجاب پولیس' جس کا پس منظر جاگیردارانہ تھا' اس کی اکلوتی بیٹی کی اداس آنکھوں پر غزلیں اور نظمیں لکھ رہا تھا۔

ان خوبصورت اور رنگین غبار جیسے دنوں کو جیسے پر لگ گئے۔ آخری سمسٹر سے پہلے عطیہ اپنے گاؤں سے ہو کر واپس آئی تو اس کی اداس آنکھوں میں انجانا سا خوف و ہراس تھا۔ چند دن تو وہ مجھ سے اپنی کیفیت چھپاتی رہی پھر ایک دن میرے کندھے پر سر رکھ کر اس نے ڈھیروں آنسو بہائے اور مجھ پر یہ بجلی گرائی کہ اس کی شادی کی بات چیت چل رہی ہے۔ اس کا چچازاد' جس سے بچپن میں اس کی نسبت طے ہوگئی تھی' اب پولیس میں اے ایس پی تھا۔

عطیہ نے بتایا کہ اس کی فیملی ویسے تو پڑھی لکھی تھی مگر وہ سخت قدامت پرست تھے۔ ان کے مرد اندر سے آج بھی قبائلی تھے۔

شاہد ملتانی نے باقی ماندہ شراب حلق میں انڈیلی اور پھر سینہ مسلنے لگا۔ شراب نوشی کی کثرت اسے تیزی سے کھا رہی تھی۔ اسے سنبھلنے میں کچھ دیر لگی۔ دوبارہ سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔''میری کہانی بھی روایتی ہی ہے۔ امیر باپ کی اکلوتی بیٹی' غریب عاشق' خاندانی روایت کی بلند و بالا دیواریں حق سے سر ٹکرا ٹکرا کر عاشق لہولہان ہو جاتا ہے۔

میری دوستی ایک سیاسی پارٹی کے اسٹوڈنٹس ونگ کے چند لڑکوں سے تھی۔ ان کی خود اعتمادی مجھے بڑی اچھی لگتی تھی۔ انہوں نے میرا حوصلہ بڑھایا اور اپنے تعاون کا یقین دلایا تو میں ایک دن عطیہ کو اعتماد میں لیے بغیر اس کے باپ ایس پی بخت نصر بندیال کے آفس پہنچ گیا۔

اس نے بڑے صبر و تحمل سے میری بات سنی۔ اس وقت میں نہیں جانتا تھا کہ بظاہر انسانی چہرے والے ایک زہریلے ناگ کے سامنے بیٹھا ہوں۔ جو اپنا زہر دل میں چھپائے میری بات سن رہا ہے۔ ساری بات سننے کے بعد اس نے مجھے اپنے سرکاری بنگلے پر رات کے کھانے کے لیے انوائٹ کر لیا۔

میں وہاں سے خوشی خوشی واپس لوٹا۔ حوصلہ بڑھانے والے دوستوں نے خوب پیٹھ ٹھونکی' دوپہر کو میں نے جب اپنی کارگزاری عطیہ کے گوش گزار کی تو اس کا گلابی رنگ خطرناک حد تک زرد پڑ گیا۔ اس کے آخری الفاظ آج بھی مجھے یاد ہیں۔''یہ تم نے کیا کیا شاہد! اپنے ہاتھوں سے میری قبر کھود دی۔''

شاہد ملتانی کے چہرے پر دکھ اور پچھتاوے کا تاثر اتنا گہرا تھا کہ تصویر کی مانند نظر آنے لگا تھا۔ وہ ایک دفعہ پھر تکیے پر گر گیا۔ دکھ تھا کہ اسے آری بن کر کاٹ رہا تھا۔ اس کا دکھ میرے دل کو بھی کاٹنے لگا تھا۔

''آہ...... اس کے بعد میں نے اس اداس آنکھوں والی لڑکی کو کبھی نہیں دیکھا۔ رات کو میں ایس پی بندیال کی سرکاری رہائش گاہ پر پہنچ گیا۔ وہاں شعلے برساتی آنکھوں والا عطیہ کا اے ایس پی منگیتر شہزاد بندیال بھی موجود تھا۔

کھانے کی ٹیبل کی بجائے میرا سرد مہری سے استقبال باہر لان میں کیا گیا۔ ایس پی بندیال نے پہلے مجھے اپنی ''خاندانی رومیات'' کا تعارف کروایا۔ جس میں سرفہرست خاندان سے باہر لڑکی کی شادی ناممکن تھی۔ خودسری دکھانے والی لڑکی اور اس کے

عاشق کے لیے بمعہ خاندان اجتماعی قبر کھودنے کو ترجیح دی جاتی تھی۔

اکلوتی بیٹی کو روایات کی بھینٹ چڑھانے سے بچانے کی غرض سے ایس' پی نے پیار' لالچ اور عبرت انگیز انجام' تینوں رخ مجھے دکھا کر بڑی خاموشی سے اپنی بیٹی کی زندگی سے نکل جانے کے لیے کہا۔

میری آنکھوں میں تو وہ کالے تل والی لڑکی سمائی ہوئی تھی پھر کہاں اپنی شوگر کی مریض ماں' بوڑھا باپ' جوان بہن اور چھوٹا بھائی نظر آتے۔ میں ڈٹ گیا۔ سیاستدانوں کے بہکائے جذباتی نوجوانوں کا ٹولہ میری پشت پر تھا۔ مجھے یاد ہے ان کے لیڈر گلزار المعروف گلزاری بھولا نے میرے کندھے پر ہاتھ مار کر اپنے مخصوص بلند آہنگ قہقہے کے بعد کہا تھا۔ "اوئے پدی عاشق! ہم کس دن کام آئیں گے ایسی کی تیسی ایس' پی اور اس کے قبائلی خون کی۔ کڑی کو سات پہروں میں سے اٹھا کر لے آئیں گے یار! کورٹ میرج کے بعد دیکھ لیں گے کہ اس ماں کے جنے میں کتنا دم ہے۔ تو اب شیر بن شیر دم کٹا شیر نہیں۔" میرے متفکر چہرے کو دیکھ کر اس نے پھر اپنا مخصوص قہقہہ لگا کر میرے کندھے پر دھپ جڑ دی تھی۔

یہ ایک علیحدہ کہانی ہے کہ میں نے عطیہ کا سراغ کیسے لگایا۔ وہ اپنے آبائی گاؤں میں اونچی دیواروں والی حویلی کے اندر اپنی شادی تک محبوس کر دی گئی تھی۔

مختصراً یہ کہ میں گلزاری بھولے اور اس کے ٹولے کے ساتھ اس "پری" کو "دیو" کی قید سے نجات دلانے کے لیے ان کے گاؤں جا دھمکا۔

ہماری فائرنگ سے حویلی کے دو محافظ خاصے زخمی بھی ہوئے اور ہم کسی طرح حویلی میں گھسنے میں بھی کامیاب ہو گئے مگر حویلی کے پائیں باغ میں ہماری پیش قدمی روک دی گئی۔ ایس' پی بندیال کے آبائی علاقے اور اس کی آبائی حویلی پر حملہ معمولی بات نہیں تھی۔ علاقے کی پولیس بڑی تیزی سے حرکت میں آئی تھی۔

ہم نے نکلنے کی کوشش کی تو مسلح دیہاتیوں نے یہ کوشش بھی ناکام بنا دی۔ ہم حویلی کے پائیں باغ میں ہی محصور ہو کر رہ گئے۔

جب پولیس فورس نے گھیرا ڈال کر ہمیں ہتھیار ڈالنے کے لیے کہا تو میرے ساتھ آئے بھی "ببر شیر دم کٹے شیر بن گئے اور ہم نے ہتھیار ڈال دیئے۔ شکر کا مقام تھا ایک سیلولر کمپنی نے اپنا دائرہ کار پسماندہ علاقوں میں حال ہی میں بڑھایا تھا۔ میرے ساتھیوں نے اپنے پشت پناہوں کو صورت حال سے آگاہ کیا اور خود بھی وہ بااثر خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ یوں ہم نے میڈیا کے سامنے خود کو پولیس کے حوالے کر دیا' ورنہ ایس' پی کی حویلی پر حملہ ایسا جرم تھا کہ پولیس مقابلے میں ہماری ہلاکت معمولی بات تھی۔ اس کے بعد میرے ساتھ جو بھی ہو جاتا کم تھا۔ روایتی چھترول کے ساتھ پولیس والوں نے میری "کلاسیکل" چھترول بھی کی۔ عطیہ کے انگارہ آنکھوں والے منگیتر نے اپنے ہاتھوں سے مجھے تشدد کا نشانہ بنایا۔

ایس' پی بندیال نے اپنا کہا پورا کر کے دکھایا۔ میڈیا کی وجہ سے وہ مجھے پولیس مقابلے کا "نشانہ" تو نہ بنا سکا مگر واقعی اس نے مجھے عبرت کا نشان ضرور بنا دیا۔

اقدام قتل' ممنوعہ بور کے ناجائز اسلحے سمیت نصف درجن سنگین ترین مقدمات میں مجھے نامزد کر دیا گیا۔ پھانسی تو نہ ہوئی مگر ساری عمر جیل میں ضرور گزارنی تھی۔

میرے کیے کا عتاب گھر والوں پر بھی ٹوٹا تھا۔ پیشی پر میری حالت دیکھتے ہی ماں نے دل تھام لیا اور چوبیس گھنٹے میں ہمیں چھوڑ گئی۔ چھوٹا بھائی' ایس پی بندیال کے بھیجے ایک اشتہاری کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ جوان بہن کا محلے کے ہی لڑکے کے ساتھ چکر چل رہا تھا۔ بندیال نے اس لڑکے کو ہاتھ میں کیا اور وہ' میری بہن کو بھگا کر لے گیا اور کوٹھے پر بٹھا دیا۔ بوڑھے باپ کو اور تو کوئی نہ سوجھی اس نے پاگل ہونے کا ڈھونگ رچایا اور ایک دربار پر جا بیٹھا اور ابھی تک وہیں ہے۔"

آہ...... میری آنکھوں کے سامنے ایک عجیب منظر تھا۔ پنجاب کا ٹاپ تھری اشتہاری جس کی سفاکی سے ایک دنیا کانپتی تھی۔ پولیس والوں کے لیے جو موت کا دوسرا نام تھا۔ پیشہ ور قاتلوں میں جس کا نام سب سے اوپر تھا۔ میرے سامنے بیٹھا آنسو بہا رہا تھا۔ دنیا جہان کی تمام تر بے چارگی اور تکلیف مجسم ہو کر جیسے میرے سامنے آ گئی تھی۔

شاہد ملتانی نے بے دردی سے آنکھیں مسلیں اور اپنے دونوں کھردرے ہاتھ میرے سامنے پھیلائے ۔"جانتے ہو ان ہاتھوں نے کس کس کی جان لی ہے؟" وہ پوری طرح شراب کے زیر اثر تھا۔

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

اس کا تمام تر دھیان اپنے ہاتھوں کی طرف تھا۔ میرے نفی میں ہلتے سر کو تو اس نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ "ان گنت لوگوں کو میں نے مارا ہے' پولیس والے' وہ لوگ جنہیں میں نے پیسے لے کر مارا ہے' عطیہ کا منگیتر اور...... اور اپنی بہن کو بھی میں نے انہی ہاتھوں سے مارا ہے' اس کا مر جانا ہی بہتر تھا۔ جس جہنم میں وہ تھی وہاں پل پل مر رہی تھی۔

میرے ہاتھوں سے ابھی تک کوئی بچا ہوا ہے تو وہ ایس' پی بندیال ہے۔ وہ بھی میری تاک میں ہے۔ ریٹائرڈ ہو گیا ہے مگر بوگیر کتے کی مانند میرے پیچھے ہے اور میں بھی اسے مارے بغیر مرنا نہیں چاہتا۔" ایک پل کے لیے جیسے اس کی آواز پاتال میں اتر گئی۔ وہ عجیب وجدانی انداز میں بولا۔ "کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ میری موت ایس' پی بندیال کے ہاتھوں لکھی ہے...... وہ' اپنی بیٹی کا قاتل بھی مجھے ہی سمجھتا ہے' اور میں اصل قاتل اسے۔"

مجھے اعصابی جھٹکا لگا۔ "کیا ہوا عطیہ کے ساتھ؟ کیا اسے بھی آپ......؟" دانستہ میں نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"او...... نہیں بھولے بادشاہ!" وہ سیدھا ہو بیٹھا۔ "اس کالے تل والی لڑکی نے اپنی شادی سے دو دن پہلے کرنٹ لگا کر خود کو ختم کر لیا تھا۔" اس کی آواز آنسوؤں سے بھیگ گئی اور چہرے کے نقوش میں گداز اتر آیا۔ "اس نے سچ کہا تھا کہ میں نے اپنے ہاتھوں سے اس کی قبر کھودی ہے۔ کاش میں ایس' پی بندیال کے پاس نہ جاتا۔" وہ دوبارہ تکیے پر گر گیا اور یوں سینہ مسلنے لگا جیسے کوئی چیز اسے اندر سے کاٹ رہی ہو۔ میں جانتا تھا وہ کیا چیز تھی' وہ شدید ترین پچھتاوے کا احساس تھا۔

شاہد ملتانی جو کبھی خوش امیدی کے جذبوں کا شاعر تھا' آج اس کے پاس ناامیدی اور پچھتاوے کے علاوہ کچھ بھی اور نہیں تھا۔ کچھ دیر وہ سینہ مسلتا رہا پھر گویا ہوا۔ "عطیہ کی خودکشی کے بعد وہ زہری ناگ جیل میں میرے پاس آیا تھا۔

"میرے سامنے کھڑے ہو کر اس نے اپنے ہاتھوں سے مجھے اذیت ناک انداز میں ہلاک کرنے کی قسم کھائی تھی اور میں نے بھی اسے بتا دیا تھا کہ زندگی رہی تو عطیہ کی موت کا بدلہ میں

اس سے لوں گا۔"

"آپ پھر جیل سے کیسے نکل آئے؟" میں ایک دفعہ پھر خود کو مداخلت سے باز نہیں رکھ سکا۔

شاہد ملتانی کے ہونٹوں پر زخمی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے پنجابی کا ایک شعر پڑھا۔ جس کا مفہوم تھا۔ "کائنات کی سبھی ڈوریں خداپاک کے ہاتھ میں ہیں، چاہے تو چڑیوں سے باز مروا دے چاہے تو باز سے چڑیوں کو دانا ڈلوادے۔"

شعر پڑھنے کے بعد وہ بولا۔ "جیل سے نکل بھاگنے کا ساماں بھی خود ایس، پی بندیال نے کر دیا۔ پیشی پر جاتے ہوئے قیدیوں والی گاڑی پر ایس، پی بندیال کے پالتو گیدڑوں نے حملہ کر دیا۔ ان کا مقصد مجھے ہلاک کرنا یا پھر اپنی تحویل میں لینا تھا۔ اس مڈبھیڑ میں مجھے نکل بھاگنے کا موقع مل گیا۔ میرے ساتھ استاد گل باز لغاری بھی تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ ٹرائبل ایریا لے گیا۔ اسی نے شاعر شاہد ملتانی سے مجھے "پیشہ ور قاتل" شاہد ملتانی بنایا ہے۔ اب واجد خان صاحب نے بیگھے ملوں کا صفایا کرنے کا ٹھیکہ مجھے ڈیڑھ کروڑ میں دیا ہے۔" اپنے فقرے سے محظوظ ہو کر وہ خود ہی ہنسا اور اگلے چند پل میرے لیے بڑے حیرت انگیز تھے۔ شاہد ملتانی خراٹے لے رہا تھا، وہ سو چکا تھا۔

میں کچھ دیر افسردہ سے انداز میں اسے دیکھتا رہا۔ اس نے صرف "جرم محبت" کیا تھا۔ جس کی سزا میں ماں، باپ، بہن اور بھائی کھو دیے تھے۔ جان لیوا دشمنیاں پال لی تھیں، موت کی تلوار چوبیس گھنٹے سر پر لٹک رہی تھی اور سب سے بڑھ کر پھولوں، تتلیوں، جگنوؤں اور بہاروں جیسے لطیف احساسات کے مالک کو خود کو پیشہ ور قاتل کے طور پر ڈھالنے میں جو اذیت پیش آئی ہوگی اس کا کوئی حساب نہیں تھا۔

بوجھل دل کے ساتھ اٹھ کر میں نے اس کے سر کے نیچے تکیہ درست کیا اور اس پر کمبل پھیلانے کے بعد خود بھی سونے کے لیے لیٹ گیا۔

❀ ❀ .... ❀ ❀

اگلے کئی دن ہم نے تہہ خانے میں گزارے۔ شاید شاہد ملتانی کو یاد بھی نہیں تھا کہ اس نے شراب کے نشے میں ڈوب کر مجھے کیا کیا بتا دیا ہے۔ البتہ پٹھان لڑکے نے مجھے خبردار ضرور کیا تھا کہ "لالے" کے سامنے اس انکشاف بھری رات کا کبھی ذکر نہ کروں ورنہ......

دوبارہ ذکر چھیڑنے کی مجھے ضرورت ہی نہیں تھی البتہ اب میں، شاہد ملتانی کو قطعی طور پر دوسری نظروں سے دیکھنے لگا تھا۔ میرے سامنے اب دونوں رخ تھے۔ میں نے وجاہت اور شوکے کو بھی اس رات کے متعلق نہیں بتایا۔

میرے دل میں شاہد ملتانی سے متعلق ایک نرم گوشہ بن چکا تھا۔ دوسری طرف وہ بھی مجھ پر خصوصی توجہ دے رہا تھا۔ اس کے گروپ کے سبھی لوگوں سے بھی ہم واقف ہو چکے تھے۔ کوئی دشمن دار تھا تو کوئی مفرور، چند شوقیہ کھلاڑی بھی تھے۔ ان میں کوئی بات مشترک تھی تو یہی کہ وہ سبھی پولیس کو زندہ سے زیادہ مردہ مطلوب تھے۔ ان سبھی کے سروں کی قیمت مقرر تھی۔ ہم لوگ بھی اب انہی کی صف میں آ کھڑے ہوئے تھے۔ بہت جلد ہمارے سروں کی بھی قیمت مقرر ہونے والی تھی۔

ضروریات زندگی کے سامان کے ساتھ ایک دفعہ احمد شاہ تہہ خانے میں آیا تھا۔ واجد صاحب کے متعلق استفسار پر اس نے بتایا کہ وہ بے حد مصروف ہیں۔ پولیس کی بھاری جمعیت نے باغات کے گرد گھیرا ڈال رکھا ہے۔ وہ بھرپور تلاشی لینا چاہتے ہیں۔ واجد صاحب اور آنجہانی میجر صاحب کا اثر و رسوخ فی

الحال انہیں روکے ہوئے ہیں۔

اس اطلاع نے شاہد ملتانی اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی تفکر میں مبتلا کر دیا تھا۔ بے شک ہم محفوظ اور خفیہ ٹھکانے پر تھے مگر کسی خفیہ تہہ خانے کا خیال کسی بھی "قابل دماغ" میں آ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ بھوکے کے ڈھیر میں سے اگر گاڑیاں برآمد ہو جاتیں تو پولیس والے باغات کا کونا کونا کھود دیتے۔

احمد شاہ کی اطلاع کے مطابق شاہد ملتانی وغیرہ کے "شب خون" کے نتیجے میں تین پولیس اہلکار ہلاک اور درجن بھر زخمی ہوئے تھے جن میں سے دو کی حالت نازک تھی۔ بیگھے ملوں نے اپنا نقصان چھپا لیا تھا مگر اڑتی اڑتی خبر تھی کہ ان کے بھی تین چار بندے ہلاک ہوئے ہیں اور دستی بموں سے زخمی ہونے والے تو درجن بھر سے زائد ہی ہیں۔ دو تین ان کے اپنے خاندان کے مرد بھی زخمیوں میں شامل ہیں۔ یہ اطلاع جیسے زخموں پر ٹھنڈک جیسا احساس لیے ہوئے تھی۔ یہیں ہمیں پتا چلا کہ بیگھے ملوں کا صفایا کرنے کے لیے واجد صاحب نے شاہد ملتانی کو ہائر کیا تھا۔ جدید ترین اسلحے کے ڈھیر اور بلٹ پروف گاڑیوں کے لیے مالی تعاون اس کے علاوہ تھا۔ بیگھے ملوں کی حویلی پر حملے کی تیاری مکمل تھی انتظار تھا تو اس خفیہ اطلاع کا کہ بیگھے ملوں کے سبھی سرکردہ افراد کسی سازشی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس حویلی میں اکٹھے ہیں۔

اس دوران واجد صاحب کے پولیس میں موجود مخبروں نے انہیں اطلاع دی کہ ہم لوگوں کو گھیر لیا گیا ہے۔ واجد صاحب ہماری طرف سے بے حد متفکر تھے اور مسلسل اس کوشش میں تھے کہ ہم لوگوں تک ان کی رسائی ہو جائے۔

ہمارے گھیرے جانے کی اطلاع نے اچانک ہی انہیں دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ شاہد ملتانی ان کا "خفیہ ہتھیار" تھا اور خفیہ ہتھیار کی کامیابی اسے خفیہ انداز میں اچانک استعمال کرنے کے لیے ہی ہوتی ہے۔ اب اگر ہمیں پولیس کے گھیرے سے نکالنے کے لیے وہ اس ہتھیار کو استعمال کرتے تو لامحالہ بیگھے مل چوکنا ہو جاتے اس کے بعد شاہد ملتانی کو موثر انداز میں ان کے خلاف استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔

دوسری طرف ہمیں بھی پولیس کے ہاتھوں بے رحمانہ انداز میں مرتا دیکھنا اور خاموش بیٹھے رہنا ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس لمحاتی کشمکش کا فیصلہ ہمارے حق میں ہوا اور جو خفیہ تیاری بیگھے ملوں کا صفایا کرنے کیلئے کی گئی تھی وہ ہمیں پولیس کے گھیرے سے نکالنے کے لیے صرف ہو گئی۔ ساری صورت حال جاننے کے بعد میرے دل میں واجد صاحب کی عزت اور بھی بڑھ گئی تھی۔

چھٹی رات واجد صاحب اچانک ہی تہہ خانے میں آئے، اضطراب و سراسیمگی ان کی صورت سے عیاں تھی۔ بظاہر وہ پرسکون نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے وجاہت، شوکے اور مجھے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ شاہد ملتانی گرگ باراں دیدہ تھا۔ غالباً اس نے صورت حال بھانپ لی تھی۔ اس نے انداز میں کہا۔ "خان صاحب! ان بلونگڑوں کو کہاں لے چلے ہیں؟ ہمارا دل لگ گیا ہے انہیں ہمارے پاس ہی رہنے دیں۔"

واجد صاحب نے گہرا سانس لیا اور غالباً کسی فیصلے پر پہنچ گئے اور ٹھہرے ہوئے انداز میں بولے۔

"شاہد! تم لوگوں سے میں کچھ چھپانا نہیں چاہتا۔ دباؤ ناقابل برداشت ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے کہ پولیس باغات پر دھاوا بول دے، میں نے انہیں تلاشی کی اجازت دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" آخر میں انہوں

نے شاہد ملتانی سے نظریں چرالی تھیں۔

بے آواز تالی بجاتے ہوئے شاہد ملتانی مسکرایا۔ یہ عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ اس پل اس کے چہرے پر عجیب سی غیر انسانی چمک نظر آنے لگی تھی۔ میں نے سنا تھا کہ ایسی چمک غیر انسانی بچ پیشہ ور قاتلوں کا خاصا ہوتا ہے۔

''واہ خان صاحب...... واہ! پٹھان تو اپنے مہمانوں پر بچے کٹوا دینے کے لیے مشہور ہیں آپ تو اپنے بندے نکال لے جارہے ہیں اور ہمیں سوروں کے بھوکے گلے کے سامنے پھینک رہے ہیں...... واہ ...... واہ...... واہ'' اس نے پھر تالی بجائی۔ اس کے ساتھیوں کے چہروں پر بھی خشونت نظر آنے لگی تھی۔ (واضح رہے کہ ترین پٹھانوں کی ہی ایک گوت ہے) واجد صاحب کا سرخ چہرہ سرخ تر ہوگیا۔

''اب ایسی بات بھی نہیں ہے شاہد!'' لہجے کی کپکپاہٹ سے واضح تھا کہ انہوں نے شاہد ملتانی کا گستاخ لہجہ بڑی مشکل سے برداشت کیا تھا۔ ''پولیس اس تہہ خانے تک کبھی نہیں پہنچ سکتی۔ تم لوگوں کے ''نقش پا'' مٹانے کے لیے میں نے بہت بڑا کام کردیا ہے۔ کروڑوں روپے مالیت کی بلٹ پروف گاڑیاں جلا کر سکریپ میں تبدیل کردی گئی ہیں۔ وہ گاڑیاں برآمد ہوجائیں تو پھر ہی پولیس نے باغات کھودنے تھے۔ تہہ خانے تک پہنچنے کے چانسز ایک فیصد سے بھی کم ہیں۔''

شاہد ملتانی وغیرہ کے ساتھ ساتھ ہم تینوں بھی بھونچکا رہ گئے تھے۔ واجد صاحب نے واقعی بہت بڑا نقصان برداشت کیا تھا' ہم لوگوں کے لیے۔

شاہد ملتانی اور اس کے ساتھیوں کے تنے ہوئے جسم اور چہروں پر آئی کدورت تیزی سے کم ہوگئی تھی۔ واجد صاحب نے شاہد ملتانی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ ''اور شاید تم یہ بھول گئے ہو کہ ہمارے درمیان کچھ باتیں پہلے سے طے تھیں۔''

شاہد ملتانی نے تیزی سے رنگ بدلا۔ غیر انسانی چمک تیزی سے معدوم ہوگئی اور اس کی جگہ ایک پھیکی سی مسکراہٹ طلوع ہوئی۔

''خان صاحب! آپ تو ناراض ہوگئے۔ میری بات کا آپ نے غلط مطلب لے لیا ہے۔ اس چھوکرے کے ساتھ واقعی میرا دل لگ گیا ہے۔'' اس نے مصنوعی بشاشت کے ساتھ میری کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔

واجد صاحب کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ''تمہارے لیے جتنا کرسکتا تھا کررہا ہوں۔ بقایا طے شدہ معاوضہ تمہیں ابھی فراہم کردیا جائے گا۔ یہاں سے نکلنے کے دوسرے راستے سے تم واقف ہو۔ جس احاطے میں وہ راستہ نکلتا ہے وہاں بغیر نمبر پلیٹ والے دس 125 موجود ہیں۔ آگے تم لوگوں کی قسمت۔ جواں مردی اور ہمت' ہتھیار تم لوگوں کے پاس پولیس والوں سے اچھے ہیں۔''

''ایسی نوبت آگئی تو درجنوں سوروں کے گھر بین ہوں گے خان صاحب!'' شاہد ملتانی کی جون دوبارہ سے تبدیل ہوگئی۔ ''ہمارے آگے پیچھے تو رونے والا کوئی ہے نہیں۔''

واجد صاحب کے تاثرات میں بھی تبدیلی آئی۔ مسکراتے ہوئے انہوں نے شاہد ملتانی کو کھینچ کر گلے سے لگایا۔ ''ایسی نوبت ہی نہیں آئے گی یار!'' پھر انہوں نے اس کے کان کے قریب سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''اپنے لڑکوں کے حوالے سے میں معذرت چاہتا ہوں۔ ان کے والدین کو میں جواب دہ ہوں۔'' قریب ہونے کے سبب میں نے یہ سرگوشی سن لی تھی۔

کچھ دیر بعد ہم تینوں واجد صاحب کے ساتھ تہہ

خانے سے باہر تھے۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور دور کہیں بادلوں کے گرجنے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ تاریک رات تاریک تر ہو رہی تھی اور بارش ہونے کی قوی امید تھی۔

کنوؤں سے لدے پودوں کے درمیان پختہ روش پر چلتے ہوئے ہمارا رخ گیسٹ ہاؤس کی طرف تھا۔ باغات کے عین درمیان میں واقع اس تین منزلہ پرشکوہ گیسٹ ہاؤس میں اکثر ملکی وغیر ملکی مہمانوں کی آمد و رفت رہتی تھی اور ترین فیملی کے اکثر ممبران بھی پھلوں کی خوشبو سے بوجھل ہواؤں اور صبح سویرے ہزاروں پرندوں کی چہکاروں سے لطف اندوز ہونے کے لیے یہاں قیام کرتے رہتے تھے۔ ہم تینوں احتراماً واجد صاحب سے دو قدم پیچھے چل رہے تھے۔ انہوں نے میرا ہاتھ تھام کر اپنے برابر کیا اور بڑی محبت سے بولے۔ ''تم لوگ میرے اپنے ہو..... شاہد ملتانی وغیرہ کرائے کے لوگ ہیں۔ کل رات تک پولیس نے ریڈ کر دینا ہے' کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے میں نے تم لوگوں کو حویلی میں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔''

''مگر کیسے جناب؟ باہر تو ہر طرف آپ کے بقول پولیس ہے۔'' میں نے قدرے تردد سے پوچھا۔

''اس کے لیے تم فکر مند نہ ہو۔'' انہوں نے پرسکون انداز میں کہا۔ ''میں نے ڈی آئی جی سے بات کر لی ہے۔ گیسٹ ہاؤس میں درجن بھر غیر ملکی مہمان اور ہماری فیملی کے کچھ مرد و زن بھی موجود ہیں' صبح ''معزز مہمانوں'' کو بنا کسی جانچ پڑتال کے باغات سے نکال لیا جائے گا۔ اس کے بعد پولیس والوں کو اجازت ہوگی جب چاہیں باغات کی مکمل تلاشی لے لیں' اب سمجھ آئی؟''

میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی اثبات میں سر ہلایا۔

''تم تینوں لمبے تڑنگے چھوکرے کل صبح برقعوں میں لپٹے دیگر خواتین کے ساتھ حویلی پہنچ جاؤ گے۔''

اسی وقت کہیں قریب ہی زور سے بجلی کڑکی اور پل بھر کے لیے حد نظر تک ہر چیز روشنی میں نہا گئی۔

گیسٹ ہاؤس کے قریب ہی احمد شاہ موجود تھا۔ وہ شوکے اور وجاہت کو لے کر سرونٹ کوارٹرز کی طرف نکل گیا۔

''آؤ تمہیں اپنی فیملی کے چند افراد سے ملواؤں۔ تمہیں ملنے کے لیے وہ لوگ بے تاب ہو رہے ہیں۔ واجد صاحب...... میرا ہاتھ تھامے مجھے اس گیسٹ ہاؤس کے اندر لے گئے' جس کی آرائش اور زیبائش اور فائیو اسٹار سہولیات کی میں نے اب تک کہانیاں ہی سنی تھیں۔

دبیز اور لشکارے مارتے قالین کو دیکھ کر میں نے جوتے اتارنے کی کوشش کی تو انہوں نے مجھے منع کر دیا۔ یہ ایک وسیع ڈرائنگ روم تھا۔ دیواروں پر قیمتی سنہری فریموں والی تصاویر' ایک فریم شدہ رائل ٹائیگر کی مکمل اور بے عیب کھال۔ قیمتی مسٹرڈ لیدر کی پوشش والا فرنیچر اور نیلگوں شیشے کی ٹاپ والی میزیں' سب کچھ متاثر کن تھا۔

اس وقت یہ وسیع ڈرائنگ روم خالی پڑا ہوا تھا۔ واجد صاحب کی معیت میں' میں اس پرشکوہ ڈرائنگ روم سے گزرا۔ اچانک ہی تصویروں کے درمیان میری نظر ایک پینٹنگ پر پڑی۔ یہ ٹہنی سے جھولتے دو عدد کنوؤں کی تھی جن پر شبنم کے قطرے چمک رہے تھے۔ کلرز کا استعمال بڑا متاثر کن تھا۔ میری توجہ پینٹنگ کے کونے میں بڑے آرٹسٹک انداز میں لکھے نام نے کھینچ لی۔ ''گل لالہ'' ذہن میں گھنٹی سی بجی اور یاد آ گیا کہ غالباً گل لالہ میجر صاحب کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی بیٹی کا نام تھا۔ جسے مصوری

کا بے حد شوق تھا اور وہ کینیڈا میں زیر تعلیم تھی اور ساتھ ساتھ مصوری کی باقاعدہ کلاسیں لے رہی تھی۔

یہ یاد آیا تو بھولے بھٹکے کچھ اور مناظر بھی یاد آ گئے۔ مجھے سیاہ قیمتی چادر میں لپٹی براؤن آنکھوں والی سروقد لڑکی یاد آئی جس کے بے حد سفید کبوتروں جیسے ہاتھوں میں جدید کیمرہ تھا' ان دنوں گاؤں میں ہیضے کی وبا پھیلی تھی اور شہر سے فرسٹ ایڈ کی ٹیمیں آئی ہوئی تھیں۔ وہ لڑکی ہیضے سے متاثرہ لوگوں کی تصویریں بنا رہی تھی۔ (واضح رہے کہ ترین فیملی کی خواتین جب گاؤں میں ہوتی تھیں تو بڑی سی سیاہ چادر میں لپٹی رہتی تھیں۔ گاؤں کے لوگوں نے صرف ان کی آنکھیں ہی دیکھی تھیں۔ البتہ گھریلو ملازماؤں کے ذریعے سینہ گزٹ کے سبب سبھی لوگ ترین فیملی کی خواتین کے غیر معمولی حسن وجمال سے واقف تھے۔ نوجوان سرگوشیوں میں ان کی باتیں کرتے تھے اور سینے مسلتے ہوئے ٹھنڈی آہیں بھرتے تھے۔

ڈرائنگ روم سے گزر کر ہم ایک وسیع ٹی وی لاؤنج میں آئے۔ دیوقامت ٹی وی دیوار میں نصب تھا اور اس کے سامنے سمندری جھاگ جیسے قالین پر گاؤ تکیے پھیلے ہوئے تھے۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ چمکدار پنک رنگ کے آرام دہ صوفے پڑے ہوئے تھے۔ سمندری جھاگ جیسے قالین پر یہ صوفے نگاہوں کو بڑے بھلے لگ رہے تھے۔ ان صوفوں پر تین افراد براجمان تھے۔ آپس کی گفتگو چھوڑ کر ان کی توجہ ہماری طرف ہو گئی تھی بلکہ ان کی پراشتیاق نگاہوں کا محور مرکز میں ہی تھا۔

لمبے قد' چوڑے جسم' سرخ وسفید رنگت' کھڑی ناک اور کشادہ پیشانیاں' ترین فیملی کے مردوں کا طرہ امتیاز تھیں۔ دو نسبتاً جوان تھے ایک سفید مونچھوں والے بارعب شخص کو شاید میں نے پہلے بھی کبھی دیکھا تھا۔

واجد صاحب نے میرا ان سے تعارف کروایا۔ غائبانہ طور پر بھی وہ مجھ سے بخوبی واقف تھے۔ زوردار بارش شروع ہو چکی تھی۔ پہلو کی بڑی سی شیشے کی کھڑکی پر تواتر سے پانی برس رہا تھا اور گاہے بگاہے چمکنے والی بجلی میں پل بھر کے لیے باغات دور تک روشن نظر آتے تھے۔

کھانے کے ٹائم کو گزرے خاصا وقت ہو گیا تھا۔ میرے علاوہ ان لوگوں نے بھی کھانا کھا لیا تھا۔ اتفاق رائے سے چائے لینے کا فیصلہ ہوا۔ نصف درجن دیگر لوازمات کے ساتھ چائے آ گئی۔

بیگھے ملوں کی زیادتیوں اور ان کا ''صفایا'' کر دینے کے عزم کے ساتھ گفتگو کا سلسلہ چائے کے دوران جاری رہا۔

اس دوران میری چھٹی حس نے احساس دلایا کہ حاضرین کے علاوہ کچھ اور نظریں بھی مجھ پر جمی ہیں۔ میں نے غیر محسوس انداز میں اردگرد کا جائزہ لیا اور اسے وہم جان کر جھٹک ہی رہا تھا کہ ایک پردے کی حرکت نے اس شک کو یقین میں بدل دیا۔

ہماری یہ محفل کئی مضبوط ارادوں اور فیصلوں کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی۔ واجد صاحب نے ایک ادھیڑ عمر خادمہ کی رہنمائی میں مجھے سونے کے لیے بھیج دیا۔

اپنی پرتعیش خوابگاہ میں میرے ذہن میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ پردے کے پیچھے سے مجھے دیکھنے والا کون تھا؟ میجر صاحب کے جتنے بھی ملازمین تھے سبھی بے حد جاں نثار اور وفادار تھے کسی کی طرف سے نمک حرامی کی امید نہیں تھی مگر ایک بے حد تلخ تجربہ مجھے ہو چکا تھا۔

تھوڑی دیر کی کوشش سے میں خود کو تن بہ تقدیر کر کے سونے کے لیے لیٹ گیا۔ باہر بارش زور پکڑ

چکی تھی اور رہ رہ کر بجلی چمک رہی تھی۔

کچھ دیر بعد نیند کی دیوی مہربان ہوگئی۔ نہ جانے رات کا کون سا پہر تھا جب ایک خفیف سے کھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی۔ چھٹی حس نے کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس دلایا تو میں نے ایک جھٹکے سے کمبل دور اچھال دیا۔ اسی پل بجلی کڑکی اور شیشے کی کھڑکی سے گزر کر ایک لمحے کے لیے میری پرتعیش خواب گاہ کو روشن کر گئی' سیاہ مخملی نائٹ گاؤن میں ایک سروقیامت براؤن آنکھوں والی لڑکی میرے سامنے تھی۔ اس کے بے حد سفید کبوتر جیسے ہاتھوں میں ایک چابی لرز رہی تھی۔

......☆☆☆......

ذیشان خان پر نظر پڑتے ہی میں نے ایک خیمے کی اوٹ لے لی۔ بارش کے سبب جانوروں کے ریوڑ چرانے کے لیے نہیں نکالے گئے تھے۔ اسی سبب قبیلے کے سبھی مرد و زن خیموں میں ہی تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے کئی پاؤنڈے جیپوں کے گرد اکٹھے ہوگئے تھے۔ میرے بدترین اندیشوں نے آج صبح سویرے ہی حقیقت کا روپ دھار لیا تھا۔ ہمارے تعاقب پر نکلے شکاری کتے بالآخر ہمارے نزدیک پہنچ ہی گئے تھے۔

میں نے بوکھلائے ہوئے سردار خوشحال کو دیکھا۔ رم جھم سے بے نیاز وہ جیپوں کی طرف تیز قدموں سے جا رہا تھا۔ اسے ایک پتھر سے ٹھوکر لگی اور وہ گرتے گرتے بچا۔ اس کے ساتھ چند اور قبیلے کے معزز افراد بھی تھے۔ میری نظریں شامل کو ڈھونڈ رہی تھیں مگر وہ کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد سردار خوشحال کی ہمراہی میں' میں نے ذیشان خان اور دیو ہیکل سالار خان کو سردار کے خیمے کی طرف جاتے دیکھا۔ سردار خوشحال کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ان کے قدموں میں بچھ جائے۔

سردار خوشحال کا فدویانہ انداز دیکھ کر صاف پتا چلتا تھا کہ وہ...... ذیشان اور سالار خان سے بخوبی واقف ہے۔ ابھی اس نے باکی موشو اور سرخ بھیڑیے کی دید نہیں کی تھی ورنہ اس نے تو ان لوگوں کو ہتھیلیوں پر بٹھا کر خیمے میں لے جانا تھا۔

ساتھ ہی مجھے یہ اندیشہ پریشان کرنے لگا کہ کہیں سردار ہم لوگوں کو ان درندوں کے حوالے نہ کردے۔ آئمہ اور عثمان کی فکر مجھے کھانے لگی۔ ڈھارس تھی تو شامل خان کی' اس کے علاوہ قاصد بھی گل ریز کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ وہ پہنچ گیا ہوگا یا پہنچنے والا ہوگا۔ اگر ہمیں سردار ان لوگوں کے حوالے کر دیتا تو پھر گل ریز کو کیا جواب دیتا۔

خیموں کی اوٹ لیتے ہوئے میں جیپوں کے جتنا قریب جا سکتا تھا چلا گیا۔ میرا مقصد دیگر جیپ سواروں کو دیکھنا تھا کہ ان میں طورا خان وغیرہ بھی ہیں۔ طورا خان کی موجودگی کا امکان کم تھا۔ وہ سردار تھا اور سردار خوشحال سے بات چیت کے لیے خود ہی سامنے آتا۔

جیپوں میں اجنبی چہروں والے مسلح قبائلی بھرے ہوئے تھے۔ اس کوشش کا مجھے ایک اور فائدہ ضرور ہوا۔ ایک جیپ کی نمبر پلیٹ پر مجھے افغانستان کا قومی نشان ضرور نظر آ گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ طورا خان وغیرہ کو افغانستان میں بھی حواری مل گئے تھے۔ یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ سرحد کے دونوں جانب آباد قبائل نے کبھی اس ''لکیر'' کو قبول نہیں کیا تھا۔ آپس میں رشتے داریوں کے علاوہ ان کی دونوں جانب آزادانہ آمد و رفت جاری رہتی تھی۔ اس لیے طورا خان کے حلقہ احباب کے کسی بااثر ممبر کا افغانستان میں موجود ہونا بڑی عام سی بات تھی۔

میں جتنی احتیاط سے آگے گیا تھا اتنی احتیاط سے

واپس لوٹ آیا۔ خیموں کے درمیان ایک جگہ جلانے کی لکڑیوں کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ میں اس کی اوٹ میں دبک کر بیٹھ گیا۔ یہاں سے میں آسانی کے ساتھ جیپ سواروں پر نظر رکھ سکتا تھا اور کسی بھی ناگہانی صورت حال سے نمٹ سکتا تھا۔ شامل خان کے دیے دیسی ساختہ پسٹل اور پنڈلی سے بندھے جاں نثار ساتھی کی موجودگی میرے لیے کافی تھی۔

مجھے لکڑیوں کے درمیان دبکے خاصی دیر ہوگئی تھی۔ مسلسل رم جھم جاری تھی۔ موم جامہ کی ہوئی چادر مجھے خاصا تحفظ دے رہی تھی۔ بارش کے سبب باؤندوں کی اکثریت خیموں میں دبکی ہوئی تھی ورنہ اب تک مجھے یہاں دیکھا جاچکا ہوتا۔

ایک قریبی خیمے سے گاہے بگاہے کسی جواں سال لڑکی کی کراہتی ہوئی آواز بلند ہوتی تھی اور بارش میں ٹھٹھر کر رہ جاتی تھی۔ یہ وہی لڑکی تھی جس کی شادی کو ابھی پورا ایک مہینہ بھی نہیں ہوا تھا اور اس کا محبوب شوہر شکار کے دوران پراسرار طور پر غائب ہوگیا تھا۔

میرے دماغ میں دوبارہ سے کھلبلی سی مچ گئی۔ بستی کے دو شکاری اور دو پہرے پر مامور تو جوان کہاں غائب ہوگئے تھے؟ ان کا کوئی سراغ کیوں نہیں ملا تھا؟ اور شامل خان پر حملہ کرنے والی پراسرار ہستی کون تھی؟ کیا دیگر گم شدگیوں میں بھی اسی ہستی کا ہاتھ تھا؟

رہ رہ کر ذہن میں شامل خان کی گردن کے زخم کی شبیہہ ابھرتی تھی اور پورے وجود میں پراسرار سنسنی دوڑ جاتی تھی وہ گہرائی تک اترے چپٹے دانت اور جبڑے کی بے پناہ طاقت و مضبوطی بے حد حیران کن تھے۔

اچانک ہی جیپ سواروں میں واپسی کے آثار نظر آنے لگے۔ ذیشان خان اور سالار خان جیپوں میں سوار ہو رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے جیپیں گھومیں اور کچھ ہی دیر میں میری نگاہوں سے اوجھل ہوگئیں۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور واپس شامل خان کے خیمے میں آ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ جلد ہی سردار خوشحال کی طرف سے میرا "بلاوا" آنے والا ہے۔

مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ایک بے حد جسیم 'کرخت چہرے والا بدبودار پاؤندا' سردار کے بلاوے کا پیغام لے کر آ گیا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں میرے لیے ناپسندیدگی صاف نظر آرہی تھی۔ میں اس پاؤندے کو پہلے بھی سردار خوشحال کے آس پاس دیکھ چکا تھا۔

میں سردار خوشحال کے خیمے میں داخل ہوا تو تناؤ کی کیفیت میں وہ اپنی خشخشی داڑھی کو مسلسل بل دے رہا تھا۔ چہرہ زرد اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی وہ پھٹ پڑا۔ "نہ جانے کون سی منحوس گھڑی تھی جب تو نے قبیلے میں قدم رکھا تھا۔ میں پاگل اور اندھا ہوگیا تھا جو تیری کہانی پر یقین کر بیٹھا۔" اس نے باقاعدہ سر پیٹتے ہوئے کہا "تو چھچھوندر ہے جسے نہ میں نگل سکتا ہوں اور نہ اگل سکتا ہوں۔ تو نے پہلے سردار طوراخان اور ذیشان خان کا نام کیوں نہیں لیا کہ تو ان کا مجرم ہے؟" آپے سے باہر ہو کر اس نے باقاعدہ مجھے گریبان سے پکڑ کر جھنجوڑا۔

اپنے سردار کے تیور دیکھ کر مجھے ساتھ لانے والا پاؤندا اور ایک دوسرا پاؤندا بھی الرٹ ہوگئے۔ ان کے چہروں کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ اگر سردار حکم کرے تو وہ لمحوں میں میری تکابوٹی بنادیں۔

میں نے خود کو پرسکون رکھتے ہوئے سردار کی مزاحمت نہیں کی۔ "میں کسی طوراخان اور ذیشان خان کو نہیں جانتا۔ میں نے آپ کو کوئی کہانی نہیں

سنائی، جو حقیقت تھی آپ کے گوش گزار کر دی۔ آپ کو گل ریز کی زبانی میری صداقت کا ثبوت مل جائے گا۔"

میرا گریبان چھوڑ کر سردار نے بے بسی سے ہاتھ ملے۔ "کاش ہم نے ملک گلریز کو خط نہ لکھا ہوتا تو تجھے ذیشان خان کے حوالے کر کے ہاتھ باندھ کر معافی مانگ لیتے۔"

"ذیشان خان وغیرہ کیا بہت خطرناک لوگ ہیں جو آپ جیسا سردار بھی ان سے خوف کھا رہا ہے؟"

"انجان نہ بن" سردار اتنے زور سے چیخا کہ کھانسنے لگا۔

میرے عقب میں کھڑے جسیم پاؤندے نے اپنی رائفل کی نال سے میری گردن کو زوردار ٹھوکا دیتے ہوئے غرا کر کہا۔ "زبان بند رکھ۔"

سردار ایک نئے طیش و غضب کے ساتھ مجھ پر جھپٹ پڑا۔ "تو ان کے جس خاص مہمان کو یرغمال بنا کر وہاں سے نکلا ہے، ابھی وہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ تو اسے ہلاک کر چکا ہے۔"

"یہ محض الزام ہے۔ وہ انہی کی فائرنگ سے مرا ہے۔" میں اپنے موقف پر قائم رہا۔

عقب میں کھڑے پاؤندے نے اس دفعہ دوہتڑ میری گردن پر مارا۔ کم بخت کے وجود میں کسی گینڈے کی سی طاقت تھی میں نے بڑی مشکل سے خود کو گھٹنوں کے بل گرنے سے بچایا تھا۔ دماغ میں انگارا سا دہکا مگر آئمہ اور عثمان کا خیال آتے ہی سرد پڑ گیا۔

سردار نے دوہتڑ مارنے والے کو ڈانٹا جو بھی تھا قبیلہ مجھے گل ریز کے جواب تک "مہمان" کا درجہ دے چکا تھا۔ سردار نے کھانسی اور پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کی۔ اس دوران خیمے کے اندرونی حصے سے آئمہ کے رونے کی آواز آنے لگی۔ شاید کسی روزن سے اس نے اپنے "بھیا" کی حالت کا مشاہدہ کر لیا تھا۔

سردار نے کرخت لہجے میں اپنی چھوٹی بیوی کو آئمہ کو چپ کرانے کے لیے کہا۔ اس کے چہرے پر بے بسی اور جھنجلاہٹ جیسے مجسم ہو کر رہ گئی تھی۔

آئمہ کے رونے میں کوئی کمی نہیں آئی۔ سردار نے چیخ کر آئمہ کو نشست گاہ میں بھیجنے کے لیے کہا۔ فوراً ہی پردہ ہٹا اور بلکتی ہوئی آئمہ مجھ سے آ لپٹی۔ میں نے اسے نرمی سے بازو کے گھیرے میں لے لیا۔ وہ معصوم میرے وجود میں پناہ ڈھونڈنے لگی۔ "آپ کو یہ لوگ مار کیوں رہے ہیں بھیا؟" اس نے آنسوؤں سے بھیگی آواز میں پوچھا۔

"ایک غلط فہمی تھی جو دور ہو گئی ہے۔ اور یہ بھلا کوئی مار ہے" میں اسے حوصلہ دینے کی غرض سے مسکرایا۔ اس نے ڈری ڈری نظروں سے خشمگیں چہروں والے پاؤندوں کو دیکھا۔ "بھیا! وہ لوگ کچھ دیر پہلے یہاں آئے تھے، یہ لوگ ہمیں ان کے حوالے تو نہیں کر دیں گے؟" سرگوشی کے انداز میں اس نے مجھے اطلاع دی اور اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

"بالکل نہیں۔" میں نے اس کا سر چوما۔ "بلکہ غلط فہمی دور ہونے کے بعد یہ لوگ چند دنوں میں ہمیں ہمارے گھر بھیجنے والے ہیں۔"

یہ سن کر اس کے راکھ چہرے پر زندگی کی رمق ابھری۔ سردار خوشحال بغور ہمیں دیکھ رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے کی خفگی میں نمایاں کمی آ چکی تھی۔

"یہ تو بہت اچھے اور مہمان نواز لوگ ہیں۔ تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

کچھ دیر میں اسے سمجھا بجھا اور آنسو پونچھ کر میں

نے دوبارہ سردار کی بیوی کے پاس بھیج دیا۔
"یہ دونوں بچے کون ہیں؟" سردار نے مجھ پر نظریں جما کر رمزیہ انداز میں پوچھا۔
"میں پہلے ہی اس سوال کا جواب دے چکا ہوں۔" میں نے آہستگی اور نرمی سے کہا۔
"ذیشان خان کا کہنا ہے کہ تو ان بچوں کو ان کے پاس سے اغوا کر کے لایا ہے مگر بچے تجھ سے مانوس ہیں یہ بات تیرے حق میں جاتی ہے۔"
"میں اس خوش خیالی کے لیے محترم سردار کا ممنون ہوں۔"
سردار کے لہجے نے دوبارہ رنگ بدلا۔ "ملک گل ریز کی طرف سے قاصد چند دنوں میں لوٹ ہی آئے گا۔ میں ایک دفعہ پھر تجھے بتادوں کہ اگر تیری کہانی غلط نکلی تو خود کو تو بہت کڑے حالات میں پائے گا۔"
"میں جھوٹا ثابت ہوا تو ہر سزا کے لیے تیار ہوں۔"
ہاتھ کے اشارے سے سردار نے مجھے واپس جانے کے لیے کہا۔
میں واپس خیمے میں آ گیا۔ شامل دوپہر کے کھانے تک لوٹ آیا۔ مجھ سے ملنے سے پہلے ہی اسے ذیشان خان کی آمد کی اطلاع مل گئی تھی۔
خیمے میں آیا تو خاصا متفکر تھا۔ میں نے اس سے طویل غیر حاضری کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ ایک چرواہے نے یہاں سے خاصا دور ایک درے میں کسی لاش کی موجودگی کی اطلاع دی تھی' بس اسے دیکھنے گیا تھا۔"
"پھر کیا رہا؟"
"لاش خاصی پرانی اور ناقابل شناخت تھی۔ مردار خور جانور اور پرندے زیادہ حصے چٹ کر چکے تھے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ کس بدنصیب کی ہے۔" شامل خان نے جواب دیا اور فوراً ہی اس موضوع کی طرف آیا جو اسے اضطراب میں مبتلا کر رہا تھا۔
"تم جان ہی گئے ہو گے تمہاری تلاش میں کچھ لوگ آج قبیلے میں آئے تھے۔" اس نے تمہید باندھی۔
"جانتا ہوں بلکہ اس حوالے سے سردار خوشحال کا غصہ بھی جھیل چکا ہوں۔"
"ذیشان خان اور اس کا بڑا بھائی سردار طورا بے حد خطرناک اور بااثر لوگ ہیں۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کا قبائلی علاقہ جات کے چند خطرناک ترین افراد سے گٹھ جوڑ بھی ہے۔ اس لیے سردار خوشحال کا پریشان ہونا فطری سی بات ہے۔ اگر ان لوگوں کو ذرا بھی بھنک پڑ گئی کہ ان کے مفروروں کو ہمارے قبیلے نے پناہ دی ہے تو ہمارے لیے زمین تنگ ہو جائے گی۔ اس لیے سردار خوشحال کی طرف سے کوئی زیادتی ہوئی ہے تو اس کے لیے میں معافی مانگتا ہوں۔"
میں نے اس کے ہاتھ تھامے۔ "ایسا تو کچھ بھی نہیں ہوا لالے کی جان! بس جلد سے جلد تم لوگوں کی جان مجھ سے چھوٹ جائے۔ میرے ساتھ بچے نہ ہوتے تو میں تمہیں اس آزمائش میں نہ ڈالتا۔ اس کے لیے میں شرمندہ ہوں تم سے۔"
"کیسی بات کرتے ہو یارا!" اس نے قدرے خفگی سے کہا۔ "میرا جینا مرنا بھی اب تمہارے ساتھ ہے۔ چاند راتیں آ جائیں میں اس بات کا اعلان بھی کروں گا۔"
میں نے اس کے ہاتھوں کو اور مضبوطی سے دبایا۔ "مجھ سے زیادہ اپنے قبیلے کی فکر کرو۔ یہاں کے لوگ تم سے محبت کرتے ہیں۔ تمہیں "بوار کھوالا" یونہی نہیں کہتے۔ ان کی امیدوں پر تم نے پورا بھی اترنا ہے۔" اس بات کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس جذباتی

قبائلی کے چہرے پر چمکتی جذباتیت قدرے مدہم پڑ گئی۔ چند لمحے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہا پھر بولا تو اس کی آواز بے حد مدہم تھی۔

"لالے اگر تمہاری کہانی میں کوئی جھول ہے تو اپنے بھائی کو بتادے۔ میں بچوں سمیت تمہیں یہاں سے نکال سکتا ہوں۔ دوسری صورت میں سردار باندھ کر تمہیں ذیشان خان کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔"

"بے فکر رہو ایسی نوبت نہیں آئے گی۔"

میرے لہجے نے اسے حوصلہ دیا۔ وہ مسکرایا اور ماں کو کچھ کھانے کے لیے لانے کے لیے کہا۔

باہر بارش تھم چکی تھی۔ تیز ہوا بادلوں کو اڑا کر لے گئی تھی موسم کا جائزہ لے کر شامل خان باہر نکلنے کے لیے پر تولنے لگا۔ "آؤ میں ایک اور عاشق سے ملواؤں تمہیں۔"

"پہلے کتنے عاشقوں سے ملوا چکے ہو؟" میں نے بھی خوشگوار انداز میں کہا۔

"بھول گئے دیوانے ہاشم کو۔"

سینے کی گہرائیوں میں پھر ایک آہ نے جنم لیا۔ اس دیوانے کا درد مجھے مارنے لگا۔ کاش میں کچھ کر سکتا اس کے لیے۔ شامل نے رائفل کندھے سے لٹکائی تو میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ باہر دھوپ نکلی ہوئی تھی مگر تیز ٹھنڈی ہوا نے اس کا اثر زائل کر دیا۔ آسمان پر اڑتی پرندوں کی ایک ٹولی کو دیکھ کر شامل خان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"لالے کی جان! روس سے ہجرتی پرندوں کی آمد شروع ہو گئی ہے۔ آج کل میں تمہیں مرغابی اور جل فیری (ایک بے حد خوبصورت اور لذیذ گوشت والا پرندہ) کھلائیں گے۔"

مجھ میں جہاں اور بہت سی تبدیلیاں واقع ہوئی تھیں وہیں ان ہجرتی پرندوں کے بے دریغ شکار سے اکتاہٹ بھی تھی۔ برف زاروں سے گرم پانی اور خوراک کی تلاش میں اپنی زمینوں پر انہیں خوش آمدید کہنے کی بجائے الٹا بے دریغ شکار مجھے کسی صورت قبول نہیں تھا مگر میں اپنا فلسفہ کسی اور پر بھی نہیں ٹھونس سکتا تھا۔ ان قبائلی لوگوں کا انحصار بھی تو شکار پر تھا۔ میں نے گفتگو کا رخ کسی اور جانب موڑا۔ "اس دوسرے عاشق کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟"

"اس بیچارے عاشق کو اپنی محبوبہ کے حصول کے لیے باقاعدہ قبیلے کے ایک بہترین لڑاکے کو بزور بازو شکست دینا ہوگی، جو اس کے لیے ناممکن حد تک مشکل ہے۔"

مجھے دلچسپی ہوئی۔ قبائلی رسم ورواج کے متعلق بہت کچھ سنا اور دیکھا تھا۔ یہ بھی کوئی ایسا ہی معاملہ لگتا تھا۔

میری دلچسپی محسوس کر کے شامل نے مزید تفصیل بتائی۔ "قبیلے کا ایک غریب اور یتیم نوجوان ہے ثابت، اس کی پرورش اس کے چچا نے کی ہے۔ چند ماہ پہلے چچا نے کسی بات پر ناراض ہو کر اسے بے دخل کر دیا ہے۔ آج کل سردار خوشحال کی بھیڑیں چرا کر اپنا پیٹ پال رہا ہے۔

اسی چچا کی ایک بیٹی جو اس کے ساتھ ہی پل کر بڑی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ ثابت کا "چھپن چھپائی" چل رہا ہے۔ اب صاحب حیثیت چچا کسی صورت یتیم بھتیجے کے سر پر ہاتھ رکھنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ دونوں کی منگنی بھی ہو چکی ہے مگر چچا نے وہ بھی توڑ دی ہے۔"

"اس میں زور بازو سے شکست دینے والی بات کیا ہے؟"

"اسی طرف آ رہا ہوں یارا!" شامل خان نے

کہا۔ "پاوندوں کے قبیلوں میں ایک رسم ہوتی ہے "آموخا" اس کے مطابق قبیلے کا کوئی بھی شخص کسی کی منگیتر کے حصول کے لیے اسے چیلنج کرسکتا ہے۔ چیلنج قبول نہ کرنا بے حد بے عزتی سمجھا جاتا ہے اگر چیلنج قبول کرلیا جائے تو پھر آنے والی چاند کی پندرہ تاریخ کو سارے قبیلے کے سامنے چیلنج دینے اور قبول کرنے والے کے درمیان کھلا مقابلہ ہوتا ہے اگر چیلنج دینے والا جیت جائے تو ہارنے والے کی منگیتر اس سے منسوب ہوجاتی ہے اور اگر چیلنج قبول کرنے والا جیت جائے تو ہارنے والے سے جو دل چاہے طلب کرسکتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے ثابت کو کسی نے چیلنج کردیا ہے۔"

"ٹھیک سمجھے تم۔"

"مگر منگیتر اب "سابق" ہے اس کا چچا ٹانگ بھی تو اڑا سکتا ہے۔" میں نے خیال آرائی کی۔

"قبیلے میں جب تک دوسری جگہ لڑکی کی شادی نہ ہوجائے اس وقت تک وہ رشتہ ٹوٹنے کے باوجود رسمی طور پر پہلے منگیتر سے ہی منسوب رہتا ہے اور قبائلی رسم ورواج میں ثابت کا چاچا تو کیا چاچا کا باپ بھی ٹانگ نہیں اڑا سکتا۔"

اس کے انداز پر میں بے ساختہ ہنس پڑا۔

"اور چچا کی ٹانگ اڑانے کی ضرورت بھی نہیں ہے بلکہ وہ چاہتا ہے گل دانہ کی شادی چیلنج کرنے والے سے ہی ہوجائے۔ شاید تم نے چیلنج کرنے والے کو دیکھا بھی ہو۔"

میری سوالیہ نظروں کا مفہوم پاکر وہ بولا۔ "سردار خوشحال کا سالا ہے سردار کے آس پاس ہی ہوتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور بھینسے کی مانند مضبوط ہے۔"

جھماکا سا ہوا اور گردن کے اوپری حصے میں ٹیس سی جاگ اٹھی۔ سردار کے خیمے میں رائفل سے زور دار ٹہوکا اور پھر دو ہنٹر مارنے والا پاؤنڈ یاد آیا اس نے تھوڑا سا قرض چڑھا دیا تھا کمالے جٹ پر اور میں قرض رکھنے کا قائل نہیں تھا۔

شامل خان نے ایک دو اور نشانیاں بتائیں تو مجھے یقین ہو گیا کہ مجھ پر 'قرض' چڑھانے والا اور 'غریب عاشق' ثابت کو چیلنج کرنے والا ایک ہی شخص تھا۔ شامل نے اس کا نام دارا بتایا تھا۔

ایک الجھن محسوس کر کے میں نے پوچھا۔ "جب لڑکی کا باپ خود دارا کو داماد بنانے کا خواہش مند ہے تو پھر دارا کو ثابت کو چیلنج کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ سیدھے طریقے سے بارات لے کر پہنچ جاتا۔"

شامل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "گل دانہ کے حوالے سے کوئی سال بھر پہلے دارا اور ثابت کے درمیان اچھی خاصی تلخ کلامی ہوئی تھی جس کی رنجش دارا کے دل میں پل رہی ہے پہلے تو وہ کچھ نہیں کر سکا مگر اب حالات مختلف ہیں۔ ثابت کے سر پر اس کے چاچا کا ہاتھ نہیں ہے بلکہ میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ دارا کو تم چیلنج کے حوالے سے ثابت کے چچا کی مکمل آشیرواد حاصل ہے۔"

ساری کہانی بخوبی میری سمجھ میں آ گئی تھی اور دل ثابت کے لیے کچھ کرنے کو مچل اٹھا تھا۔

ہم جھیل کنارے پہنچے۔ یہاں پہاڑی سے ٹکرا کر ہوا نیچے گرتی تھی اور فراٹے بھرتے ہوئے گزر جاتی تھی۔ یہاں نوجوانوں کی ایک ٹولی پہلے سے موجود تھی۔ انہوں نے اپنے قبیلے کے سردار کا استقبال کیا۔ میں ان کی خصوصی دلچسپی کا مرکز تھا۔ میں نے ایک متناسب نقوش والے دبلے پتلے طویل قامت نوجوان کو دیکھا، بجھی آنکھیں اور زندگی کی رمق سے عاری چہرہ دل نے کہا یہی ثابت ہے۔

شامل خان نے تعارف کروایا تو میرا اندازہ صحیح ثابت ہوا۔ شامل نے نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "شاوا...... تم اپنا کام شروع کرو۔ مہمان تمہاری کارکردگی ہی دیکھنے آیا ہے۔" وہ مجھے لے کر ایک مسطح پتھر کی طرف بڑھا۔ ایک نوجوان نے جلدی سے بھیگے ہوئے پتھر پر ایک اونی کمبل ڈال دیا۔ ہم اس کمبل پر بیٹھ گئے۔

شامل خان نے میری طرف جھکتے ہوئے کہا۔ "ثابت کے ساتھ اس کے دوست ہیں۔ یہ روزانہ اسی وقت یہاں کسرت کرتے ہیں اور اپنے دوست کو دست بدست لڑائی کی تیاری بھی کرواتے ہیں۔"

دیکھتے ہی دیکھتے نوجوانوں نے اپنی صدریاں اتاریں اور وارم اپ ہونے کے لیے دوڑ پڑے۔ پہاڑی کی نصف بلندی کا چکر کاٹ کر واپس آئے تو ہانپے ہوئے تھے۔ یہ کل چھ لڑکے تھے۔

شامل خان کے کہنے پر ثابت اور ایک اس کا ہم عمر دہرے بدن کا لڑکا پتھر کے سامنے آ گئے اور آپس میں دست و گریباں ہو گئے۔ دہرے بدن کے لڑکے نے تیزی سے جھکائی دی ثابت ٹانگیں بچانے کو جھکا تو دوسرے نوجوان نے بڑی پھرتی سے اسے کمر پر لاد کر زمین بوس کر دیا۔ ثابت نے اٹھنے میں بھی تاخیر کی۔ دوسرے نوجوان نے اسے چھاپ لیا اور کمر کے گرد ٹانگیں کس کر کندھوں کے نیچے سے بازو گزارے اور گردن کے پیچھے باندھ کر بے بس کر دیا۔

شامل کے اشارے پر نوجوان ثابت کو چھوڑ کر علیحدہ ہو گیا۔ ثابت کھڑا ہوا تو اس کے چہرے پر اس ذلت آمیز شکست کا ذرا سا شائبہ بھی نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا اسے ہار جیت سمیت کسی چیز سے دلچسپی

نہیں رہی۔ میں نے تولنے والی نظروں سے ثابت کو دیکھا' وہ چوڑی ہڈی کا کڑیل نوجوان تھا۔ وارم اپ ہونے کے بعد اس کا سانس بھی زیادہ نہیں پھولا تھا۔

میرا اندازہ تھا کہ وہ پہلے ہی شکست تسلیم کر چکا ہے۔ اگر شکست کا خوف وہ دل سے نکال دے اور پوری توانائی اور جذبے سے دارا سے لڑے تو اسے ٹف ٹائم دے سکتا ہے میرا اپنا تجربہ تھا کہ لڑنے بھڑنے کے فن میں تربیت سے زیادہ اندرونی تپش اور لڑمرنے کا جذبہ کام آتا ہے۔ اندر کوئی ''آگ'' روشن ہو تو طاقتور سے طاقتور حریف بھی بونا نظر آتا ہے۔

ثابت کے اندر عشق کی آگ تو تھی مگر بجھ رہی تھی۔ بجھتے' انگاروں کو ہوا دے کر دوبارہ سے شعلوں میں تبدیل کیا جا سکتا تھا۔

میں نے شامل سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''کیا میں اس نوجوان کی تربیت کر سکتا ہوں؟''

''خوشی سے'' شامل نے کہا۔ ''مجھے خود اس سے ہمدردی ہے مگر میرے منصب کا تقاضا غیر جانبداری ہے۔ اس لیے میرے جانے کے بعد تم یہ کام شروع کر سکتے ہو۔''

میں نے اشارے سے ثابت کو قریب بلایا۔ وہ جھجکتا ہوا قریب آ گیا۔ ''تم پشتو سمجھتے ہو؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''میری ماں پشتون قبیلے سے ہے۔''

شامل خان نے اٹھنے کے لیے پر تولے ''ٹھیک ہے لالے' تم یہاں رہو۔ مجھے کچھ ضروری کام دیکھنے ہیں۔'' شامل خان کے جانے کے بعد میں نے ثابت کو اپنے پہلو میں بٹھا لیا دیگر لڑکوں کی تمام تر دلچسپی ہماری طرف تھی۔ میری ترجمانی کرتے ہوئے ثابت نے ان لڑکوں کو اپنی روز مرہ کسرت وغیرہ کرنے کے لیے کہا۔ لڑکے مصروف ہوئے تو میں نے لاتعلق سے بیٹھے ثابت سے کہا۔ ''تمہاری ساری کہانی سے میں واقف ہوں۔ مجھے ہمدردی ہے تم سے' چاہو تو میں مدد کر سکتا ہوں تمہاری۔''

''معزز مہمان کی پیش کش کا شکریہ مگر مجھے کسی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔''

''گل دانہ کو اتنی آسانی سے کسی دوسرے کی سیج سجاتے دیکھ سکو گے؟'' میں نے اس کی دکھتی رگ دبائی۔ جس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ''مر تو نہیں جاؤں گا۔''

''مگر مر...... مر کے جیو گے۔ میں تو سمجھتا ہوں قدرت نے گل دانہ کے حصول کے ساتھ ساتھ اپنے حالات سدھارنے کا بھی ایک موقع دیا ہے۔''

اس نے الجھی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا۔

میں نے اس کے کندھے پر بازو پھیلایا۔ ''دارا کو شکست دے کر تم کچھ بھی اس سے طلب کر سکتے ہو۔ مثلاً اس کے سارے جانور' پھر تو تمہارے چچا کو بھی بیٹی کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دینے پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔'' اس کے چہرے کے نقوش میں تلخی اتر آئی۔ ''آپ نے دارا کو دیکھا ہے؟ اس کے گینڈے جیسے جسم میں سے میرے جیسے تین نکل سکتے ہیں۔ وہ مانا ہوا لڑاکا ہے۔ پورے قبیلے میں اس جیسے زور آور کم ہی ہیں۔ کم از کم چھ جسمانی مقابلوں میں' میں اسے فاتح دیکھ چکا ہوں۔ پچھلے دو سال سے وہ ناقابل شکست ہے۔ یہ صرف اور صرف دارا اور چاچا کی مجھے ذلیل کرنے کی سازش ہے...... ورنہ میرا اور دارا کا کوئی مقابلہ ہے۔ چاچا چاہتا ہے میں خود ہی

ذلیل ہونے کے بعد کسی طرف منہ کر جاؤں۔"
اس نے دل کی بھڑاس نکالی۔

میرا یہ اندازہ درست نکلا تھا کہ وہ مقابلے سے پہلے ہی ہار مان چکا تھا۔

"چاچا یکدم تمہارا اتنا مخالف کیوں ہو گیا ہے؟ حالانکہ تمہاری پرورش بھی اسی نے کی ہے؟"

"لالچ......" ثابت نے نفرت سے کہا۔ "دارا کی نظروں میں گل دانہ کو دیکھ کر جو چمک ابھری ہے۔ چاچا اس کے دام کھرے کرنا چاہتا ہے۔ دارا کے پاس ہزاروں بھیڑیں اور چند بہترین شکاری رائفلیں ہیں جنہوں نے چاچا کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ دارا کے ساتھ معاملات طے ہوتے ہی سوچی سمجھی سازش کے تحت چاچا نے مجھ سے تعلقات خراب کیے ہیں۔"

"یعنی تمہارے چاچا کو صرف بھیڑوں اور رائفلوں سے غرض ہے۔ بیٹی کی خوشی مطلوب نہیں ہے۔" میں نے پرخیال انداز میں کہا۔ پھر ایک خیال آنے پر پوچھا۔ "گل دانہ کے جذبات کیا ہیں؟ میرا مطلب ہے دوسری طرف بھی جذبات کی شدت تمہارے جیسی ہی ہے؟"

ثابت کے چہرے پر دوطرفہ محبت خمار بن کر چمکی۔ "ممکن ہے ہم دونوں کسی دن اکٹھے ہی کسی کھائی میں چھلانگ لگا دیں۔"

"بہت جلدی ہار مان لی ہے تم نے تو یارا! تمہارے جیسے جوان تو پہاڑوں کا سینہ چیر کر راستہ بنا لیتے ہیں۔"

"کچھ کر سکتا تو ضرور کرتا، محض خواب دیکھنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ یہ زمینی حقیقت ہے کہ میں دارا کو محض جسمانی طاقت سے زیر نہیں کر سکتا۔"

"تمہارے نزدیک جسمانی ڈیل ڈول اور جسامت ہی مقابلہ جیتنے کا پیمانہ ہے تو ذرا مجھے دیکھ کر بتاؤ کہ میں دارا کا مقابلہ کر سکتا ہوں؟"

اس نے تولنے والی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "آپ خاصے تگڑے ہیں مگر دارا کو جسمانی مقابلے میں شکست نہیں دے سکتے۔" وہ کچھ زیادہ ہی دارا سے متاثر نظر آتا تھا۔

"اچھا یہ بتاؤ تم چھ کے چھ دوست مل کر تو دارا کو شکست دے سکتے ہو؟"

وہ چند لمحے سوچ کر بولا۔ "ہاں، یہ ممکن ہے۔"

میں اچھل کر پتھر سے نیچے اترا۔ "آؤ، تم سب لوگ مل کر مجھ سے لڑو، مجھے یقین ہے کہ تم سب مل کر بھی مجھے گرا نہیں سکتے۔"

میرا انداز دیکھ کر کسرت میں مشغول لڑکے بھی ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ میری تمام تر کوشش کے باوجود وہ لڑکے کسی بھی صورت مجھ سے لڑنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔

ثابت کا کہنا تھا کہ چونکہ قبیلے میں میری حیثیت "معزز مہمان" کی ہے اس لیے سردار یا پھر لال شاہ (شامل خان) کی اجازت کے بغیر...... میری خواہش کے باوجود مجھ سے نہیں لڑ سکتے۔

تھک ہار کر میں نے دوبارہ اپنی پتھریلی نشست سنبھال لی۔ اپنی تمام تر کوشش کے باوجود میں ثابت میں وہ امنگ، جذبہ یا پھر آگ پیدا نہیں کر سکا جو اسے دارا کو شکست دے کر گل دانہ کے حصول پر اکساتی۔

کچھ دیر بعد میں واپس خیمے میں لوٹ آیا۔ رات کو میں پھر شامل خان کے ساتھ پہاڑی پر موجود تھا۔ آج ہمارے ساتھ شامل کے دستے کا ایک اور نوجوان بھی تھا۔ یہ رضاکارانہ طور پر ہمارے ساتھ شامل ہوا تھا۔

پہلے کے مقابلے میں آج ہم زیادہ چوکنا تھے۔

آسمان بادلوں سے بالکل صاف ہو چکا تھا اور کروڑہا ستارے اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہے تھے۔ سرد ہوا کے سبب ہم نے چہرے بھی اونی پگڑیوں میں لپیٹ لیے تھے۔

شامل خان کچھ سست سا تھا۔ وہ حرارت محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اسے ساتھ آنے سے منع بھی کیا تھا مگر وہ سخت جان قبائلی اس معمولی حرارت کو کہاں خاطر میں لانے والا تھا۔

ہم اپنی پہلے والی پناہ گاہ میں تھے۔ ہمارے ساتھ آنے والا رضا کار شخص چند فٹ کے فاصلے پر ایک پتھر پر بیٹھا گرد و نواح کا جائزہ لے رہا تھا۔ گاہے بگاہے وہ ہماری طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں اس کی آنکھوں میں بد ارواح کا خوف کروٹیں لیتا نظر آ جاتا تھا۔ شامل خان نے میری ران پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''لالے کی جان! تمہارے چرچے تو پورے قبیلے میں ہو رہے ہیں۔''

''کیوں......؟'' میں نے انجان بن کر پوچھا۔

''تم نے قبیلے کے چھ کڑیل لڑکوں کو مقابلے کے لیے للکارا ہے اور ساتھ یہ یقین کہ وہ سب مل کر بھی تمہیں گرا نہیں سکتے' زیادہ تر لوگ تمہیں بڑبولا سمجھ رہے ہیں۔''

''صبح ہی وہ لوگ یہ دوستانہ مقابلہ کروا کر دیکھ لیں۔ وہ تو لڑکوں کو تمہاری اجازت درکار تھی ورنہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو چکا ہوتا۔''

شامل خان نے تولنے والی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''بے شک تم کمانڈو ٹائپ کی چیز ہو مگر چھ کڑیل جوان اتنے گئے گزرے بھی نہیں کہ مل کر بھی تمہیں نہ گرا سکیں۔ دو' تین کا بولو تو مان بھی سکتے ہیں۔''

''صبح اجازت دے کر دیکھ لو!''

وہ چند لمحے مجھے دیکھتا رہا پھر گہرا سانس لے کر بولا۔ ''ٹھیک ہے' تم اتنے ہی پر یقین ہو تو صبح دیکھ لیتے ہیں۔'' میں نے کندھے اچکا دیے۔

چند لمحے بعد شامل خان نے کہا۔ ''تمہارا چھ جوانوں سے بیک وقت لڑنے کا دعویٰ اور ثابت کو لڑنے کی تربیت دینے کی پیش کش دارا تک پہنچ گئی ہے۔ وہ بڑی خار کھائے بیٹھا ہے تم پر۔''

میں دھیمے سے مسکرایا۔ ''اچھی بات ہے خون جلائے گا تو ممکن ہے اس کی کچھ چربی ہی کم ہو جائے۔'' شامل خان ہنس پڑا۔

میں نے کہا۔ ''لالے' کیا یہ ممکن ہے کہ ثابت کی طرف سے میں چیلنج قبول کر لوں دارا کا مقابلہ کروں؟ اس سے دو' دو ہاتھ کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔''

شامل خان نے نفی میں سر ہلایا۔ ''بلاشبہ بعض صورتوں میں یہ ممکن تو ہے مگر اس کے لیے ثابت کا خونی رشتے دار ہونا ضروری ہے اور تمہارے لیے تو یہ ناممکن ہے' تمہارا تعلق باہر سے ہے۔'' رات خیریت سے گزری مگر آخری پہر بادلوں کے پرے دوبارہ سے جمع ہونے لگے اور سورج نکلنے سے پہلے ہی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔

بارش کے سبب چھ لڑکوں سے مقابلے کا پروگرام بھی دھرا رہ گیا اور شامل خان کو بھی اچھے خاصے بخار نے آ گھیرا تھا۔ میرا سارا دن خیمے میں ہی گزرا۔

شام سے کچھ پہلے بارش کا زور ٹوٹا۔ رات کو پہاڑی پر پہرے کے وقت شامل خان نے پر تولے مگر میں نے اس کی ایک نہیں چلنے دی اور اسے دوائی دے کر زبردستی سونے پر مجبور کر دیا۔ پہاڑی پر آج میرے ساتھ کل والا نوجوان اور ثابت بھی تھا۔ آسمان ہنوز بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور ہر طرف گہری

تاریکی کا راج تھا۔ گاہے بگاہے دور بجلی چمکتی تھی اور پل بھر کو ہر چیز کو روشن کر جاتی تھی۔ میں جانتا تھا ایسی تاریک راتیں منفی سرگرمیوں کے لیے زبردست معاون ثابت ہوتی ہیں۔ اس لیے آج ضرورت سے زیادہ چوکنا رہنے کی ضرورت تھی۔

میں نے ثابت اور دوسرے نوجوان کو ساتھ رکھا اور مختلف سمتوں میں مسلسل نگرانی رکھی۔ ٹارچ کے ذریعے ملنے والے دوسری پہرے دار پارٹیوں کے سگنل بھی سب اچھا ہے کی رپورٹ دیتے رہے۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ کل والے نوجوان کا اعتماد بڑھا تھا۔ کل کے مقابلے میں وہ خوفزدہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

ثابت آہستہ آہستہ مجھ پر کھلنے لگا تھا۔ چھوٹی چھوٹی چور ملاقاتیں لمس کا لمحاتی جادو' گل دانہ کی کھنکتی ہنسی...... بہت سی خوشگوار یادیں تھیں اس کے پاس۔ اس کی باتوں سے پیار کی اس شدت کا مجھے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا' جو اس کے اور گل دانہ کے درمیان تھی۔

وہ ساری رات ہم نے آنکھوں میں کاٹی۔ کسی بھی طرح کا کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ دو' تین دفعہ ہلکی بوندا باندی ضرور ہوئی تھی۔

سورج طلوع ہو چکا تھا۔ بادلوں کی وجہ سے اس کی پوری روشنی زمین تک پہنچنے سے قاصر تھی مگر ملگجا سا اجالا ضرور پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ ہم لوگوں نے واپسی کا قصد کیا۔

ابھی ہم ڈھلوان پر ہی تھے کہ ایک چٹان کے پیچھے سے پانچ افراد اچانک ہی نکل کر ہم پر پل پڑے۔ دھکا لگنے کے سبب میں گرتے گرتے بچا۔ میں سنبھلا تو چار افراد میرے سامنے کھڑے تھے۔ بظاہر وہ خالی ہاتھ تھے' پانچویں نے اپنی رائفل سے ثابت اور دوسرے نوجوان کو کور کر رکھا تھا۔ ان دونوں کے چہرے دھواں ہو گئے تھے۔

میرے وجود میں سنسنی کی بلند لہر اٹھی۔ واضح طور پر وہ چاروں مجھ سے دست بدست مقابلہ کرنا چاہ رہے تھے۔ ان کے چہرے بے شک اونی نقابوں کے پیچھے پوشیدہ تھے مگر میں بخوبی جانتا تھا' وہ چاروں میرے چھ نوجوانوں سے بیک وقت پنجہ آزمائی کے دعوے کے سبب سامنے آئے تھے۔ میرا ہمزاد کمالا جٹ انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا۔ میرے پاس پسٹل کے علاوہ اپنا جاں نثار خنجر بھی تھا مگر میں دعوت مبارزت دینے والوں کو جواب انہی کے سکوں میں دینا چاہتا تھا۔ ایک قدم بڑھا کر میں ان چاروں کے مقابل آ گیا۔ ان میں قدرے طویل قامت شخص بڑی مشاقی سے مجھ پر جھپٹا۔ اس کے طوفانی گھونسوں سے خود کو بچاتے ہوئے میں نے اس کے گھٹنے پر ٹھوکر ماری۔ وہ بلبلاتا ہوا دہرا ہوا۔ اس کے سر پر مارنے کے لیے میں نے گھٹنے کو خم دیا مگر وہ گھٹنا میں نے دوہرے بدن کے اس پستہ قامت حملہ آور کے سینے پر مارا جو بگولے کی مانند مجھ سے آ ٹکرایا تھا۔

تیزی سے توازن درست کر کے میں نے باقی دو کو بھی آڑے ہاتھوں لیا۔ اگلے چند منٹ ان چاروں اور میرے درمیان شدید کشمکش ہوئی۔ میرے منہ میں خون کا ذائقہ گھل گیا تھا اور سینے پر ٹکر لگنے کے سبب ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ مدمقابل میں سے ایک ناک آؤٹ ہو چکا تھا۔ اس کے چہرے پر میرے سر کی زوردار ٹکر "دھائیں" سے لگی تھی۔ وہ الٹ کر گرا تھا اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے تکلیف زدہ آوازیں نکال رہا تھا۔ انگلیوں کے

زخموں سے بہتا خون اور اس کی تکلیف کی شدت سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اس کے ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ سینے پر ٹھوکر کھانے والے میں بھی پہلا سا دم خم نہیں تھا۔ میں اس میدان کا پرانا کھلاڑی تھا۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ لڑائی سے جی چرا رہا تھا۔

باقی دونوں پوری شدت سے مجھ سے بھڑے ہوئے تھے۔ جس نے میرے سینے پر پہلے ٹکر ماری تھی' اسے ٹکر مارنے میں خصوصی مہارت تھی۔ اس کی ایک اور ٹکر میری ٹھوڑی پر لگ چکی تھی جہاں سے خون بہہ نکلا تھا۔ اب بھی وہ اچھل اچھل کر میرے چہرے کو نشانہ بنانے کی کوشش میں تھا۔ چوتھے کی ایک گھومتی ہوئی ٹانگ سے بچنے کے لیے میں جھکا تو ٹکر اسپیشلسٹ نے ارنے بھینسے کی مانند دوڑ کر میرے پیٹ میں ٹکر ماری۔ میں اچھل کر ایک پتھر سے ٹکرایا اور ٹکراتے پل ہی پتھر سے "تھرو" لے کر اچھلا۔ میری جڑی ہوئی دونوں ٹانگیں پوری قوت سے طویل قامت حملہ آور کے سینے پر لگیں اور میں نے لڑھکیاں کھاتے ہوئے اسے ڈھلان سے گرتے دیکھا۔ اسی پل سپورٹس مین اسپرٹ جاتی رہی اور باقی دونوں حملہ آوروں نے اپنے لباسوں میں سے تیز دھار آلے نکال لیے۔

ایک کے سینے پر کیے وار سے میں نے بمشکل خود کو بچایا تو دوسرے کا خنجر پیٹ پر چمکا۔ میں نے بجلی کی مانند تڑپ کر پہلو بدلا مگر خنجر مجھے چھو گیا تھا۔ خنجر کی مخصوص تکلیف سے میں بخوبی آگاہ تھا اور متعدد دفعہ یہ تکلیف جھیل چکا تھا۔ شدید جلن اور درد......

اس کے خنجر والے ہاتھ پر میں نے دوسرے وار سے قبل ہاتھ ڈالا اور خود پر جھپٹتے دوسرے حملہ آور نے جس کا خنجر والا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا لمحاتی موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور میری ٹانگوں کے درمیان پاؤں مارا۔ بالکل آخری لمحے پر میں نے اس کا ارادہ بھانپ کر خود کو بچانے کی کوشش کی مگر اچٹتی ہوئی ضرب لگ ہی گئی تھی۔ مجھے لگا جیسے میرا سانس رک گیا ہے اور جسم کی ساری طاقت کسی نے نچوڑ لی تھی۔

حملہ آور کو خنجر چھڑانے میں لحظہ بھی نہیں لگا۔ برق کی مانند تڑپ کر خنجر میرے سینے کی طرف آیا۔ میں نے قوت ارادی کو آزمایا اور جسم و جاں کی تمام تر توانائی صرف کرتے ہوئے پشت کے بل گرا۔ خنجر میری گردن کو تقریباً چھوتا ہوا گزرا۔ میری ٹانگوں سے الجھ کر حملہ آور مجھ پر گرا۔ میں نے اس کے خنجر والے ہاتھ کی کلائی پر گرفت کی اور اس کے اوپر گر گیا۔

سینے میں مقید سانس آزاد ہوئی تو توانائی بھی قدرے لوٹتی محسوس ہوئی۔ حملہ آور کی انگارہ آنکھوں نے میرے وجود میں اس کے لیے شدید نفرت کو ہوا دی۔ اس نے میرے چہرے پر ٹکر مارنے کی کوشش کی تو میں نے چہرہ اٹھایا...... ٹکر میری گردن پر لگی۔ وہ خنجر والے ہاتھ کو چھڑانے کے لیے زور لگا رہا تھا مگر اب وہ اس سے دوگنا بھی زور لگاتا تو ہاتھ کو آزاد نہیں کروا سکتا تھا۔

اندھا دھند زور لگانے کے دوران اس کا چہرہ میرے مقابل آ گیا تھا۔ نقاب اتر چکا تھا مگر چہرہ میرے لیے اجنبی تھا۔ بے شک وہ "ٹکر اسپیشلسٹ" تھا مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے مد مقابل کما لاجٹ ہے' جس کی "ٹکر" بھی کم مشہور نہیں تھی۔ اس کا ایک ساتھی پہلے ہی اس ٹکر کا نشانہ بن چکا تھا۔ دھائیں کی زوردار آواز سے میرے سر کا

کونا اس کی انگارہ آنکھوں کے درمیان ناک پر لگا اور فضا اس کی کرب میں ڈوبی آواز سے تھرا اٹھی۔ دوسری ٹکر نے اس کے چہرے کا بھرتا بنا دیا۔ یہی وقت تھا جب فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔ میرے اردگرد چنگاریاں سی چھوٹ گئی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ ثابت اور دوسرا نوجوان، رائفل بردار حملہ آور سے بھڑے ہوئے تھے۔ ثابت کے ہاتھ رائفل کی نال پر جمے تھے اور وہ رائفل کا رخ میری جانب سے موڑنے کی کوشش کر رہا تھا بعد میں معلوم ہوا کہ رائفل بردار نے مجھے نشانہ بنانے کے لیے رائفل کا رخ موڑا تھا تو اس لمحاتی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ثابت نے دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے رائفل پر ہاتھ ڈال دیا تھا۔ جس کے سبب نشانہ خطا ہوا اور گولیاں میرے اردگرد زمین پر لگی تھیں۔

رائفل کی نال کا خطرناک رخ دیکھتے ہوئے میں نے فوراً ہی اپنے نیچے دبے حملہ آور کو چھوڑ دیا۔ پتھر سے ٹکرانے والا حملہ آور اٹھ رہا تھا۔ غالباً اس کا سر بھی پتھر سے ٹکرایا تھا جس کے سبب وہ بن پیے ہی ڈول رہا تھا۔ دوسری طرف ثابت رائفل کا رخ آسمان کی طرف کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ ایک دفعہ پھر حملہ آور کی انگلی ٹریگر پر دب گئی اور کئی گولیاں آسمان کی طرف پرواز کر گئیں۔

فائرنگ کی آوازوں نے یقیناً بستی والوں کو خبردار کر دیا ہوگا۔ حملہ آور راہ فرار اختیار کر رہے تھے۔ رائفل بردار نے اچانک ہی رائفل چھوڑ کر کندھے کی ضرب ثابت کے سینے پر ماری۔ ثابت رائفل سمیت دوسرے نوجوان سے جا ٹکرایا۔ دونوں زمین بوس ہوئے تو حملہ آور نے زقند بھری اور بھاگ کھڑا ہوا۔ پتھر سے ٹکرانے والا بھی بھاگ رہا تھا۔ میں نے دو طویل چھلانگیں لگائیں، ایک پتھر پر دونوں پاؤں جما کر اچھلا اور اس پر جا گرا۔ مغلظات بکتے ہوئے اس نے مجھے گھٹنوں کے زور پر اچھالنے کی کوشش کی، اس میں وہ کامیاب بھی ہوا مگر اس کی چوڑی کلائی میرے ہاتھ میں آ گئی۔ اس نے زور مار کر کلائی چھڑانے کی کوشش کی مگر یہ اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ زمین سے اٹھتے ہوئے میں نے اسے اپنی طرف کھینچا۔ تصادم سے ایک لحظ پہلے میں نے اس کی کلائی چھوڑ دی اور کندھے پر بازو کی زوردار ضرب لگائی۔ یہ طاقت سے زیادہ ٹائمنگ کا کھیل تھا۔ جس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ وہ الٹ کر پشت کے بل گرا۔ اسی وقت بہت سے دوڑتے قدموں کی چاپیں سنائی دیں۔ باقی حملہ آور فرار ہو چکے تھے مگر میرے قدموں میں کراہتے حملہ آور کے پاس ایسا کوئی موقع میسر نہیں تھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو سر پر لگنے والی میری کہنی کی ضرب نے اسے دوبارہ لمبا لٹا دیا۔ میں نے اپنے زخم کا جائزہ لیا۔ خنجر نے محض کھال پر چرکا لگایا تھا۔

❀ ❀ ❀
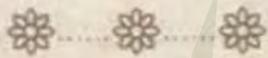
منظر سردار کے خیمے کے باہر کا تھا۔ بارش رک چکی تھی۔ بہت بڑے الاؤ کے گرد سردار اور قبیلے کے بڑے بیٹھے ہوئے تھے۔ باقی قبیلے کے بھی تقریباً سبھی مرد وہاں جمع تھے۔ مجھ پر حملہ کرنے والے باقی چار حملہ آور بھی پکڑے جا چکے تھے۔ ان میں سے دو کے چہروں پر میلی سی پٹیاں بندھی تھیں۔ تیسرے میں کھڑے ہونے کی سکت نہیں تھی وہ بیٹھا ہوا تھا اور کرب کی کیفیت اس کے چہرے سے نمایاں تھی۔ اس کی پسلیوں کو میری ضرب سے خاصا نقصان پہنچا تھا۔ چوتھے کا

رنگ لیموں کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ اور ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے قے بھی کی تھی۔ کہنی کی آخری ضرب میں نے اس کے سر پر لگا کر ناک آؤٹ کیا تھا۔ سلامت تھا تو صرف وہی حملہ آور جس نے رائفل سے ثابت وغیرہ کو کور کیا تھا اور پھر رائفل چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا تھا۔

ان پانچوں کے ہاتھ پشت پر مونج کی کھردری رسی سے بندھے ہوئے تھے اور نگاہوں میں میرے لیے کینہ اور شدید نفرت صاف نظر آرہی تھی۔

دارا بھی وہیں موجود تھا۔ اس کی جلتی ہوئی نظریں بار بار مجھ پر آٹھہرتی تھیں۔

پانچوں حملہ آوروں نے ڈھٹائی سے اپنا جرم قبول کرلیا تھا۔ ان پانچوں کا تعلق دارا سے ہی تھا۔ ان میں سے ایک اس کا دوست باقی نوکر تھے۔ ان کے بقول مجھ پر حملہ ان کا ذاتی فعل تھا۔ دارا سے اس کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ وجہ عناد انہوں نے یہ بتائی کہ میں نے ان کے دوست و آقا کے حریف کو لڑائی بھڑائی کی تربیت دینے کی پیش کش کے ساتھ بیک وقت چھ جوانوں سے لڑنے کا دعویٰ کیا تھا جسے ان کی ''غیرت'' برداشت نہیں کرسکی تھی۔

اس موقع پر بخار میں پھنکتا شامل خان تڑپ کر بولا تھا۔ ''پھر تم نے دیکھ لیا۔ مہمان نے اکیلے ہی تم چاروں کے نقشے بگاڑ دیئے ہیں۔ ابھی کوئی ''حسرت'' رہ گئی ہو تو ایک دو اور حمایتی ساتھ ملا کر دوبارہ لڑلو!'' یہ کہتے ہوئے شامل خان نے دارا کی طرف دیکھا تھا اور دارا کی آنکھوں میں دہکتے الاؤ فروزاں تر ہوگئے تھے اور چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت نمودار ہوئی تھی۔ واضح طور پر وہ شامل خان کا اشارہ سمجھ گیا تھا' وہ جیسے زہر کے گھونٹ بھر کر رہ گیا۔

وہاں موجود سبھی لوگوں کو بخوبی اندازہ تھا کہ مجھ پر حملہ دارا کی آشیرواد سے ہوا تھا۔ وہ نوکروں کے معاملے میں بے حد سخت گیر مشہور تھا اور یہ ممکن نہیں تھا کہ اس کی مرضی کے بغیر کوئی نوکر قبیلے کے معزز مہمان پر حملہ کردے۔ اس حوالے سے قبیلے کے قوانین بھی بے حد سخت تھے۔ سردار خوشحال اور بڑے سر جوڑے بیٹھے تھے۔ حملہ آوروں کے لیے سزا کا تعین کیا جارہا تھا' کچھ دیر بعد سردار نے کھڑے ہو کر سزا کا اعلان کرتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔

''جیسا کہ سارا قبیلہ جانتا تھا' قبیلے کے مہمان پر حملہ قتل اور زنا بالجبر سے بھی بڑا جرم ہے۔ حملہ آوروں نے اپنا جرم قبول بھی کرلیا ہے۔ دارا خان کے ان لوگوں کے ساتھ ملوث ہونے کا کوئی ثبوت بھی نہیں ملا اور خود حملہ آوروں نے اس بات سے انکار کیا ہے کہ دارا خان کی حمایت اور تائید پر انہوں نے یہ حملہ نہیں کیا ہے۔ اس لیے دارا خان کو اس معاملے سے علیحدہ تصور کیا جاتا ہے۔ یہ ان پانچوں کا ذاتی فعل ہے اور اس کی سزا بھی انہیں ملے گی۔''

سردار کی آواز میں ہولناکی در آئی تھی اور حملہ آوروں کے چہرے راکھ ہوگئے تھے۔

سردار نے مزید کہا۔ ''ان پانچوں نے جو جرم کیا ہے اس کی سزا ناف میں گولی یا پھر چودہ دن کی بھوک پیاس اور روزانہ سو درے ہیں۔ مجرم ان میں سے جو چاہیں سزا قبول کرسکتے ہیں۔'' حملہ آوروں میں سے ایک گھٹنوں کے بل گر گیا۔ میں ''ناف پر گولی'' کی قبائلی سزا سے بخوبی واقف تھا۔ مجرم نصف گھنٹے سے بھی زیادہ وقت میں تڑپ تڑپ کر اور اپنے خون میں لت پت ہو کر مرتا ہے۔ اسی طرح چودہ دن کی بھوک و پیاس اور روزانہ سو درے اور بھی بھیانک سزا تھی۔ صدیوں کی قبائلی تاریخ میں ایسے لوگ انگلیوں پر گنے

جا سکتے تھے جو یہ سزا جھیل کر موت کو شکست دینے میں کامیاب ہوئے تھے۔

میں پل بھر میں ایک فیصلے پر پہنچا اور اٹھ کر سردار خوشحال اور دیگر بڑوں کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ سب کی استفہامیہ نظریں مجھ پر جم گئی تھیں۔

"میں معزز سردار اور معزز بزرگوں سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔"

سردار نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اجازت دی۔ شامل خان کی کھوجتی ہوئی عقابی نظریں جیسے میرا ارادہ بھانپنا چاہتی تھیں۔

میں نے بلند آواز سے کہا۔ "میں معزز سردار اور پورے قبیلے کا احسان مند ہوں کہ انہوں نے نہ صرف مجھے پناہ دی' میرے دشمنوں سے بچایا بلکہ مہمان کا بلند درجہ بھی دیا۔ اس لیے میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے قبیلے کے پانچ گھرانے اپنے پیاروں سے محروم ہو جائیں۔ اس لیے میں خود پر حملہ کرنے والوں کو معاف کرتا ہوں اور معزز سردار سے بھی میری درخواست ہے کہ انہیں معاف کر دیا جائے۔"

چند لحظہ کے لیے پورے مجمع پر سکوت طاری ہو گیا۔ آواز تھی تو صرف فراٹے بھرتی ٹھنڈی یخ بستہ ہوا اور الاؤ میں چٹختی لکڑیوں کی...... پھر مجمع کی جانب سے خوشی کے تاثر سے بھرپور ملا جلا سا شور اور نعرہ تحسین بلند ہوا۔ سردار اور بڑوں کے چہرے پر تحسین اور نرم سی پھوار نظر آنے لگی۔ شامل خان کی آنکھیں بھی مسکرا اٹھی تھیں اور ان میں میرے لیے محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ دارا کے چہرے پر شرمندگی اور جھینپ نظر آ رہی تھی۔

سردار نے میری درخواست کو قبول کرتے ہوئے پانچوں حملہ آوروں کو معاف کر دیا۔ ان کے ہاتھ کھلے تو وہ میرے قدموں میں آ گرے۔ موت کو بالکل

جان لیجئے

☆ ہر شخص اپنے عمل اور کردار کا خود ذمے دار ہے۔ کوئی دوسرا ذمے داری نہیں اٹھا سکتا۔

☆ بدی' محبت قتل کر دینے والا زہر ہے اور اس کا نتیجہ بربادی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔

☆ انسان کے لئے جس طرح نیکیاں ضروری ہیں اسی طرح نیکیوں کی محبت بھی ضروری ہے۔

☆ ذرے کو آفتاب کی کرنیں ہی چمکا کر اجاگر کرتی ہیں ورنہ ریت کے ڈھیر میں اس کی کیا وقعت ہے۔

☆ خدا کے سوا کوئی چیز جو مشترکہ ملکیت ہو اس کے لئے کبھی کبھی جھگڑا کھڑا ہو جاتا ہے۔

☆ کچھ لوگ صرف دیکھنے کے لئے ہوتے ہیں۔ کچھ صرف گفتگو کے لئے اور صرف چند ایک لوگوں کے ساتھ آپ زندگی گزار سکتے ہیں۔

☆ میں نے ہر رشتے کو اعتماد کی نظر سے پرکھا اور پھر اس میں وقت نے جانے کیوں بے اعتباری بھر دی چکی ہے۔

سامنے پا کر انہیں دوبارہ سے زندگی کی نوید ملی تھی...... آنکھوں میں نمی لیے وہ بے حد نرم ہو گئے تھے۔ بالکل ننھے بچوں کی مانند۔

شامل خان آ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ "تو نے شامل خان کے ساتھ ساتھ آج پورے قبیلے کو بھی خرید لیا ہے لالے کی جان!" اس کی آواز خوشی سے بھیگی ہوئی تھی۔

قبیلے کے بہت سے افراد نے مجھے ڈھانپ لیا تھا۔ میں نے ایک بوڑھی عورت کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی نمی تھی اور چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ قریب آ کر اس نے دونوں ہاتھ میری طرف بڑھائے تو میں نے سر جھکا دیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں میرا سر تھام کر پیشانی چومی اور اپنے

گلے سے میلی سی چاندی کا زیور اتار کر میری کلائی سے باندھنے لگی۔ میں نے روکنے کی کوشش کی تو شامل خان نے مجھے اشارے سے منع کر دیا اور سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ”یہ تم پر حملہ کرنے والوں میں سے ایک کی ماں ہے۔ اسے اپنی خوشی پوری کرنے دو۔ تم نہیں جانتے اس خاندان پر تم نے کتنا بڑا احسان کیا ہے' اس کا ”نامراد بیٹا“ دو دن پہلے ہی باپ بنا ہے۔“

ایک رات جس کا اختتام بڑے خونچکاں انداز میں ہونا تھا...... بڑے خوشگوار انداز میں اختتام پذیر ہوئی تھی۔

اگلے دن میں ابھی خیمے میں ہی تھا۔ شامل کی طبیعت اب کچھ بہتر تھی۔ وہ میرے پاس ہی لیٹا ہوا تھا۔ جب ثابت مجھ سے ملنے کے لیے آ گیا۔ شامل نے اسے خیمے میں ہی بلا لیا۔

رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد اس نے میرے گھٹنے کو چھوتے ہوئے کہا۔ ”میں اور میرے دوست آپ سے دست بدست لڑائی کی تربیت لینا چاہتے ہیں۔ مجھے اپنی شاگردی میں قبول کر لیں۔“

شامل خان کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ محض ایک دن پہلے یہی نوجوان میری پیش کش قبول کرنے کو تیار نہیں تھا بلکہ اس کے نزدیک دارا بہت بڑا اور ناقابل شکست لڑاکا تھا اور میں اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ مگر ایک رات میں ہی سب کچھ بدل گیا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ میں چار ہٹے کٹے افراد کو بیک وقت نہ صرف ناک سے چنے چبوا دیے تھے بلکہ ان کے خنجروں کی ضربات سے بھی خود کو بچایا تھا۔ ان کے خیالات میں تبدیلی واقع ہو چکی تھی اور اس تبدیلی کی بہت مضبوط وجہ تھی۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”مجھے پہلے بھی تم سے ہمدردی تھی اور اب تو میں تمہارا احسان مند بھی ہو چکا ہوں۔ جس طرح تم نے دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھ پر نشانہ لگانے والے کی رائفل پر ہاتھ ڈالا وہ لائق تحسین ہے۔“

”وہ تو میرا فرض تھا۔“ اس نے سر جھکا کر کہا۔ ”آپ مہمان ہیں ہمارے' آپ کو کچھ ہو جاتا تو میں سردار اور لال شاہ کو کیا منہ دکھاتا۔“

ساتھ بیٹھے شامل خان نے اس کا کندھا تھپکا۔ میں نے کہا۔ ”تمہیں دست بدست لڑائی میں میں ماہر تو کر دوں گا مگر دارا کو ہرانے کا جذبہ تمہیں خود ہی بیدار کرنا ہو گا' سب سے پہلے یہ بات ذہن سے نکال دو کہ تم دارا کو شکست نہیں دے سکتے' تم شکست دے سکتے ہو اسے' اس کے چربیلے جسم میں طاقت تو بے شک ہے مگر وہ پھرتی نہیں جو تمہاری جوانی کا مقابلہ کر سکے۔“

میں کافی دیر تک اس کا ذہن بناتا رہا۔ اس کے بعد جھیل کنارے اسے اور اس کے دوستوں کو میں نے لڑائی بھڑائی کے چند آزمودہ گر بھی سکھائے۔ جہاں میں نے ثابت میں یہ خامی دیکھی تھی کہ وہ بڑھ کر حملہ نہیں کرتا وہاں یہ خوبی بھی تھی کہ اس کا دفاع خاصا مضبوط تھا۔ اس کے علاوہ اس کا اسٹیمنا بھی خاصا متاثر کن تھا۔

رات کو ہم پھر پہاڑی پر تھے۔ شامل کی طبیعت خاصی سنبھل گئی تھی اور وہ ضد کر کے ہمارے ساتھ ہو لیا تھا۔ دیوانہ ہاشم آج پھر اپنی زرینہ کو پکارتے ہوئے یک تارا بجا رہا تھا۔ ایک چٹان کے عقب میں چھپ کر ہم یک تارے کی مدھر تانیں سننے لگے۔

میں یک تارے کی مدھر مگر درد میں ڈوبی تانوں میں ڈوب ابھر رہا تھا کہ میں نے ایک بندر جیسے سیاہ ہیولے کو فضا میں تیرتے اور پھر دیوانے ہاشم پر جھپٹتے دیکھا۔

(باقی آئندہ ماہ)

❖

آخری مرحلہ

عبد القیوم شاد

وہ اپنے تئیں بہت چالاک اور ہوشیار شخص تھا کاروبار میں حریفوں کو زک پہنچانا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ پھر اچانک اس نے ایک انوکھا سودا کیا۔ اس ڈیل میں وہ خود کو فاتح سمجھ رہا تھا لیکن آخری مرحلے میں ساری بازی پلٹ گئی۔

مغرب سے درآمدہ ایک دلچسپ کہانی' دو کاروباری حریفوں کا انوکھا تنازع

فرینک نے اپنی بیس سالہ کاروباری زندگی میں کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کیا تھا وہ ایک پیدائشی کاروباری تھا اور ہر چیز کو کاروباری نقطہ نظر سے دیکھتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس عالم موجودات میں انسانی ضرورت کی ہر چیز موجود ہے اور صرف چیز ہی موجود نہیں حصول کے وسائل بھی موجود ہیں۔ انسان ہر چیز خرید سکتا ہے بشرطیکہ وہ اس کی قیمت ادا کرسکتا ہو لیکن جب ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ وہ کینسر کا مریض ہے اور زیادہ سے زیادہ دو سال اور زندہ رہے گا تو اس پر سکتہ طاری ہوگیا۔ اس کی حالت اس شخص کی ہوگئی جسے عدالت عالیہ نے سزائے موت کا حکم سنا دیا ہو۔

''شاید تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے ڈاکٹر۔'' اس نے کہا۔''میری عمر بہت لمبی ہے میں کم از کم پچاس سال اور جیوں گا۔''

''عام طور پر ہم مریضوں کو اس قسم کی بات نہیں بتاتے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''کیونکہ اس سے انہیں بجز مایوسی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا لیکن تمہارا کیس ذرا مختلف ہے تم ایک باہمت آدمی ہو۔ تمہارا دل مضبوط ہے اور تمہارے اندر صدمہ برداشت کرنے کی قوت موجود ہے۔''

''جس شخص کی زندگی کے صرف دو سال باقی رہ گئے ہوں اس کی قوت برداشت اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔'' اس کی خود اعتمادی واپس آ گئی۔''بہرحال میں اتنی جلدی شکست تسلیم کرنے والوں میں سے نہیں ہوں کیا علاج کی کوئی بھی صورت باقی نہیں رہی؟''

''تمہارے دونوں پھیپھڑے تقریباً ختم ہو چکے ہیں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''ان کا علاج ناممکن ہے البتہ ایک صورت ہوسکتی ہے۔''

''کون سی صورت؟''

''اگر تمہارے جسم میں نئے پھیپھڑے لگا دیے جائیں تو تم بچ سکتے ہو۔''

''تو پھر اس میں سوچنے والی کون سی بات ہے پرانے پھیپھڑے نکال کر پھینک دو اور نئے لگا دو۔ میں معاوضہ دینے کے لیے بالکل تیار ہوں۔''

ڈاکٹر نے مایوسی سے سر ہلایا۔''یہ اتنا بھی آسان کام نہیں جہاں تک پرانے پھیپھڑے نکالنے کا تعلق ہے وہ کسی بھی وقت نکالے جاسکتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ نئے کہاں سے آئیں گے۔ یہ کوئی اسپیئر پارٹ تو ہیں نہیں کہ بازار سے خرید لیے جائیں۔''

''شہر میں روزانہ متعدد آدمی مرتے ہیں کسی کے بھی نکال کر لگائے جاسکتے ہیں۔''

''پھیپھڑے صرف اسی شخص کے نکالے جاسکتے ہیں جس نے اپنی زندگی میں اس بات کی اجازت دے دی ہو یا اس کے ورثا اجازت دیں اور اس بات کا اختیار صرف اسٹیٹ اسپتالوں کو ہے کوئی پرائیویٹ

کلینک ایسا کرنے کا مجاز نہیں۔"

یہ سن کر فرینک کی گھبراہٹ دور ہوگئی۔ اس نے سوچا کہ اب فکر کی کوئی بات نہیں مسئلہ صرف نئے پھیپھڑے حاصل کرنے کا ہے اور اس میں ناکامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ زیادہ سے زیادہ معاوضہ ادا کرسکتا تھا۔ اگر کوئی صورت نہ بنی تو وہ پورا آدمی خرید کر اس کے پھیپھڑے اپنے جسم میں لگوالے گا اگلے روز وہ اسٹیٹ اسپتال کے سول سرجن سے ملا اور اپنا مسئلہ پیش کیا۔

سرجن نے مایوسی کے ساتھ سر ہلایا۔ "ہم فوری طور پر تمہارے لیے کچھ نہیں کرسکتے۔ اگر تم چاہو تو ویٹنگ لسٹ میں نام لکھوا سکتے ہو باری آنے پر تمہارا کام ہوجائے گا۔"

"کوئی بات نہیں۔" فرینک نے کہا۔ "میں کچھ روز انتظار کرسکتا ہوں اندازاً کتنے دن لگ جائیں گے؟"

"پانچ سال۔" سرجن نے اطمینان کے ساتھ جواب دیا۔ "بلکہ کچھ زیادہ ہی اس وقت دو ہزار مریض ویٹنگ لسٹ پر موجود ہیں۔"

"لیکن ڈاکٹر میں مرجاؤں گا میرے فیملی ڈاکٹر نے کہا ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ دو سال اور زندہ رہوں گا۔ میں زیادہ سے زیادہ معاوضہ ادا کرنے پر تیار ہوں میرا کیس فوری توجہ کا مستحق ہے۔"

"ہمارے پاس ہر کیس فوری توجہ کا مستحق ہے۔ ہم کسی کی حق تلفی نہیں کرسکتے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم لوگ شروع میں کیوں احتیاط نہیں کرتے اس رپورٹ کے مطابق تمہارے پھیپھڑے بکثرت سگریٹ نوشی کے باعث ختم ہوئے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن......!"

"لیکن، لیکن، لیکن۔" سرجن نے غصے سے کہا۔ "کیا تم نے سگریٹ کے پیکٹ پر لکھی ہوئی وارننگ کبھی نہیں پڑھی، ضرور پڑھی ہوگی لیکن اور لوگوں کی طرح تم نے بھی یہی سوچا ہوگا کہ یہ وارننگ تمہارے لیے نہیں ہے۔ تم خدا کے ساتھ ابدی زندگی کا معاہدہ کرکے دنیا میں آئے ہو۔ تمہیں صرف اپنی موت نظر آرہی ہے اس لیے پریشان ہو لیکن ہمارے پاس روزانہ تم جیسے مریض آتے ہیں ہمیں سبھی کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔"

فرینک چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔ "ڈاکٹر، فرض کرو میں پھیپھڑوں کا انتظام کرلیتا ہوں، کیا تم......"

"کیا مطلب؟" ڈاکٹر چیخا۔ "کیا تمہارے حواس ٹھیک کام کررہے ہیں وہ کون سی مارکیٹ ہے جہاں سے انسانی پھیپھڑے خریدے جاسکتے ہیں اب تم جا سکتے ہو ویٹنگ لسٹ میں نام لکھوانے کے بارے میں کیا خیال ہے۔"

"میں ویٹنگ لسٹ میں نام لکھوائے بغیر بھی مرسکتا ہوں۔"

☆......❀......☆

فرینک ایک پیدائشی کاروباری تھا۔ اس معاملے میں کوئی شخص اس کے سامنے کھڑا نہیں ہوسکتا تھا۔ ابتدا میں اس نے چھوٹے چھوٹے کاروباری حریفوں پر سبقت حاصل کی اور بالآخر بڑے حریفوں سے ٹکر لینی شروع کردی۔ وہ نہایت سائنٹیفک طریقے پر کام کرتا تھا۔ اس کے پاس دولت بھی تھی اور ذہانت بھی ان دو چیزوں کا بروقت استعمال ہی کامیابی کی ضمانت تھا۔ یعنی کب کون سی چیز خرید لینی چاہیے اور کب اسے فروخت کردینا چاہیے حال ہی میں اس نے اپنے سب سے بڑے کاروباری حریف جارگوز کو شکست دی تھی۔ بوڑھا جارگوز ایک کہنہ مشق کھلاڑی تھا۔ اس کا ایک اشارہ مارکیٹ میں بحران پیدا کرسکتا تھا بلکہ حقیقت میں مارکیٹ کے اتار چڑھاؤ کا اس کے مزاج سے گہرا تعلق تھا۔

کہا جاتا تھا کہ جارگوز کو ناراض کرکے کوئی شخص

مارکیٹ میں قدم نہیں جما سکتا۔ وہ چوبیس گھنٹے کے اندر جسے چاہتا دیوالیہ کر دیتا تھا۔ فرینک کئی مہینوں تک جارگوز کے طریقہ کار کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا پھر وہ اچانک میدان میں اتر آیا جارگوز کے وہم میں بھی نہیں تھا کہ فرینک جیسا معمولی کاروباری اس سے ٹکر لینے کی کوشش کر سکتا ہے۔ اس نے حسب معمول اپنے کاروباری حربے استعمال کیے مگر فرینک پہلے ہی ان کا بندوبست کر چکا تھا۔ اس ناکامی پر جارگوز سخت چراغ پا ہوا حالانکہ نقصان بہت معمولی ہوا تھا لیکن مسئلہ دولت کا نہیں وقار کا تھا۔

اگلے روز جارگوز نے اسے فون کیا اور اس کی کامیابی پر مبارکباد دی لیکن فرینک بخوبی جانتا تھا کہ اس مبارکباد میں درحقیقت طنز چھپا ہوا تھا۔

☆……❀……☆
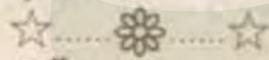
صورت حال تشویشناک ضرور تھی مگر مایوس کن نہیں تھی۔ اگلے دو ہفتے کے دوران وہ شہر کے بہترین اسپتالوں میں گیا اور چوٹی کے ڈاکٹروں کے سامنے اپنا مسئلہ پیش کیا لیکن کوئی بھی اس کی مدد نہ کر سکا۔

ایک روز وہ ساتویں منزل پر واقع اپنے دفتر سے نکل کر سیلف سروس لفٹ میں داخل ہوا تو اس کی نظر ایک درمیانے قد کے شخص پر پڑی جو پہلے ہی لفٹ میں موجود تھا۔ اس نے ہلکے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا اور چہرے مہرے سے مہذب انسان نظر آتا تھا۔ جب لفٹ کا دروازہ بند ہو گیا تو وہ فرینک کی طرف مڑا۔

''مسٹر فرینک۔'' اس نے کہا۔ ''میں تمہیں ایک ایسے شخص کا پتا بتا سکتا ہوں جو کئی لوگوں کے مسائل حل کر چکا ہے۔''

فرینک نے سر سے پیر تک اس شخص کا جائزہ لیا پھر بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں تمہیں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔''

''تمہارا خیال بالکل صحیح ہے یہ ہماری پہلی ملاقات ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ ملاقات خوش آئند مستقبل کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔ مجھے جان اینڈ رسن کہتے ہیں لیکن تمہارے لیے صرف جونی' میں ایس ایس او سے تعلق رکھتا ہوں۔''

''ایس ایس او۔'' فرینک ذہن پر زور ڈالتا ہوا بولا۔ ''یہ نام بھی پہلی مرتبہ سنا ہے کیا یہ کسی مل کی خفیہ پولیس کا نام ہے۔''

جونی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ ''ایس ایس اؤ اسپیشل سوشل آرگنائزیشن کا مخفف ہے۔''

''اور اس تنظیم کے اغراض و مقاصد؟'' فرینک نے کہا۔ ''اجنبی سا نام ہے کیا یہ کوئی خفیہ تنظیم ہے۔''

''اسے نیم خفیہ تنظیم کہا جا سکتا ہے یہ صاحب حیثیت لوگوں کے مسائل حل کرنے کے لیے قائم کی گئی ہے۔ کچھ مسائل ایسے ہوتے ہیں جنہیں جائز طریقے سے حل نہیں کیا جا سکتا حالانکہ مسائل جائز ہوتے ہیں اور فوری توجہ کے مستحق ہوتے ہیں ہماری تنظیم مناسب معاوضے پر ان مسائل کی ذمہ داری قبول کر لیتی ہے۔ ہمارے پاس ہر قسم کے ماہرین موجود ہیں۔ بعض اوقات ہمیں ایسے طریقے بھی اختیار کرنے پڑتے ہیں جنہیں کلی طور پر قانونی نہیں کہا جا سکتا۔''

فرینک کو اس کی باتوں میں دلچسپی پیدا ہوگئی۔ اس نے سوچا کہ وہ اس کا مسئلہ حل کر سکتا تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اس اجنبی کو اس کے مسئلے کے بارے میں کیسے پتا چلا۔ اس اثنا میں لفٹ گراؤنڈ فلور پر پہنچ گئی۔

''میں تمہاری تنظیم کے بارے میں مزید جاننا پسند کروں گا۔'' فرینک نے کہا۔ ''کیوں نہ کسی ریستوران میں بیٹھ کر بات کی جائے۔''

جونی نے اس کی تجویز کو پسند کیا۔ چند لمحوں بعد

دونوں ایک پرسکون ریستوران کے نیم تاریک گوشے میں بیٹھے ہوئے باتیں کررہے تھے۔

"ہماری تنظیم کے نمائندے ہر شعبہ ہائے زندگی میں موجود ہیں۔" جونی بتارہا تھا۔ "جب کوئی صاحب حیثیت شخص کسی لاینحل مسئلے سے دوچار ہوتا ہے تو ہمارا نمائندہ ہمیں مطلع کردیتا ہے۔"

"تو اس طرح تمہیں پتا چلا کہ مجھے نئے پھیپھڑوں کی ضرورت ہے۔" فرینک نے کہا اس کے چہرے سے اندرونی خوشی کا اظہار ہورہا تھا۔ جونی اسے فرشتہ رحمت لگ رہا تھا تاہم وہ اپنے جذبات کا اظہار کرنے میں احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ "معاوضے کی بات کرنے سے پہلے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تمہاری تنظیم نئے پھیپھڑوں کا انتظام کہاں سے کرے گی؟"

"ہم عام طور پر اپنے اندرونی معاملات کو زیر بحث لانا پسند نہیں کرتے۔" جونی نے کہا۔ "اس دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو صرف دوسروں کے لیے زندہ رہتے ہیں اور جیسا کہ میں بتاچکا ہوں کبھی کبھی ہمیں قانونی حدود سے تجاوز بھی کرنا پڑتا ہے بہرحال ہم ہر چیز کے لیے معقول رقم خرچ کرتے ہیں۔"

"میں تمہارے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ محض اپنا استعجاب دور کرنے کے لیے پوچھ لیا تھا۔ اب معاوضے کی بات ہوجائے۔"

"تمہارے کیس پر ہم ہر پہلو سے غور کرچکے ہیں۔" جونی نے کہا۔ "نئے پھیپھڑے لگانے کا معاوضہ ایک لاکھ ڈالر ہوگا اور اس میں سودے بازی کی کوئی گنجائش نہیں۔"

"ایک لاکھ ڈالر یہ تو بہت زیادہ ہیں۔"

"ایک انسانی جان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ کیا تم دو لاکھ کے عوض اپنا دل دینا پسند کروگے؟"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن.......!"

جونی ہاتھ اٹھاتا ہوا بولا۔ "اس معاملے پر کوئی بحث نہیں ہوگی۔ تم اطمینان سے سوچ سکتے ہو اگر ضرورت محسوس کرو تو اس نمبر پر فون کرلینا۔" اس نے جیب سے ایک کارڈ نکال کر میز پر رکھ دیا جس پر صرف ایک فون نمبر لکھا ہوا تھا۔ پھر وہ اپنی نشست سے اٹھا اور تیزی سے باہر چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی فرینک کو احساس ہوا کہ اس نے غلطی کی تھی زندگی بچانے کے لیے ایک لاکھ ڈالرز زیادہ بڑی رقم نہیں تھی اور وہ باآسانی اسے ادا کرسکتا تھا۔ اس نے اگلے روز جونی کو فون کرکے آمادگی کا اظہار کردیا۔

"تمہیں اپنے فیصلے پر ہرگز افسوس نہیں ہوگا مسٹر فرینک۔" جونی نے کہا۔ "اب ہماری ایک ملاقات اور ہوگی تاکہ تمہاری روانگی کے بارے میں تفصیلات طے کرلی جائیں۔"

اس فیصلے کے ٹھیک ساتویں روز فرینک میکسیکو کے ایک دشوار گزار پہاڑی علاقے میں سفر کررہا تھا۔ رات کا وقت تھا اور صاف آسمان پر پورا چاند چمک رہا تھا۔ سڑک تنگ اور ناہموار تھی۔ جگہ جگہ خطرناک موڑ تھے۔ کار کی رفتار بمشکل تیس پینتیس میل کے درمیان تھی۔

فرینک کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اسے آپریشن کے لیے اتنا لمبا چوڑا سفر کرنا پڑے گا۔ وہ کچھ خوفزدہ بھی تھا۔ اس کے ذہن میں گوناگوں خدشات سر اٹھارہے تھے۔ وہ سفر سفر آخرت بھی ثابت ہوسکتا تھا گو وہ مذہبی آدمی نہیں تھا مگر دل ہی دل میں اپنی سلامتی اور آپریشن کی کامیابی کے لیے دعا مانگ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے یہ فیصلہ کرکے غلطی نہیں کی تھی جونی نے اسے یقین دلایا تھا کہ ڈاکٹر روسن ایک ماہر سرجن تھا اس نے کبھی کسی مریض کو مایوس نہیں کیا تھا۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد ان کی کار وسیع وادی میں پہنچ گئی۔ وہاں سڑک سیدھی اور صاف تھی۔ چاند کی پیلی

روشنی میں وادی حسین اور سرسبز معلوم ہوتی تھی۔
تین روز قبل وہ ہوائی جہاز کے ذریعے سان ڈیگو پہنچا تھا۔ تنظیم کا ایک نمائندہ پہلے سے وہاں موجود تھا۔ اس نے رات کی تاریکی میں اسے میکسیکو اسمگل کر دیا یہ کارروائی ان ہدایات کے مطابق عمل میں آئی تھی جو جونی نے اسے دی تھی میکسیکو پہنچ کر اس نے فرضی نام سے ہوٹل میں قیام کیا تھا۔ اس کے دوست احباب صرف اتنا جانتے تھے کہ وہ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق سان ڈیگو میں تعطیلات منا رہا ہے۔
اور اس وقت وہ میکسیکو کے نہ معلوم پہاڑی علاقے میں سفر کر رہا تھا۔ کار کا ڈرائیور چھوٹے قد کا میکسیکین تھا۔ تاہم وہ بڑی روانی سے انگریزی بولتا تھا۔
''کتنا سفر باقی رہ گیا ہے؟'' فرینک نے اس سے پوچھا۔
''تقریباً ایک گھنٹہ اور لگ جائے گا۔''
''کیا تم اکثر اس طرف آتے رہتے ہو؟''
''ہاں پہلے بھی اس سڑک پر سفر کرنے کا اتفاق ہو چکا ہے۔''
''خاصی تنگ اور خطرناک سڑک ہے۔'' فرینک نے کہا۔ ''اس پر بھاری گاڑیاں نہیں چل سکتیں۔ اسپتال کے لیے راشن اور دیگر بھاری سامان کس طرح پہنچایا جاتا ہے۔''
''بھاری سامان ہیلی کاپٹر کے ذریعے پہنچایا جاتا ہے۔'' ڈرائیور نے جواب دیا۔ ''اسپتال کے قریب ایک ہیلی پیڈ بنا ہوا ہے۔''
فرینک نے سوچا کہ اگر اسے ہیلی کوپٹر کے ذریعے پہنچایا جاتا تو زیادہ اچھا ہوتا لیکن اس طرح شاید اس کے سفر کو خفیہ رکھنا ممکن نہ ہوتا۔ نہ معلوم انہوں نے زیادہ احتیاطی تدابیر کیوں اختیار کی تھیں۔ یہ بات اسے شروع سے ہی کھٹک رہی تھی لیکن وہ اس قدر مایوس تھا کہ کوئی اعتراض نہ کر سکا اور خاموشی سے ہدایات پر عمل کرتا رہا۔
یہ بات اسے اب بھی پریشان کر رہی تھی۔ اس کا اپنی دنیا سے کوئی رابطہ باقی نہیں رہا تھا وہ ایک بار پھر دل ہی دل میں اپنی سلامتی کی دعا کرنے لگا۔
کچھ دیر بعد اسے کچھ فاصلے پر ٹمٹماتی ہوئی روشنی نظر آئی جیسے جیسے کار آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ روشنی نمایاں ہوتی جا رہی تھی۔
''وہ سامنے اسپتال نظر آ رہا ہے؟'' فرینک نے پوچھا۔
''ہاں وہ اسپتال کی روشنیاں ہیں۔''
فرینک کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ وہ بار بار خود سے پوچھ رہا تھا' کیا یہ آپریشن کامیاب رہے گا؟ وہ زندگی میں پہلی مرتبہ اتنا بڑا آپریشن کرانے جا رہا تھا اور خاصا خوفزدہ تھا۔
اسپتال کی عمارت جدید اور کشادہ تھی۔ اردگرد تیز روشنی کے بلب جل رہے تھے۔ آس پاس سیب اور انگور کے درخت دیکھے جا سکتے تھے۔ ایک طرف سبزیوں کا کھیت بھی تھا۔ گویا اسپتال کے عملے کی بیشتر ضروریات وہیں سے پوری ہو جاتی تھیں۔
کار اسپتال کے صدر دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ ڈاکٹر راِبسن اپنے دو ماتحتوں کے ہمراہ بذات خود اس کے استقبال کے لیے وہاں موجود تھا۔ ڈاکٹر نے اس سے ہاتھ ملایا اور اس کی رہنمائی کرتا ہوا اندر لے گیا۔ ایک ملازم اس کے لیے برانڈی کا گلاس بھر کر لے آیا۔
''مسٹر فرینک۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''غسل کے لیے گرم پانی تیار ہے برانڈی پینے کے بعد غسل کر لو۔ باتھ روم میں تمہارے لیے صاف لباس کا جوڑا بھی تیار رکھا ہے۔''
ڈاکٹر کے لہجے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا

کہ وہ درخواست نہیں کر رہا بلکہ حکم دے رہا ہے۔
فرینک نے اس کے حکم کی تعمیل میں کوئی دیر نہیں لگائی۔ جب وہ غسل خانے سے باہر آیا تو دو ملازموں کو اپنا منتظر پایا۔ وہ اس کی رہنمائی کرتے ہوئے ایک کشادہ کمرے میں لے گئے۔ فرینک سوچ رہا تھا کہ وہ اسے بیڈ روم میں لے جا رہے ہیں لیکن جب اس نے کشادہ کمرے کا جائزہ لیا تو دنگ رہ گیا وہ جدید آلات سے لیس آپریشن روم تھا۔ دونوں ملازموں نے اسے نہایت آرام کے ساتھ آپریشن ٹیبل پر لٹا دیا اور بیلٹ باندھنے لگے۔ اسی لمحے ڈاکٹر راسن اپنے دو نائبوں کے ہمراہ آپریشن روم میں داخل ہوا وہ تینوں سبز لباس میں ملبوس تھے۔

"ڈاکٹر کک...... کیا تم فوراً آپریشن کرنا چاہتے ہو؟"

"ہاں مسٹر فرینک۔" ڈاکٹر نے خوش دلی سے کہا۔ "یہ کام جتنی جلدی ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔" پھر وہ اپنے معاونین کو ہدایات دینے لگا۔ اس کے معاونین نہایت تیزی اور مستعدی کے ساتھ آپریشن کا سامان میز کے ارد گرد سجانے لگے اسی دوران کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک نرس پہیوں والا اسٹریچر دھکیلتی ہوئی داخل ہوئی۔ اس نے اس اسٹریچر کو فرینک کی میز کے ساتھ لگا کر کھڑا کر دیا۔ اس کے اوپر سفید چادر سے ڈھکا ہوا جسم موجود تھا۔ فرینک نے گہرا سانس لیتے ہوئے سوچا تو یہ وہ شخص ہے جس کے پھیپھڑے اس کے جسم میں لگائے جائیں گے۔ وہ اس کی طرف دیکھنا نہیں چاہتا تھا لیکن کوشش کے باوجود باز نہ رہ سکا۔ اس نے ہولے ہولے سر گھما کر اسٹریچر کی طرف دیکھا۔ سب سے پہلے اس کی نظر اسٹریچر پر لیٹے ہوئے شخص کے ہاتھ پر پڑی۔ وہ کسی ضعیف شخص کا جھریوں بھرا ہاتھ تھا۔ فرینک کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ جونی نے کہا تھا کہ اسے کسی نوجوان کے پھیپھڑے لگائے جائیں گے لیکن یہاں معاملہ بالکل الٹ تھا۔

"یہ...... یہ آدمی تو بہت بوڑھا ہے۔" وہ اپنے جسم پر بندھی ہوئی بیلٹ میں کشمکش کرتا ہوا بولا۔ پھر اس کی نظر بوڑھے کے چہرے پر پڑی اس کے ساتھ اس پر گویا سکتہ سا طاری ہو گیا۔ لمحہ بھر کے لیے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اسٹریچر پر جو شخص لیٹا ہوا تھا وہ اسے بہت اچھی طرح جانتا تھا وہ اس کا کاروباری حریف جارگوز تھا۔

"ڈاکٹر۔" فرینک چیخا۔ "یہ کیا معاملہ ہے اس شخص کو یہاں کیوں لایا گیا ہے؟"

ڈاکٹر نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی اور بدستور اپنے آلات جراحی کی دیکھ بھال میں مصروف رہا۔

"اس دنیا کے بازار میں ہر چیز مل جاتی ہے۔" بوڑھے جارگوز نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "لیکن صرف اس کو جو زیادہ بولی دینا جانتا ہو۔"

"کیا بک رہے ہو بڈھے بگلے۔"

"ذرا آہستہ بولو میرے بچے جارگوز نے کہا۔ "تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میرا دل کمزور ہے لیکن بہرحال یہ ایک عارضی کمزوری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارا دل خاصا مضبوط ثابت ہوگا اور میرے کمزور جسم کو نئی توانائی فراہم کرے گا بہرحال اس عطیے کا بہت بہت شکریہ۔"

"کیا؟" فرینک چیخا۔

لیکن دوسرے ہی لمحے ڈاکٹر نے اس کے چہرے پر کلوروفارم کا نقاب چڑھا دیا۔

حیاتِ نو

ممنون الرحمن

یہ حقیقت ہے کہ ادیب ہی سب سے بڑے موجد ہوتے ہیں' وہی اپنی تحریروں میں نت نئے خیالات پیش کرتے ہیں جو بعدازاں حقیقت کا روپ اختیار کرتے ہیں۔
زیر نظر کہانی اس دور میں لکھی گئی جب کلوننگ کے تصور نے جنم بھی نہیں لیا تھا' شاید یہی کہانی کلوننگ کا سبب بنی ہو۔

سائنس فکشن کے شائق قارئین کے لیے بطور خاص ایک خوبصورت تحریر

بین الاقوامی نگراں کمیشن کے چیئرمین کی آمد آمد تھی' ''ادارۂ تجسیم'' میں زبردست گہما گہمی تھی۔ یہ ادارہ دنیا میں اپنی طرز کا واحد اور انوکھا ادارہ تھا اور تمام دنیا میں اس کی دھوم تھی کیونکہ اس ادارے نے اپنی تحقیقات اور سائنسی دریافتوں اور شب و روز کی کاوشوں کے نتیجے میں ان تمام مخلوقات کو از سر نو گوشت و پوست میں زندہ کرلیا تھا جو تیسری جنگ عظیم کے نتیجے میں اس کرۂ ارض سے معدوم ہوگئی تھیں۔ ہاتھی' شیر' چیتے' گلدار' بلی' کتے' گھوڑے' بکری' گائے' بیل' بھینس' غرض کہ ہر قسم کے خونخوار اور پالتو جانور ہر قسم کے پرندے اس ادارے کی کاوشوں سے از سر نو جی اٹھے تھے۔

ان دنوں یہ ادارہ آبی جانوروں کی تخلیق نو میں منہمک تھا لیکن یہ کام زیادہ مشکل تھا۔

ادارۂ تجسیم نو کے ڈائریکٹر نے بڑھ کر بین الاقوامی کمیشن کے سربراہ کا استقبال کیا۔ سب سے پہلے سربراہ کو ادارے کے انتظامی شعبے میں لایا گیا اور یہاں اسے ادارے کے کام سے آگاہ کیا گیا۔

''آپ کا ادارہ واقعی گراں قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔'' بین الاقوامی کمیشن کے سربراہ نے کہا۔

''جی ہاں مگر آپ خود ملاحظہ فرما سکتے ہیں کہ جتنے بڑے پیمانے پر یہ کام ہونا چاہیے' ہم نہیں کر سکتے۔ وجہ آپ جانتے ہی ہیں فنڈز کی کمی۔''

ان دنوں واقعی یہ ادارہ فنڈز کی کمی کا شکار تھا اور حکومت نے عالمی ادارے سے یہ اس ادارے کے لیے خصوصی رقم کی امداد طلب کی تھی۔ بین الاقوامی کمیشن کو بھی اس ادارے کی اہمیت کا پوری طرح احساس تھا اور کمیشن کے سربراہ نے خود ہی اس ادارے کے معائنے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ امداد کے مراحل جلد اور بلا کسی تاخیر کے طے ہو جائیں۔

''آیئے اب ذرا میں آپ کی لیبارٹری بھی دیکھ لوں۔'' چیئرمین نے کہا۔

''ضرور ضرور۔'' ڈائریکٹر نے کہا۔

پھر وہ دونوں لیبارٹری کی طرف بڑھ گئے' راستے میں چیئرمین نے پوچھا۔

''مسٹر ڈائریکٹر! سادہ الفاظ میں کیا آپ تجسیم نو کی تھیوری بتائیں گے آخر یہ معجزہ آپ نے کیسے کر دکھایا۔''

''بات بہت آسان ہے ہم نے کیا یہ کہ تباہ شدہ علاقوں سے معدوم مخلوقات کے ڈھانچے جمع کیے پھر کھنڈرات کی مدد سے ان کے ڈھانچوں اور عادات و خصائل کا مطالعہ کیا۔ پرانی کتابوں سے ان کی اینا ٹومی' بیالوجی اور خلیوں کی ساخت وغیرہ کا مطالعہ کیا' اس کے بعد ان کے سائیٹو پلازم وغیرہ پر تحقیقات کی پھر ان تمام مطالعوں اور تحقیقات کے نتائج کو مربوط کرکے کیمیکی عمل سے گزارا گیا' نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔''

اسی قسم کی باتیں کرتے ہوئے وہ اب ان بہت بلند و بالا عمارتوں کے قریب پہنچ گئے تھے جن میں کوئی کھڑکی نہیں تھی ان کی دیواریں ہموار اور سپاٹ تھیں صرف ایک پہلو میں ایک دروازہ تھا اور اس کے باہر ایک

سنتری موجود تھا۔ سنتری نے انہیں دیکھتے ہی سیلوٹ کیا اور پھر آہنی دروازہ کھول دیا۔

اب وہ لیبارٹری کے اندر پہنچ گئے تھے۔

لیبارٹری میں دونوں طرف شیشے کے لمبے چوڑے حوض بنے ہوئے تھے ان حوضوں میں بے شمار نلکیاں اور تار جا رہے تھے ہر حوض کے ساتھ ایک بڑا سا کنٹرول بورڈ بھی تھا جس پر متعدد ڈائل بنے ہوئے تھے۔ ان ڈائیلوں میں سے کئی کی سوئیاں تھرتھرا رہی تھیں۔ ہر حوض میں گاڑھا مگر شفاف سیال مادہ تھا اور اس مادے میں بجلیاں کوندرہی تھیں۔

''یہاں اس حوض میں اود بلاؤ کی تجسیم نو ہو رہی ہے۔'' ڈائریکٹر نے بتایا ''اس میں آکٹوپس۔''

وہ بڑھتے رہے۔ ''اور اس میں؟'' چیئرمین نے پوچھا۔

''اس میں ڈلفن کی تجسیم نو ہو رہی ہے۔'' ڈائریکٹر نے کہا۔

''جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ان دنوں ہم آبی جانوروں کی تجسیم نو میں مصروف ہیں۔''

لیبارٹری میں نیم تاریکی تھی لیکن حوضوں میں ہونے والے جھماکوں سے ماحول خاصا روشن تھا ماحول میں ایک ایسا درجہ حرارت تھا جسے نہ سرد کہا جا سکتا تھا نہ گرم' ایسا درجہ حرارت جس سے تازگی اور بشاشت کا احساس دوچند ہو جاتا تھا۔

اب وہ لیبارٹری کے اس حصے میں تھے جہاں تجسیم نو پانے والی مخلوقات کو زبردست نگرانی میں رکھا جاتا تھا۔ یہاں کئی اود بلاؤ کئی آکٹوپس اور کئی ڈلفن موجود تھیں۔

اس سیکشن سے نکلنے کے بعد اب ڈائریکٹر' چیئرمین کو لے کر اس سیکشن میں آیا جہاں تجسیم نو پانے والی مخلوقات تیار شدہ حالت میں موجود تھیں۔ مختلف حوضوں میں آبی جانور تیر رہے تھے۔ اب وہ ایک ایسے پنجرے کے سامنے تھے جس کے اندر ایک مخلوق بڑی اداس کیفیت میں بیٹھی تھی۔

''یہ کیا ہے؟'' چیئرمین نے سوال کیا۔ ''یہ آبی مخلوق تو نہیں ہوتی۔''

''جن تمام مخلوقات کی ہم تجسیم نو کر چکے ہیں' ان میں یہ سب سے زیادہ خطرناک ہے۔''

''کیا شیر اور چیتے سے بھی زیادہ خطرناک اور خونخوار؟''

''جی ہاں۔''

''مگر بظاہر تو یہ بڑا بے ضرر معلوم ہوتا ہے۔''

''جی ہاں' مگر یہ ذہنی طور پر سب سے زیادہ خطرناک اور خونخوار ہے۔'' ڈائریکٹر نے کہا۔

''اس کا جوڑا تیار نہیں کیا؟''

''جی نہیں' مجھے اس کا جوڑا تیار کرنے کی اجازت نہیں ملی' مجھے تو اسی کو تیار کرنے کی اجازت حاصل کرنے میں بڑی مشکل پیش آئی۔ تنہائی کی وجہ سے یہ بڑا اداس رہتا ہے مگر میں اسے بھرپور محبت دوں گا' بے چارہ۔''

''تو تو......'' چیئرمین ہکلایا' اس کے چہرے پر دہشت کے آثار پھیل گئے۔ ''کہیں یہ وہ تو نہیں' وہ میرا مطلب ہے۔''

''جی ہاں۔'' ڈائریکٹر بڑے گمبھیر لہجے میں بولا۔ ''یہ وہ انسان ہے۔''

''نہیں۔'' چیرمین کی چیخ پوری لیبارٹری میں گونج گئی اور اس کے ماتھے پر مینڈک کی طرح ابھری ہوئی آنکھیں خوف سے کچھ زیادہ ہی ابل پڑیں۔ اس کے چپو جیسے ہاتھ ڈھیلے انداز میں ڈھلک گئے' کرۂ ارض کی نئی ذہین مخلوق اپنے پیشرو کی وحشتناکیوں سے خوف زدہ تھی۔

❁

درندہ

خورشید پیرزادہ

انسانی اقدار اگر بدل جائیں تو معاشرہ ایک ایسے جنگل میں تبدیل ہو جاتا ہے جہاں بظاہر انسان رہتے ہیں لیکن ان کی خصلتیں درندوں سے بھی بدتر ہوجاتی ہیں۔ درندے اس وقت ہی کسی جانور کا شکار کرتے ہیں جب بھوک ان کی ہر حس پر غالب آجاتی ہے' ورنہ عام حالت میں وہ کسی پر حملہ نہیں کرتے لیکن جب انسان درندہ بن جاتا ہے تو بلاوجہ اپنے جیسے انسان کو بھنبھوڑنا اس کی فطرت بن جاتی ہے۔ کسی کو قتل کرنے کے لیے وہ کوئی جواز تلاش نہیں کرتا۔ جیسا کہ آج ہمارے پورے ملک خصوصاً کراچی کی گلیوں میں ہو رہا ہے۔ وہاں روزآنہ تشدد زدہ بوری بند لاشیں ملتی ہیں۔ خودکش اور پلانٹڈ بم دھماکے ہوتے ہیں' جن میں درجنوں معصوم بچے' خواتین' بوڑھے اور جوان ہلاک ہوجاتے ہیں' نہ مارنے والے کو پتا ہوتا ہے کہ وہ کیوں مار رہا ہے' نہ مرنے والے کو کہ اسے کیوں قتل کیا جارہا ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہو رہا ہے کہ انسان درندہ بن چکا ہے۔ درندگی خون بن کر اس کی رگوں میں دوڑ رہی ہے۔

نئے افق کے قارئین کے لیے خورشید پیرزادہ کی دلچسپ تحریر

سطر سطر تجسس لفظ لفظ ہنگامے لئے ایک طویل ناول

کافی دیر تک ان کے درمیان خاموشی رہی پھر رفیق بولا میں ”میڈم سے مل کر آتا ہوں۔“

”مگر تم کو نہیں پہچانے گی۔“ مراد نے میک اپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”دیکھا جائے گا۔تم یہیں رکو۔“

رفیق' شہلا کی طرف بڑھا جو گلابی ساڑھی پہنے ہوئے تھی اور کسی خاتون سے محو گفتگو تھی۔رفیق نے شہلا کے پاس آکر کہا۔ ”ایکسکیوز می میڈم۔آپ سے ضروری بات کرنا ہے۔“

”کیا میں آپ کو جانتی ہوں؟“ شہلا نے اسے پہچانا نہیں۔

”شاید۔“ رفیق نے اپنی آواز میں کہا۔

”میڈم درندہ یہاں کوئی گیم کھیلنے والا ہے۔اس نے مجھے یہاں بلایا ہے۔دوسری بات یہ کہ اس نے میرے دوست مراد کی گرل فرینڈ کو بھی اغواء کرلیا ہے۔وہ واپس آ گیا ہے اور لگتا ہے کہ اس بار وہ بہت کچھ کرنے کے موڈ میں ہے۔آپ فوراً یہاں سے چلی جائیں۔“ رفیق نے شہلا کو خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

”ویسے تو میں کچھ دیر میں جانے ہی والی تھی۔مگر اب تو بالکل نہیں جاؤں گی۔“ شہلا کڑک لہجے میں بولی۔

”میڈم آپ یہاں رہیں گی تو میری ساری توجہ آپ پر ہی رہے گی۔“

”تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ڈی ایس پی ہوں اور ایسا رسک لینا میرا فرض ہے۔“

”ہاں آپ ڈی ایس پی ہیں اور میں معطل انسپکٹر۔آپ میری بات کیوں مانیں گی۔“ رفیق نے جھنجلا کر کہا۔

”یہ کیسی بات کر رہے ہو رفیق۔وہ سب اپنی جگہ ہے اور تمہارا میرا رشتہ اپنی جگہ ہے۔“

”آپ کا اور میرا رشتہ......؟ بس تھوڑا اور آگے بڑھ کر آج دل کی بات کہہ ہی ڈالیں۔“

”چلو چلو۔اپنا راستہ ناپو۔“

"میڈم پلیز یہاں سے چلی جائیں۔ میری چھٹی حس کسی خطرے کی بو سونگھ رہی ہے۔ اس نے مجھے بلایا ہے اور ہوسکتا ہے کہ مجھے پریشان کرنے کے لیے آپ کو نشانہ بنائے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"کیوں ڈرتے ہو میرے لیے؟" شہلا نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

"آپ جانتی ہیں۔"

"تم مجھے تو کہتے رہتے ہو کہ بول دو۔ بول دو۔ خود تم نے ابھی تک کچھ بھی نہیں کہا۔"

"میری اوقات ہی کیا ہے آپ کے سامنے۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں ٹھکرا نہ دیا جاؤں۔" رفیق نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"اس میں اوقات کی بات کہاں سے آ گئی۔ جاؤ تم۔ مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔"

"سوری میڈم۔"

"سوری ووری کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم جاؤ یہاں سے۔" شہلا نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے میں جاتا ہوں۔ آپ اپنا خیال رکھنا۔ مجھے درندے کو ڈھونڈنا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی گیم کھیل جائے مجھے اسے پکڑنا ہے۔" یہ کہہ کر رفیق وہاں سے جانے لگا۔

"رکو۔" شہلا چل کر اس کے پاس آئی اور بولی۔ "تم بھی اپنا خیال رکھنا۔"

"او کے۔" رفیق مسکرا کر آگے بڑھ گیا۔

رفیق دوبارہ مراد کے پاس آ گیا اور پوچھا۔ "کچھ ایسا ویسا دکھائی دیا کیا؟"

"اتنے سارے لوگ ہیں یہاں۔ سب پر کیسے فوکس کریں۔" مراد نے کہا۔

"میرے لیے ریما کی شادی میں خاص کیا ہوسکتا ہے؟" رفیق سوچ میں پڑ گیا۔

"کہیں وہ ریما کا آرٹ تو نہیں بنا رہا۔" اچانک مراد نے ایک بھیانک اندیشہ ظاہر کیا۔

"اوہ مائی گاڈ۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ چلو دیکھتے ہیں کہ ریما کہاں ہے۔" رفیق نے جلدی سے کہا۔

دونوں بھاگتے ہوئے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس جگہ پہنچے جہاں ریما کو دلہن بنایا جا رہا تھا۔

"ایکسکیوز میں۔ ریما کہاں ہے؟" رفیق نے ایک خاتون سے پوچھا۔

وہ ذرا فریش ہونے گئی ہے۔ نکاح میں ابھی دیر ہے۔ آپ فکر نہ کریں وہ وقت پر پہنچ جائے گی۔" خاتون نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کون سے کمرے میں ہے وہ۔" رفیق نے پھر پوچھا۔

"جس کے سامنے میں کھڑی ہوں۔" خاتون بولی۔

رفیق نے فوراً دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ تب تک چوہان بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔

"یہ کون ہو تم اور دروازہ کیوں پیٹ رہے ہو۔" چوہان غصے سے بولا۔

"سر میں رفیق ہوں۔ ریما کی جان کو خطرہ ہے۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

مگر رفیق نے چوہان کی ایک نہ سنی۔ اس نے دروازے پر اتنی زور سے لات ماری کہ اس کا لاک ٹوٹ گیا اور دروازہ کھل گیا۔ جب رفیق اندر گھسا تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ اندر کا نظارہ برداشت نہیں کر پایا۔

کمرے میں ریما کی برہنہ لاش خون میں لت پت پڑی تھی۔ سر سے لے کر پاؤں تک وہ خون کے

رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ سنگھار میز کے آئینے پر درندہ کوئی پیغام لکھ کر گیا تھا۔ جسے پڑھ کر ہر کوئی کانپ کر رہ گیا۔

"میرے ہاتھوں سے کوئی بچ جاتا ہے تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ لیکن کوئی ایک بار بچ سکتا ہے۔ دوسری بار نہیں۔ دوسری بار میرا پلان پہلے سے بھی زیادہ بھیانک ہوتا ہے۔ مسٹر مغلِ اعظم! ریما کو سرخ ساڑھی کی بجائے سرخ رنگ سے رنگ دیا ہے میں نے۔ سب کو ریما کی شادی مبارک ہو۔"

رفیق سے برداشت نہیں ہوا اور وہ رو پڑا۔ چوہان اپنی بہن کی لاش دیکھ کر بے ہوش ہو کر گر گیا تھا۔

"سوری ریما۔ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکا۔ میں نے آنے میں دیر کر دی۔" مراد نے کمرے پر غور کیا تو اس نے دیکھا کہ کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔

"رفیق وہ درندہ اس کھڑکی کے راستے بھاگا ہے۔" مراد نے کہا۔

"چھوڑیں گے نہیں سالے کو۔ آؤ دیکھتے ہیں۔"

دونوں کھڑکی سے کود کر باہر آ گئے۔ دور سے انہوں نے ایک سائے کو بھاگتے ہوئے دیکھا۔ رفیق اور مراد اس سائے کے پیچھے دوڑ پڑے۔

"رک جاؤ۔ ورنہ گولی مار دوں گا۔" رفیق نے چلا کر کہا۔

مگر وہ سایہ رکا نہیں۔ وہ سایہ کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گر پڑا اور جب تک وہ اٹھتا رفیق اور مراد نے اسے چھاپ لیا۔

"ارے چھوڑو مجھے۔ کون ہو تم لوگ۔ انسپکٹر سکندر پر ہاتھ ڈالنے کا انجام بہت برا ہوگا۔"

رفیق انسپکٹر سکندر کے سر پر پستول کی نال رکھتے ہوئے بولا۔ "تم یہاں کیا کر رہے تھے۔ جب ہم نے رکنے کا کہا تو تم رکے کیوں نہیں۔ جلدی بولو ورنہ سر میں کھڑکی کھول دوں گا۔ ویسے بھی میرا دماغ گھوما ہوا ہے۔"

"میں رات کا راہی ہوں۔ سکندر کا کوئی بال بھی بانکا نہیں کر سکتا مغل صاحب۔ پیچھے ہٹو۔ پستول میرے پاس بھی ہے۔"

"پہلے تم یہ بتاؤ کہ یہاں کیا کر رہے تھے؟" رفیق غرایا۔

"میں نے کسی کو کھڑکی سے کود کر بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسی کا پیچھا کر رہا تھا۔"

"جھوٹ بول رہے ہو تم۔ ہم نے تمہارے آگے کسی کو بھاگتے ہوئے نہیں دیکھا۔ تم اکیلے ہی بھاگے جا رہے تھے۔" مراد نے کہا۔

"میں اندھیرے میں کسی کا پیچھا کر رہا تھا۔ میرا یقین کرو۔"

"رفیق ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ ہم نے کسی کو بھی نہیں دیکھا۔ بس یہ اکیلا بھاگا جا رہا تھا۔" مراد نے رفیق کے کان میں کہا۔

☆☆☆☆☆☆☆

راجو اور وردا اپنی محبت کے خمار میں کھوئے ہوئے تھے۔ انہیں ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ درندے نے سحرش کو اغواء کر لیا ہے اور ریما کو مار دیا ہے۔ دونوں دنیا کی ہر بات سے بے خبر تھے۔ راجو وردا کو باہر ڈنر کروا کے آج پھر اپنے گھر لے آیا تھا۔

"پورے ایک مہینے بعد ہم اس چھوٹے سے گھر میں واپس آئے ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ ہماری جنگ ابھی بھی جاری ہے۔" راجو نے ہنستے ہوئے کہا۔

"وہ تو جاری رہے گی۔ میں ہار ماننے والوں میں سے نہیں ہوں۔" وردا مسکرا کر بولی۔

"میں نے بھی زندگی میں کبھی ہارنا نہیں سیکھا۔ ایک دن جیت میری ہی ہوگی۔ بلکہ ہوسکتا ہے کہ آج ہی ہوجائے۔"

"اور ان تمام باتوں سے ہٹ کر میں تم کو دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہوں۔"

"میں بھی تم سے بہت محبت کرتا ہوں اور اگر ایسا ہے تو آج تم ہار مان ہی لو۔ مجھ سے یہ دوری برداشت نہیں ہورہی ہے۔" راجو نے شرارت سے کہا۔

وردا ابھی دو قدم ہی چلی تھی کہ اچانک وردا کا پاؤں مڑا اور وہ گرنے لگی اور خود کو گرنے سے بچانے کے لیے اس نے برابر میں رکھی میز کو تھامنے کی کوشش کی اور میز کو لیتے ہوئے نیچے گر گئی اور میز پر رکھی کتابیں بھی بکھر گئیں۔

راجو جلدی سے اس کے پاس آ گیا۔ "کیا ہوا۔ تم ٹھیک تو ہونا۔"

"ہاں۔ بس پاؤں لڑکھڑا گیا تھا۔" وردا نے کہا۔ پھر اس کی نظر ایک کتاب میں سے نکل کر گرنے والی تصویر پر پڑی اور وہ سوچ میں پڑ گئی۔

راجو نے اس کا بازو پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی تو وردا نے اسے روک دیا اور دوبارہ اپنی توجہ تصویر پر مرکوز کردی۔

"ارے اٹھونا۔ اب کیا یہیں سونے کا ارادہ ہے۔"

"ایک منٹ رکو۔"

"کیا پاؤں میں موچ آ گئی ہے۔ میں آیوڈیکس لگا دیتا ہوں۔" راجو نے کہا۔

وردا کی نظر پھر اس تصویر پر گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے چہرے پر پسینہ آ گیا اور رونگٹے کھڑے ہو گئے اسے پتہ ہی نہیں چلا۔

"ر......راجو۔ یہ تصویر کس کی ہے؟" وردا نے تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ...... یہ تو نغمہ ہے۔ تم تو اس سے مل چکی ہو۔ بھول گئی کیا؟"

"ارے نغمہ کو میں کیسے بھول سکتی ہوں۔ اس کی تصویر کے اوپر جو تصویر ہے۔ اس کی بات کر رہی ہوں۔" راجو کو وردا کی آواز میں ڈر اور خوف صاف محسوس ہورہا تھا۔

"کیا ہے وردا۔ تم اتنی خوفزدہ کیوں لگ رہی ہو؟"

"یہی...... یہی درندہ ہے...... یہی درندہ ہے۔" وردا ایک سانس میں کہہ گئی۔

یہ سن کر راجو کے پیروں تلے جیسے زمین نکل گئی۔

"کیا بول رہی ہو۔ تم ہوش میں تو ہو۔ تم تو کہہ رہی تھیں کہ تمہیں اس کا چہرہ یاد نہیں رہا۔"

"ہاں بھول گئی تھی اس کا چہرہ۔ مگر یہ تصویر دیکھ کر پھر سے یاد آ گیا۔ میرا یقین کرو راجو یہی درندہ ہے۔" وردا کی آواز بری طرح کپکپا رہی تھی۔

"ہمیں یہ بات فوراً انسپکٹر رفیق کو بتانی ہوگی۔"

راجو نے جب رفیق کو فون کیا تو اس وقت وہ سکندر کے سر پر پستول تانے کھڑا تھا۔

"ہیلو راجو۔" رفیق نے فون ریسیو کرتے ہوئے کہا۔ "کہاں ہو بھائی۔ کتنے بے پروا ہو گئے ہو تم۔ فون بھی نہیں اٹھاتے ہو۔ تم ہو کہاں؟"

"سر فون سائلنٹ موڈ پر تھا۔"

"اوکے۔ فون کیوں کیا ہے اب؟" رفیق نے پوچھا۔

"سر درندے کا پتہ چل گیا ہے۔"

"کیا......؟" رفیق کو یہ خبر سن کر ایسا لگا جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔

"ہاں سر وردا نے اسے پہچان لیا ہے۔ اسے درندے کی تصویر دیکھ کر سب کچھ یاد آ گیا ہے۔"

"جلدی بولو۔ کون ہے وہ؟" رفیق نے بے تابی

سے پوچھا۔

راجو نے جب درندے کے بارے میں بتایا تو اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ راجو کی بات سن کر اسے یقین ہی نہیں ہو رہا تھا۔

"فون وردا کو دو۔" رفیق نے کہا۔

راجو نے فون وردا کو تھما دیا۔ "انسپکٹر رفیق بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"ہاں وردا۔ راجو نے جو کہا کیا وہ سب صحیح ہے؟"

"ہاں سو فیصد۔" وردا نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ تم دونوں وہیں رہو۔ کہیں مت جانا۔" رفیق نے یہ کہہ کر فون کاٹ دیا۔

"سوری سکندر صاحب۔ آپ بھی جائیں۔ ہم بھی چلتے ہیں۔"

"عجیب بات کر رہے ہو تم۔ وہ جو کوئی بھی تھا۔ وہ تو نکل گیا نا ہاتھ سے۔" سکندر نے منہ بنا کر کہا۔

"تو اچھا ہے نا۔ آپ تو رات کے راہی ہیں، اب آپ بے فکر ہو کر جا سکتے ہیں۔" رفیق ہنستے ہوئے بولا۔

سکندر کو وہیں چھوڑ کر رفیق اور مراد وہاں سے پلٹ گئے۔

"مراد اب تمہاری سحرش کو کچھ نہیں ہوگا۔ درندے کا پتہ چل گیا ہے۔ وردا نے اسے پہچان لیا ہے۔"

"سچ کہہ رہے ہو۔" مراد کے لہجے میں بے یقینی تھی۔ یہ تو بہت بڑا معرکہ سر ہو گیا تھا۔

"ہاں ایک دم سچ۔ لیکن ہم اسے اس کے طریقے سے ہی ماریں گے۔ چلو سالے کے لیے ایک آرٹسٹک مرڈر کا پلان بناتے ہیں۔ پینٹنگ تو مجھے نہیں آتی لیکن میں اس کی موت کی پینٹنگ ضرور بناؤں گا۔ الٹی سیدھی جیسی بھی بنے۔"

"کون ہے وہ۔ مجھے بتاؤ تو سہی۔" مراد بھی جاننے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔

رفیق نے مراد کو درندے کے بارے میں بتا دیا اور یہ سن کر مراد بھی حیران رہ گیا۔

رفیق اور مراد نے اپنا میک اپ نکال کر ایک طرف پھینک دیا۔ "مراد میں میڈم سے مل کر آتا ہوں۔ تم یہیں رکو۔"

رفیق کو اپنی طرف آتا دیکھ کر شہلا لوگوں کی بھیڑ سے ہٹ کر اکیلے میں کھڑی ہو گئی۔

"داڑھی مونچھ کیوں اتار دی۔" شہلا نے پوچھا۔

"جس کام کے لیے یہاں آیا تھا وہ ہو گیا۔ اس لیے اتار دی۔"

"کیا مطلب؟"

"درندے کا پتا چل گیا ہے۔" رفیق نے شہلا کے اوپر دھماکہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا..... کون ہے وہ؟" شہلا بھی بے تاب ہو گئی تھی جاننے کے لیے۔

"اپنے ایس پی صاحب۔" رفیق نے ہائیڈرو جن بم سے بڑا دھماکہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا! تم ہوش میں تو ہو۔" ایک لمحے کے لیے شہلا کو ایسا لگا جیسے رفیق کا دماغ چل گیا ہو۔

"جی ہاں پورے ہوش میں ہوں۔ وردا نے اس کی تصویر پہچان لی ہے۔ اب ان کا مایا جال سمجھ میں آیا۔ خود کو اسپتال میں بھرتی کروا دیا اس نے تا کہ اس پر کسی کا شک نہ جائے۔ پھر وردا کے گھر پر حملہ ہوا۔ ہم سب حیران تھے کہ درندہ صرف پینٹنگ رکھ کر کیوں چلا گیا۔ یہ سب ہمیں بھٹکانے کے لیے تھا۔ ایس پی صاحب کو ڈر تھا کہ کہیں کسی کو اس پر شک نہ ہو جائے۔ اس لیے وہ یہ جال بُن کر خود کو شک کے دائرے سے نکالنا چاہتا تھا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ

ہسپتال میں بھی ان کا جعلی علاج ہوا ہوگا۔ جس ڈاکٹر نے اس کا ٹریٹمنٹ کیا تھا وہ اس دوست تھا۔ ہمیں بے وقوف بنانے کے لیے وہ زبردستی آئی سی یو میں رہا۔" رفیق نے ساری تفصیل شہلا کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ سن کر مجھے تو یقین ہی نہیں ہو رہا ہے۔ پولیس کا اتنا بڑا آفیسر، جس پر لوگوں کی حفاظت کی ذمہ داری ہے۔ لوگوں کو مارتا پھر رہا ہے۔" شہلا نے افسوس سے کہا۔

"آپ کو ابھی یہ بھی پتہ نہیں ہے کہ یہاں اس نے کیا اندھیر مچا دیا ہے۔ جس کی شادی میں آپ آئی ہیں۔ اس کو بھی ایس پی صاحب نے مار دیا ہے۔"

"او مائی گاڈ۔" شہلا کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"ہم اسے اسی کے طریقے سے ماریں گے۔ وہ ایک آرٹسٹ مرڈر کے لائق ہے۔ ہم اسے اس طرح سے ماریں گے کہ اسے فخر ہوگا کہ وہ ہمارے ہاتھوں مارا گیا۔"

"میں تمہارے ساتھ ہوں۔" شہلا کا جواب سن کا رفیق کا حوصلہ اور بڑھ گیا۔

"ایک بات کہنی تھی آپ سے۔"

"ہاں کہو۔"

رفیق نے شہلا کا ہاتھ پکڑا اور اسے مزید آگے تنہائی میں لے گیا۔

"کیا کر رہے ہو۔ وہاں نہیں بول سکتے تھے کیا؟" شہلا چڑ گئی۔

رفیق نے شہلا کو دیوار سے ٹکا کر کھڑا کر دیا اور خود اس کے قریب آ کر بولا۔ "کیا آپ مجھ سے محبت کرتی ہیں۔"

"مجھے نہیں پتا۔" شہلا نے ٹالنے کی کوشش کی۔

وہ دونوں ایک دوسرے کے اتنے نزدیک تھے کہ ان کی سانسیں آپس میں ٹکرا رہی تھیں۔

"لیکن مجھے پتا ہے میں آپ سے بہت محبت کرتا ہوں۔" رفیق نے آخر اپنی محبت کا اظہار کر ہی دیا۔

شہلا خاموش رہی۔ رفیق نے محبت کی مہر لگانے کی کوشش کی تو شہلا نے اپنا چہرہ پھیر لیا۔ رفیق نے اپنا سر شہلا کے کندھے پر رکھ دیا اور اس کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک گئے۔

"اسی لیے جھجک رہا تھا اپنے دل کی بات کہنے سے۔ آپ نے ٹھکرا دی نا میری محبت۔" رفیق نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میرے پاپا نے میرے لیے لڑکا ڈھونڈ لیا ہے رفیق۔ میں انہیں منع نہیں کر سکوں گی۔" شہلا بولی۔

رفیق نے شہلا سے دور ہٹتے ہوئے کہا۔ "کوئی بات نہیں میڈم۔ میں بس درندے کے پیچھے جانے سے پہلے دل کی بات کہنا چاہتا تھا۔ کیونکہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ آپ نے میری بات سکون سے سن لی۔ میرے لیے یہی بہت ہے۔ خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔"

"رفیق۔ مجھے اپنے ساتھ نہیں لے جاؤ گے۔"

"اتنی مشکلوں سے تو آپ کے زخم بھرے ہیں۔ بہت دنوں بعد آپ بستر سے اٹھی ہیں۔ آپ گھر جائیں اور آرام کریں۔"

"نہیں رفیق۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ مجھے اپنی ڈیوٹی بھی کرنی ہے۔"

"ابھی جوائن نہیں کیا ہے آپ نے۔ آپ کو میری قسم، گھر جائیں۔ میری اتنی بات تو مان لیں، مجھے خوشی ہوگی۔ باقی آپ کی مرضی۔ آپ ڈی ایس پی صاحبہ ہیں۔ میں کون ہوتا ہوں آپ کو کچھ کہنے والا۔"

شہلا کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ "اپنا خیال رکھنا۔"

رفیق نے شہلا کو وہیں چھوڑا اور دل میں غم لیے وہاں سے چلا گیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی بھی وقت اس کی آنکھوں سے دھارا برسنے لگے گا۔ اسے اپنا غم تو پتہ تھا لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اپنے پیچھے شہلا کو بھی روتا ہوا چھوڑ کر آیا ہے۔ دو دلوں کو محبت تو ہو جاتی ہے مگر کبھی کبھی ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ اس محبت کو زبردستی دل کے کسی کونے میں دبا کر سلانا پڑتا۔ ایسا ہی کچھ رفیق اور شہلا کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔

مراد نے جب رفیق کو ایسی حالت میں دیکھا تو بولا۔ ''کیا ہوا بھائی۔ سب ٹھیک تو ہے نا؟''

''ابھی مجھ سے کچھ مت پوچھو۔ میں ابھی کچھ بھی کہنے کی حالت میں نہیں ہوں۔''

''تمہاری حالت دیکھ کر کچھ کچھ سمجھ رہا ہوں۔''

''چھوڑو ان باتوں کو۔ اب ہمیں اپنی پوری ٹیم کو جمع کرنا ہے۔''

''ایسا کرتے ہیں راجو کے گھر چلتے ہیں۔ وہیں سب کو بلا لیتے ہیں۔'' مراد نے مشورہ دیا۔

''ٹھیک ہے۔''

تھوڑی دیر بعد راجو کے چھوٹے سے کمرے میں پوری ٹاسک فورس جمع تھی۔

''درندے کا پتا تو چل گیا ہے۔ مگر اب اسے ٹریپ کرنا بھی کسی چیلنج سے کم نہیں ہے۔ ایس پی صاحب کے گھر پر کافی سخت حفاظتی انتظامات ہیں۔ ہر طرف گن مین ہیں۔ اس کے گھر میں کسی بھی قسم کا آرٹسٹک مرڈر ممکن نہیں ہے۔ ہمیں کسی بھی طرح اسے اس کے گھر سے باہر نکالنا ہوگا۔ تب ہی ہم کچھ کر پائیں گے۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ ہمیں جو کچھ بھی کرنا ہے آج رات ہی کرنا ہے۔ کیونکہ سحرش کی جان خطرے میں ہے۔ ہمیں درندے کو مارنا بھی ہے اور سحرش کو بچانا بھی ہے۔'' رفیق نے ٹیم کے سامنے چھوٹی سی تقریر کی۔

''لیکن اسے اس کی کچھار سے باہر نکالیں گے کیسے؟'' مراد نے پوچھا۔

رفیق نے جو پلان بنایا تھا اس نے سب کو اس بارے میں اعتماد میں لیا۔ اس کا پلان سن کر سب کے ہوش اڑ گئے تھے اور سب ہی ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''یار رفیق یہ کام تو بہت مشکل ہے۔ مگر اسے کرے گا کون۔ ہم میں سے کوئی بھی وہاں گیا تو اسے شک ہو جائے گا۔''

''یہ کام مونا بہت اچھی طرح کر سکتی ہے۔'' رفیق نے کہا۔

یہ سنتے ہی مونا چونک گئی۔ ''کیا......؟''

''ہاں مونا۔ اس وقت تم ہی ہماری امیدوں کا مرکز ہو۔''

''یار ہم پولیس کو کیوں ملوث نہیں کرتے۔ یہ کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔'' مراد نے کہا۔

''پولیس فورس اس کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے خلاف آپریشن شروع کرنے سے پہلے ہی اسے خبر ہو جائے گی اور ہو سکتا ہے ہم سب کو کسی نہ کسی بہانے جیل میں ڈال دیا جائے۔ یہ کام صرف اور صرف ہمیں ہی کرنا ہوگا۔'' رفیق نے تصویر کے تاریک پہلو کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا۔

''مجھ سے نہیں ہوگا یہ کام...... میں وہاں جا کر پھنس گئی تو۔ کہیں اس چکر میں میری اپنی پینٹنگ نہ بن جائے۔'' مونا نے لرزتے ہوئے کہا۔

اچانک کمرے کا دروازہ بجنے لگا۔ سب فوراً حرکت میں آ گئے۔ راجو، رفیق اور مراد نے اپنی اپنی پستولیں نکال لیں۔

''کون ہو سکتا ہے؟'' مونا نے پوچھا۔

''میں نے بھولو سے کچھ سامان لانے کو کہا تھا۔ ہوسکتا ہے وہی ہو۔'' رفیق بولا۔
''میں دیکھتا ہوں کون ہے۔'' راجو بولا۔
''راجو دھیان سے۔'' وردا فوراً بولی۔
''شکر ہے وردا کچھ تو بولی۔ راجو تو چھا گیا۔'' مراد نے چٹکی لیتے ہوئے کہا۔
''استاد۔'' راجو نے اشارے سے مراد کو منع کر دیا کہ وردا کے حوالے سے کوئی مذاق نہ کرے۔
''کون ہے؟'' راجو نے اندر سے ہی آواز لگائی۔
''ریاض حسنین دروازہ کھولو۔''
''ارے یہ تو ڈی ایس پی صاحبہ کی آواز ہے۔'' راجو نے کہا۔
یہ سنتے ہی رفیق نے فوراً آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ باہر سچ میں شہلا کھڑی تھی۔
رفیق نے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا اور شہلا کا ہاتھ پکڑ کر اسے ایک طرف لے گیا۔
''آپ یہاں کیا کر رہی ہیں۔''
''میں خود کو روک نہیں پائی۔ پلیز مجھے اپنے ساتھ رہنے دو۔ میں گھر جا کر بھی تو بے چین ہی رہوں گی۔''
''آپ میرے ساتھ کیوں رہنا چاہتی ہیں۔'' رفیق نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
''اس لیے کہ مجھے تمہاری فکر ہے۔'' شہلا بھی اس سے نظریں ملاتے ہوئے بولی۔
''کاش جھوٹ ہی سہی لیکن ایک بار تو آپ مجھ سے وہ بات کہہ دیتیں جسے سننے کے لیے میں دن رات بے چین رہتا ہوں۔''
''کہنا تو بہت کچھ چاہتی تھی، مگر......'' شہلا بولتے بولتے رک گئی پھر گہری سانس لے کر بولی۔ ''خیر چھوڑو۔''
''اب آپ یہاں آ ہی گئی ہیں تو اکیلے واپس نہیں بھیج سکتا۔ آپ نے دکھی کر دیا ہے مجھے۔ میری کوئی بات نہیں مانی۔ ہاں بھئی آپ ڈی ایس پی صاحبہ جو ٹھہریں۔ آپ میری بات کیوں مانیں گی۔''
''پلیز رفیق۔ یہ طعنے دینا بند کرو۔ میں ساتھ رہوں گی تو کچھ مدد ہی کروں گی۔ تم پر بوجھ نہیں بنوں گی۔''
''ٹھیک ہے۔ اندر آ جاؤ۔''
رفیق، شہلا کو لے کر کمرے کے اندر آ گیا۔
''ہیلو۔ مجھے امید ہے کہ میری یہاں موجودگی کسی کو پریشان نہیں کرے گی۔'' شہلا نے کہا۔
''میں آپ کو خاص خاص باتیں بتا دیتا ہوں۔'' پھر رفیق نے شہلا کو اپنا پلان بتایا۔
''ہوں۔ مگر پہلے ہمیں یہ پتا کرنا ہوگا کہ درندہ گھر پر ہے یا نہیں۔'' شہلا نے کہا۔
''میں نے پتا کر لیا ہے۔ وہ گھر پر ہی ہے۔'' رفیق نے بتایا۔
''لیکن اسے گھر سے باہر کون لائے گا۔'' شہلا نے پوچھا۔
''ہم مونا سے درخواست کر رہے ہیں۔ مگر یہ ڈر رہی ہے۔'' مراد بولا۔
''ڈرنے کی بات بھی ہے۔ بہت چالاک اور شاطر ہے وہ درندہ۔ وہ آسانی سے اس جال میں پھنسنے والا نہیں ہے۔'' راجو کو مونا کے ڈر کا احساس تھا۔
''لیکن ہم کیا کریں۔ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ جو بھی کرنا ہے فوراً کرنا ہے۔'' رفیق نے کہا۔
''مگر یہ کے کے کون ہے۔ ایس پی صاحب کا نام تو سلطان بخاری ہے۔'' شہلا نے دھیان دلایا۔
''اس کا جواب تو وہ درندہ ہی دے سکتا ہے۔ اس کے کے کے چکر میں ہم بہت گھن چکر بن چکے ہیں۔

بس اب اور نہیں۔" رفیق نے دانت پیس کر کہا۔

"وردا تم نے درندے کو کیسے پہچانا۔ اس کی فوٹو تمہارے پاس کب اور کیسے آئی؟" شہلا نے وردا سے تفتیش شروع کر دی۔

وردا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی راجو بول پڑا۔

"میڈم وردا میز سے کچھ کتابیں اٹھا رہی تھی۔ اٹھاتے وقت ایک کتاب نیچے گر گئی۔ اس میں کچھ تصویریں تھیں۔ اس میں ایک تصویر ایس پی صاحب کی بھی تھی۔"

"ایک نکتہ مجھے بہت پریشان کر رہا ہے۔ ایس پی صاحب سے تو آپ لوگ عام طور پر ملتے ہی رہتے ہوں گے۔ پھر آپ نے اس کی آواز کیوں نہیں پہچانی۔" مونا نے ایک کام کا سوال کر دیا تھا۔

"کیونکہ درندے کے روپ میں ایس پی بالکل مختلف لہجے میں بات کرتا تھا۔ تم یہ بتاؤ کہ تم یہ کام کرو گی یا نہیں۔ رپورٹر ہونے کی وجہ سے تم یہ کام آسانی کے ساتھ کر سکتی ہو۔" رفیق نے جواب دے کر سوال کر دیا۔

"ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔ مجھے کیسے' کیا کرنا ہے۔ سب بتا دو۔" مونا نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا اور سب کے چہروں پر سکون پھیل گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

"آہ......" سحرش زمین پر پڑی ہوئی کراہ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں ابھی بھی بند تھیں۔ بے ہوشی ابھی پوری طرح ٹوٹی نہیں تھی۔ وہ اس بات سے قطعی بے خبر تھی کہ وہ اس درندے کے قبضے میں ہے اور کسی انجان جگہ کے ویران کمرے کے فرش پر پڑی ہوئی ہے۔ دھیرے دھیرے وہ ہوش کی دنیا میں واپس آ رہی تھی۔

پھر اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔

ایک لمحے کے لیے تو اسے لگا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ مگر اگلے ہی لمحے ڈر اور خوف نے اس کے پورے وجود کو گھیر لیا۔ وہ تھر تھر کانپنے لگی۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ فرش پر پڑی ہے اور اس کے تن پر ایک بھی کپڑا نہیں ہے۔ ہاتھ پیر بری طرح کانپ رہے تھے جس کی وجہ سے وہ بڑی مشکل سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

اس نے اٹھ کر چاروں طرف دیکھا۔ کمرے میں بس ایک دروازہ ہی تھا۔ ایک کونے میں چھوٹی سی میز رکھی تھی جس پر پیپر ویٹ کے نیچے ایک کاغذ رکھا تھا۔

"یا خدا۔ میں یہاں کیسے پہنچ گئی۔"

سحرش کو یاد آیا کہ وہ کالج سے جلدی نکل گئی تھی۔ اسے ایک ضروری کام سے مارکیٹ جانا تھا۔ اس نے اپنا جیب خرچ جمع کر کے کچھ رقم اکٹھی کر لی تھی اور آج وہ اس رقم سے اپنے محبوب کے لیے کوئی تحفہ خریدنا چاہتی تھی۔ مراد کے لیے ایک پینٹ اور شرٹ خریدنا چاہتی تھی۔ سوچ رہی تھی کہ جب مراد اسے ڈنر پر لے جانے کے لیے کالج آئے گا تو اسے سرپرائز دے گی۔ مراد کے لیے گفٹ خرید کر وہ بہت خوش تھی۔ جب وہ دل میں محبت اور امنگ لیے مارکیٹ سے نکلی تو درندے نے پیچھے سے اسے دبوچ لیا اور کوئی نشیلی چیز سنگھا کر اسے بے ہوش کر دیا۔ اس کے بعد کیا ہوا اسے کچھ پتہ نہیں تھا۔

سحرش کو وہ پورا منظر یاد آ گیا تھا۔ یہ سب یاد آنے کے بعد اس کی حالت اور نازک ہو گئی۔

"مراد! پلیز مجھے بچا لو...... کہاں ہو تم' تمہاری محبت کی وجہ سے اب تو میں نے جینا شروع کیا تھا۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔ پلیز آ جاؤ مجھے بچا لو۔" سحرش رو پڑی۔

روتے روتے سحرش کی نظر میز پر رکھے کاغذ پر

گئی۔ دور سے لگ رہا تھا کہ اس پر کچھ لکھا ہوا ہے۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے میز کی طرف بڑھی اور کانپتے ہاتھوں سے میز پر رکھے کاغذ کو اٹھالیا۔

جب وہ کاغذ پڑھنے لگی تو اس کے چہرے پر خوف کے سائے اور گہرے ہونے لگے۔

"ہائے سحرش۔ یہی نام ہے نا تمہارا؟ کیسی ہو تم؟ تم سے پوچھے بنا تم کو یہاں اٹھا لایا۔ سوری بالکل نہیں بولوں گا کیونکہ میں اپنی مرضی کا خود مالک ہوں۔ تم یہاں مراد کی وجہ سے ہو۔ اگر تم مراد کی محبوبہ نہ ہوتیں تو تم پر میرا دھیان ہی نہ جاتا۔ تم بہت خوبصورت ہو۔ میں نے تمہاری خوبصورتی بہت قریب سے دیکھی ہے۔ تم بے ہوش تھیں اس لیے تمہیں پتہ نہیں چلا۔ میرے فن کے لیے تم پرفیکٹ ہو۔ جتنی تم حسین ہو اتنی ہی حسین موت کی حقدار ہو۔ وہ بھی تمہارے عاشق کے سامنے۔ مراد کے سامنے پہلے میں تمہاری خوبصورتی سے کھیلوں گا۔ پھر میرا خنجر تمہارے بدن سے کھیلے گا۔ اوہ گھبرا گئیں۔ ارے گھبراؤ مت۔ ایک دن تو تم نے مرنا ہی ہے۔ میرے ہاتھوں مرو گی تو تمہاری روح تک خوش ہو جائے گی۔ میں تمہیں دکھاؤں گا کہ موت کیسے تمہارے نزدیک آتی ہے اور یقین کرو ایسی خوبصورت موت ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔ نہ ہی میں ہر کسی کو اس قابل سمجھتا ہوں لیکن اس پیاری سی موت کے لیے تم کو تھوڑا انتظار کرنا ہوگا۔ کیونکہ تمہارے عاشق کو بھی تو یہاں آنا ہے۔ تم بس اپنے چہرے پر خوف کے سائے پھیلائے رکھو۔ مجھے چہروں پر پھیلا ہوا خوف بہت اچھا لگتا ہے۔ باقی کا کام تم مجھ پر چھوڑ دو۔ تم بس انتظار کرو اس موت کا جو دھیرے دھیرے تمہاری طرف بڑھ رہی ہے۔"

ہاتھوں میں اتنی لرزش تھی کہ کاغذ اس ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اسے یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ اس کے ساتھ حقیقت میں یہ سب ہو رہا ہے۔ وہ دیوار کے سہارے گھٹنوں پر سر رکھ کر بیٹھ گئی۔

"مراد! کیا ہمارے خواب...... ہماری امیدیں سب یوں بکھر جائیں گی۔ کیا قدرت نے ہماری محبت کا یہی انجام لکھا ہے۔" سحرش بری طرح بلک رہی تھی۔

بیالیس انچ ایل ای ڈی اسکرین پر درندہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور محظوظ ہو رہا تھا۔

"بہت خوب سحرش۔ بہت ہی خوب۔ مجھے تم سے ایسے ہی خوف کی امید تھی۔ تمہارے خوف کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اب صرف مراد کو تمہارے پاس پہنچانے کا انتظار ہے۔ مگر تم فکر مت کرو۔ تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ تم آ گئی ہو تو تمہارے پیچھے پیچھے وہ بھی آ ہی جائے گا۔ ابھی تم میں اسے تڑپا رہا ہوں۔"

☆☆☆☆☆☆☆

راجو کے گھر میں سب ہی رفیق کا انتظار کر رہے تھے۔

"کہاں رہ گئے رفیق سر۔ زیادہ وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔" راجو نے کہا

"رفیق آتا ہی ہوگا۔ صبر کرو۔" شہلا بولی۔

دروازے پر دستک ہوتے ہی راجو نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔

"سر آپ کہاں رہ گئے تھے۔ ہمیں تو فکر لاحق ہونے لگی تھی۔"

"ہاں راجو بس تھوڑا وقت لگ گیا۔"

ایک بار پھر سب سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور اگلے دس پندرہ منٹوں تک اپنے پلان پر بحث کرتے رہے۔ اس کے بعد سب راجو کے گھر سے نکل کر اپنے مشن پر روانہ ہو گئے۔

رفیق اور شہلا' مونا کے ساتھ اس کے چینل کی گاڑی میں تھے' جبکہ وردا' راجو اور مراد دوسری کار میں ان کے پیچھے تھے۔

"اب تو تم بھیس بدلنے میں بھی ماہر ہو گئے ہو۔" شہلا نے رفیق سے کہا۔

"مگر کیا فائدہ ایسی مہارت کا۔ آپ نے تو پھر بھی مجھے پہچان لیا تھا۔"

"میری بات اور ہے۔ میں نے تمہاری آنکھوں سے پہچانا تھا۔"

وہ چاندنی رات مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ پہلی بار اتنے قریب آئے تھے ہم۔ جب جب ایسی رات آئے گی تو کیا آپ کو بھی میری یاد آئے گی۔" رفیق نے شہلا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اپنا خیال رکھنا رفیق اور فی الحال اپنا پورا دھیان اس مشن پر رکھو۔"

"ہم پہنچنے والے ہیں رفیق۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔" مونا نے کہا۔

"ہمت رکھو۔ یہ کام ہمیں ہر حال میں کرنا ہے۔" رفیق نے یہ کہہ کر مراد کو فون ملایا۔ "مراد میں مونا کے ساتھ اندر جا رہا ہوں۔ تم پیچھے رکنا۔ چاروں طرف دھیان رکھنا۔"

شہلا نے رفیق کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "ٹیک کیئر۔"

"آپ کو ہر وقت ہوشیار رہنا ہوگا۔ ہمیں ابھی یہ پتہ نہیں ہے کہ ہم کس آگ سے کھیل رہے ہیں۔ ہمارے پاس وقت کم تھا اس لیے اس پلان پر عمل کر رہے ہیں۔ ویسے آپ کے لیے خطرہ کچھ کم ہے۔ کیونکہ یہاں ڈیوٹی پر موجود پولیس والے آپ کو اچھی طرح جانتے ہیں۔"

"امید ہے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہارا پلان اچھا ہے۔ خود سیبے پر وامت ہونا۔" شہلا نے کہا۔

شہلا کو گاڑی میں چھوڑ کر رفیق اور مونا ایس پی کے بنگلے کی طرف بڑھنے لگے۔ مونا کے ہاتھ میں مائیک تھا اور رفیق کے ہاتھ میں کیمرہ۔

"گیٹ کھولو۔ ہمیں ایس پی صاحب کا انٹرویو کرنا ہے۔" مونا نے گیٹ پر کھڑے سیکورٹی گارڈ سے کہا۔

"ایس پی صاحب کسی کو انٹرویو نہیں دیتے۔ یہ بات آپ کو معلوم ہونا چاہئے۔ کیونکہ آپ پہلے بھی آ چکی ہیں۔" گارڈ بولا۔

'ایک لڑکی دلہن بننے سے پہلے ہی سر عام شادی کی تقریب میں قتل کر دی گئی اور پولیس سو رہی ہے۔ ہمیں ایس پی صاحب کا جواب چاہئے ورنہ ہم خبر چلا دیں گے کہ ایس پی صاحب کتنے نالائق اور نااہل آفیسر ہیں۔ انہیں بتانا ہوگا کہ اب تک درندے کو گرفتار کیوں نہیں کیا گیا۔"

درندہ ایس پی اپنے بیڈ روم میں ایل ای ڈی پر سحرش کو دیکھ دیکھ کر محظوظ ہو رہا تھا۔ دروازے پر دستک سن کر چونک گیا' اس نے ٹی وی بند کیا اور اپنے ہاتھ میں تھاما ہوا خنجر ایک دراز رکھ کر دروازہ کھولا اور چلا کر بولا۔ "کیا بات ہے۔ کتنی بار کہا ہے مجھے ڈسٹرب مت کیا کرو۔"

"سر باہر میڈیا والے آئے ہیں۔" سپاہی نے کہا۔

"جانتا ہوں۔ سی سی ٹی وی کیمرے میں نے شوقیہ نہیں لگا رکھے ہیں۔ انہیں یہاں سے دفعہ کرو۔" ایس پی گرج کر بولا۔

"سر وہ رپورٹر بول رہی ہے کہ اگر آپ نہیں ملیں گے تو وہ ٹی وی پر نیوز چلا دے گی کہ آپ کتنے نالائق اور نااہل آفیسر ہیں۔ وہ درندے کے کیس کے بارے میں معلومات چاہتی ہے۔"

"ٹھیک ہے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔ لیکن

ان سے کہہ دینا کہ اپنا کیمرہ بند رکھیں اور میری ویڈیو لینے کی کوشش نہ کریں۔" ایس پی نے کہا۔
"اوکے سر۔"
رفیق اور مونا ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔ مونا بہت گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی اور اپنے اس ڈر کو وہ مسکراہٹ کے پردے میں چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔
"اس نے کیمرہ بند رکھنے کے لیے کیوں کہا ہے؟" مونا نے رفیق کی طرف دیکھ کر دھیرے سے کہا۔
"اسے ڈر ہے کہ کہیں وردا اسے ٹی وی پر دیکھ کر پہچان نہ لے۔" رفیق نے وجہ بتائی۔
"اب سمجھ میں آیا وہ انٹرویو دینے سے کیوں کتراتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ ایکسپوز ہونے سے بہت ڈرتا ہے۔"
"ہر مجرم ڈرتا ہے۔ یہ ایک فطری ردعمل ہے۔" رفیق نے کہا۔
"کہیں اسے ہم پر شک تو نہیں ہو جائے گا" مونا اپنے خوف کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔
"تم الٹی سیدھی سوچیں اپنے ذہن سے نکال کر صرف انٹرویو پر دھیان دو۔"
کچھ دیر بعد ایس پی صاحب بڑے رعب سے کمرے میں داخل ہوئے۔
اس کو آتا دیکھ کر مونا اور رفیق ایسے کھڑے ہو گئے جیسے اس کا احترام کر رہے ہوں۔
"گڈ ایوننگ سر۔ میں اپنے نیوز چینل کے لیے آپ کا انٹرویو کرنا چاہتی ہوں۔" مونا بولی۔
"اور میرا انٹرویو کرنے کے لیے آپ کو یہ رات کا ہی وقت ملا تھا۔" ایس پی نے ہنستے ہوئے کہا۔
"سر ساری حدیں ختم ہوتی جا رہی ہیں۔ شادی کی تقریب میں درندے نے دلہن کو اپنی درندگی کا نشانہ بنایا۔ اس کا نام ریما تھا۔ آپ یہ بتائیں کہ آپ کی پولیس فورس اس درندے کو ڈھونڈنے میں اب تک ناکام کیوں رہی ہے۔ پورا شہر خوف کے سائے تلے سانس لے رہا ہے۔ آخر یہ کب تک چلتا رہے گا؟"
"ہم سے غلطی ہو گئی تھی کہ ہم نے درندے کا کیس ایک قابل پولیس افسر سمجھ کر انسپکٹر رفیق کو دے دیا تھا۔ اس نے درندے کے کیس میں کوئی کارکردگی نہیں دکھائی۔ ہم اپنی غلطی کو سدھارنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اب ایک ہونہار انسپکٹر یہ کیس ڈیل کر رہا ہے۔ اس نئے انسپکٹر کا نام سکندر ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ جلد از جلد ہمیں کسی نہ کسی کامیابی کی نوید سنائے گا۔"
"وہ تو اندھیرے میں اکیلے گھومتے رہتے ہیں سر۔ خود کو رات کا راہی کہتے ہیں۔ وہ کسی کامیابی کی نوید کیا سنائیں گے۔" رفیق نے بیچ میں دخل دیتے ہوئے کہا۔
"آپ کون ہیں؟" ایس پی نے رفیق سے پوچھا۔
"سر یہ میرا کیمرہ مین ہے۔" مونا بولی۔
"اوکے۔ اس سے کہو بیچ میں نہ بولے۔ سکندر بہت ذہین انسپکٹر ہے۔ وہ ضرور کامیاب ہو گا اور ہمارے ڈپارٹمنٹ کی بھی پوری توجہ اسی کیس پر ہی ہے۔"
"سر آپ کے پیچھے جو پینٹنگ ٹنگی ہوئی ہے کیا میں اسے قریب سے دیکھ سکتا ہوں۔ بہت اچھی پینٹنگ لگ رہی ہے۔" رفیق بولا۔
"نہیں، جس کام کے لیے آئے ہو اس پر دھیان دو۔" ایس پی نے سخت لہجے میں کہا۔
"سوری سر۔ میں بس ویسے ہی۔" رفیق چپ

ہو گیا۔

"سر ایک بہت ہی خفیہ بات ہے۔ کیا آپ کے پاس آ کر بتاؤں۔ کیونکہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔" مونا بولی۔

"ہاں آؤ اور بلا جھجک بتاؤ۔ کیا بات ہے۔"

مونا ایس پی کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

"سر مجھے لگتا ہے کہ انسپکٹر رفیق ہی درندہ ہے۔ آپ کو کیا لگتا ہے۔" مونا نے رازداری سے کہا۔

"ویسے تو اس پر شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے مگر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

مونا اپنے پلان پر عمل کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھی۔ اس کے رائٹنگ پیڈ کے نیچے ہاتھ میں انجکشن تھا۔

"سر وہ تصویر کس کی ہے۔" مونا نے دیوار پر ٹنگی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ایس پی نے جیسے ہی گردن گھمائی' مونا حرکت میں آ گئی اور انجکشن ایس پی کی گردن میں لگانے ہی والی تھی کہ ایس پی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"پیچھے میری تیسری آنکھ بھی ہے۔" ایس پی غرا کر بولا۔ اس کے اندر کا درندہ پھر بیدار ہو چکا تھا۔

رفیق فوراً حرکت میں آیا مگر ایس پی نے پستول نکال کر رفیق پر فائر کیا اور تین گولیاں رفیق کے سینے میں گڑ گئیں۔ سائیلنسر ہونے کی وجہ سے صرف کارک کھلنے جیسی آواز ہی ابھری تھی۔

"رفیق۔" بوکھلاہٹ میں مونا رفیق کا نام لے کر چلائی۔

"ہوں۔ رفیق۔ اب آئی نا پوری بات سمجھ میں۔ تمہارا تو میں وہ حال کروں گا کہ تمہاری روح بھی پچھتائے گی کہ اسے تمہارے جسم میں کیوں بھیجا گیا۔" ایس پی نے مونا سے کہا۔

اچانک مونا نے اپنی لات گھمائی اور ایس پی پیٹ پر لات پڑنے سے پیچھے کی طرف گرا مگر اس نے فوراً پستول مونا کی طرف تان لیا۔

"بس اب کوئی اور حرکت مت کرنا ورنہ تمہاری کھوپڑی میں چڑیا برابر جو بھیجہ ہے وہ نہیں رہے گا۔"

ایس پی فرش سے اٹھا اور مونا کی طرف بڑھا۔

"اب تمہاری پینٹنگ بھی بنے گی۔ مجھ پر ہاتھ اٹھانے والے کو میں زندہ نہیں چھوڑتا۔"

اچانک ایس پی کو اپنی گردن میں سوئی کی چبھن محسوس ہوئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو اس کے پیچھے رفیق کھڑا تھا۔

انجکشن لگتے ہی ایس پی کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے اور پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ "یہ...... تم نے...... مجھے کیا لگا...... دیا ہے۔" وہ بے ربط لہجے میں بولا۔

"یہ کلر زیرو سیون انجکشن ہے۔ یہ تمہارے اندرونی اعضاء کو تباہ کر کے رکھ دے گا۔ ابتداء تو ہو چکی ہے۔ تیس منٹ بعد تم تڑپ تڑپ کر جان دے دو گے۔" رفیق سنگدلی سے بولا۔

"یو...... باسٹر...... ڈ...... میں...... تمہیں چھوڑوں گا...... نہیں۔"

"اپنی فکر کر درندے۔ اگر دس منٹ کے اندر اندر تمہیں اس کا اینٹی ڈوٹ انجکشن نہیں لگا تو یہ تمہیں تڑپا تڑپا کر مار دے گا۔ اس کے بعد ہر پندرہ منٹ بعد تم کو ایک اینٹی ڈوٹ کی ضرورت پڑے گی۔ اس کا مکمل اثر ختم کرنے کے لیے تم کو دس اینٹی ڈوٹ لینی ہوں گی۔ تب جا کر تمہاری جان بچ سکتی ہے اور ہاں میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ یہ کلر زیرو سیون انجکشن امپورٹڈ ہے۔ یہاں پر نہ یہ انجکشن ملے گا اور نہ ہی اس کا اینٹی ڈوٹ۔ یہ انجکشن بھی میرے پاس ہے اور

اینٹی ڈوٹ بھی۔'' رفیق کی باتیں سن کر دوسروں کو دہشت میں مبتلا کرنے والا درندہ خود دہشت کا شکار ہو رہا تھا اور جو خوف وہ اپنے شکار کے چہرے پر دیکھ کر لطف اندوز ہوتا تھا وہ خوف خود اس کے چہرے سے چھلک رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں ایس پی کے منہ سے خون نکلنے لگا اور خون دیکھ کر خوف کی پرچھائیں مزید دبیز ہوتی گئیں۔

''واہ کیا بات ہے۔ کتنا خوبصورت خوف ہے آپ کے چہرے پر۔ جلدی سے بتاؤ سحرش کہاں ہے ورنہ تمہیں کوئی اینٹی ڈوٹ نہیں ملے گی۔'' رفیق نے اس کی حالت کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

''مجھے پہلی اینٹی ڈوٹ دو پھر بتاؤں گا۔'' درندہ پہلے اپنی زندگی کی فکر کر رہا تھا۔

''ایسے نہیں ملے گی۔ جلدی بتاؤ ورنہ تم ترستے ہی رہ جاؤ گے اینٹی ڈوٹ کے لیے۔'' رفیق نے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ بتاتا ہوں۔ آہ......'' ایس پی کراہتے ہوئے بولا۔

ایس پی نے اس جگہ کا پتہ بتا دیا جہاں اس نے سحرش کو قید کر رکھا تھا۔

''ویری گڈ۔ اب دس منٹ میں جنگل پہنچو۔ پہلی اینٹی ڈوٹ تمہیں وہیں ملے گی۔ یہ پین اپنی جیب میں رکھنا۔ اس میں اسپائی کیمرہ لگا ہوا ہے۔ تم نے کوئی بھی ایسی ویسی حرکت کی تو میرا موڈ خراب ہو جائے گا۔ اور میں ساری اینٹی ڈوٹ ضائع کر دوں گا۔'' رفیق اسے جتاتے ہوئے بولا۔

''میں دس منٹ میں جنگل نہیں پہنچ سکتا۔'' ایس پی گڑگڑایا۔ وہ جو دوسرے کے گڑگڑانے کا مزا لیا کرتا تھا' آج خود موت کے خوف سے گڑگڑانے پر مجبور تھا' شاید اس لیے کہ وہ مکافاتِ عمل کو بھول گیا تھا۔

''وہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔ چلو مونا۔''

''مجھے پہلی اینٹی ڈوٹ تو دے دو۔ آہ......'' ایس پی درد سے کراہ رہا تھا۔

''میں نے کہا نا جنگل میں پہنچنے سے پہلے نہیں ملے گی۔ تمہارا کھیل ختم ہوا درندے۔ اب ہماری باری ہے۔''

رفیق نے جیسے ہی ایس پی کی جیب میں پین لگایا' باہر گاڑی میں بیٹھی ہوئی شہلا لیپ ٹاپ پر براہ راست اندر کا نظارہ دیکھنے لگی۔

''گریٹ۔ پلان کامیاب رہا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ایس پی صاحب چپ چاپ جنگل پہنچتے ہیں یا نہیں۔ مجھے امید ہے کہ سحرش کا پتہ تو تم نے لگا ہی لیا ہوگا۔'' شہلا نے مسکراتے ہوئے سوچا۔

رفیق اور مونا ایس پی کے ڈرائنگ روم سے نکل کر گیٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

''شکر ہے میں نے بلٹ پروف جیکٹ پہن رکھی تھی۔ نہیں تو آج میں گیا تھا کام سے۔'' رفیق نے ہلکی آواز میں کہا۔

''تمہیں کیا لگتا ہے۔ کیا وہ جنگل میں آئے گا۔'' مونا نے پوچھا۔

''اسے آنا ہی پڑے گا۔ ہم نے اپنا کام کر دیا ہے۔ اب انتظار کرو اور دیکھو کہ آگے کیا ہوتا ہے اور اگر وہ جنگل میں نہیں آیا تب بھی اس کی موت تو یقینی ہے ہی۔ اسے کوئی نہیں بچا سکتا۔ کلرز زیرو سیون سے آج تک کوئی نہیں بچا۔ یہ انجکشن زیادہ تر بین الاقوامی جاسوس استعمال کرتے ہیں۔ بہت خفیہ ہتھیار ہے اور اتنا ہی خطرناک بھی۔'' رفیق نے بتایا۔

''تم اس کے بارے اتنا کچھ کیسے جانتے ہو اور یہ انجکشن تم کو ملا کہاں سے۔''

"میرا ایک خاص دوست فرنچ خفیہ ایجنسی میں کام کرتا ہے۔ پچھلے سال وہ کسی کام سے پاکستان آیا ہوا تھا۔ اسی نے مجھے یہ انجکشن اور اس کی معلومات فراہم کی تھی۔ تب میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ کبھی اسے استعمال کرنے کی نوبت بھی آئے گی۔ مگر میں نے اسے سنبھال کر رکھ لیا تھا اور دیکھ لو آج وہ کام آ گیا۔" رفیق نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

باتیں کرتے ہوئے رفیق اور مونا گیٹ سے باہر آ گئے۔ وہ چینل کی گاڑی میں گھسے ہی تھے کہ شہلا بولی۔ "تم کیمرہ تو ٹھیک سے لگایا تھا نا۔"

"ہاں۔ کیوں کیا ہوا؟"

"کوئی ویڈیو نہیں آ رہی۔ مشکل سے ایک ڈیڑھ منٹ ویڈیو آئی پھر بند ہو گئی۔"

"کیا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" رفیق نے حیران ہو کر کہا۔

"ضرور ایس پی صاحب نے کیمرے میں کوئی ہیرا پھیری کی ہے۔" مونا بولی۔

"مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔" شہلا نے اس کی تائید کی۔

"اب کیا ہو گا رفیق۔ اب ہمیں یہ پتہ نہیں چل پائے گا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔" مونا بولی۔

"تم لوگ فکر مت کرو۔ اس کی زندگی ہماری مٹھی میں ہے۔ ہم۔" رفیق بولتے بولتے رک گیا کیونکہ شہلا نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ "اوہ مائی گاڈ۔ یہ تو سحرش ہے۔"

رفیق نے فوراً لیپ ٹاپ کی اسکرین پر دیکھا۔ "ہو سکتا ہے۔ میں سحرش سے کبھی ملا نہیں۔ وہی ہو گی۔"

"اس نے سحرش کی یہ کیا حالت بنا دی ہے۔ اسے جانوروں کی طرح باندھ کر برہنہ کر رکھا ہے۔ میں نہیں دیکھ سکتی۔" مونا نے منہ پھیر لیا۔

"آخر یہ چاہتا کیا ہے۔ کیا اسے اپنی جان پیاری نہیں ہے۔" شہلا نے کہا۔

"وہ درندہ ہے۔ وہ کب کیا کرے گا یہ ہم کبھی نہیں جان سکتے لیکن جو بھی ہو وہ کلرز زیرو سیون سے تو نہیں بچے گا۔"

"مگر سحرش کا کیا ہو گا؟" شہلا نے سوال کیا۔

"ہم اسے کچھ نہیں۔" اور اس بار موبائل کی بیل نے رفیق کی بات کاٹ دی۔ "ہیلو۔"

"آہ...... مسٹر مغلِ اعظم۔ کمال کر دیا تم نے۔ بہت سنا تھا کلرز زیرو سیون کے بارے میں۔ وہ تم نے مجھ پر استعمال کر لیا۔ تم نے بہت اعلیٰ گیم کھیلی ہے میرے ساتھ آہ......"

"ہماری گیم اچھی لگی نا۔ ابھی تو شروعات ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔" رفیق نے کہا۔

"آگے جو بھی ہو گا۔ میری مرضی سے ہو گا۔ یہ گیم اب میرے طریقے سے آگے بڑھے گی۔ تم سحرش کی ویڈیو دیکھ رہے ہو گے۔ بیچاری میرے فن کا نمونہ بننے کے لیے بہت بے چین ہو رہی ہے۔ دس منٹ بعد میں اسے آرٹ کا نمونہ بنانے کے لیے اس کے پاس پہنچ رہا ہوں۔ اگر اسے زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو ساری اینٹی ڈوٹ مجھے دے دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اسے کچھ نہیں ہو گا۔ ایڈریس تو تمہیں میں نے بتا ہی دیا تھا۔ اینٹی ڈوٹ لے کر وہیں پہنچ جاؤ۔ نہیں آئے تو نتیجہ بہت برا ہو گا۔ میں تو مروں گا ہی مگر تمہارے اور تمہارے دوست مراد کے لیے اپنے فن کا ایسا نمونہ چھوڑ جاؤں گا جسے تم دونوں زندگی بھر بھلا نہیں سکو گے۔" درندے نے یہ کہہ کر فون کاٹ دیا۔

"کیا ہوا رفیق۔ کیا یہ ایس پی کا فون تھا۔" شہلا نے پوچھا۔

''ہاں۔ وہ یہ گیم اپنے طریقے سے کھیلنا چاہتا ہے۔ وہ ساری اینٹی ڈوٹ ایک ساتھ حاصل کرنا چاہتا ہے اوراس کے بدلے میں سحرش کو چھوڑنے کے لیے تیار ہے۔ مجھے اینٹی ڈوٹ کے ساتھ اسی جگہ پر بلایا ہے جہاں اس نے سحرش کو قید کر کے رکھا ہوا ہے۔''

''کہاں ہے سحرش؟'' شہلا نے پوچھا۔

''سجاول کی طرف جو راستہ جاتا ہے اسی پر ایک فارم ہاؤس میں سحرش کو قید کیا ہوا ہے۔ صحیح لوکیشن کا مجھے نہیں پتہ۔'' رفیق بولا۔

''اب تمہارا کیا ارادہ ہے۔''

''اس وقت ہمارے لیے سب سے اہم سحرش کی زندگی ہے۔ ایس پی درندہ ہے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ فی الحال تو وہ بھی یہیں ہے اور ہم بھی یہیں ہیں۔ ہمیں اس سے پہلے فارم ہاؤس پہنچنا ہوگا۔ چلو جلدی۔ مونا تم ہٹو میں ڈرائیو کرتا ہوں۔'' رفیق نے مونا کی جگہ ڈرائیونگ سنبھال کر گاڑی آگے بڑھا دی اور مراد کو فون پر ساری بات تفصیل کے ساتھ بتادی اور یہ بھی اسے اب کہاں آنا ہے۔

''رفیق ہم سب کا ایک ساتھ وہاں جانا مناسب نہیں ہے۔ پتہ نہیں اس نے کیا گیم پلان کی ہوئی ہے۔ وہاں ہم دونوں ہی چلتے ہیں۔'' مراد نے کہا۔

راجو ان کی باتیں سن رہا تھا فوراً بول پڑا۔ ''ایسے کیوں بول رہے ہو استاد۔ مجھے ایک دم سے پرایا کر دیا تم نے۔ میں بھی ساتھ چلوں گا۔''

''راجو سچویشن ہمارے کنٹرول میں نہیں ہے اور ہم جانتے ہیں کہ وہ گیم کھیلنے کا ماہر ہے۔ کب کیا گیم کھیل جائے یہ ہم آخر وقت تک نہیں جان سکتے اور وردا کے ساتھ بھی تو کسی کا ہونا ضروری ہے۔'' مراد نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''وردا کو اس کے گھر ڈراپ کر دیتے ہیں۔ وہاں سیکورٹی تو ہے۔'' راجو بولا۔

''نہیں۔ میں بھی تمہارے ساتھ ہی رہوں گی۔ گھر میں مجھے زیادہ ڈر لگے گا اور سارا دھیان تم پر ہی اٹکا رہے گا اور تم لوگوں نے یہ ٹیم کیا مذاق کرنے کے لیے بنائی ہے۔ میں گھر نہیں جاؤں گی۔ سن لیا تم دونوں نے اور جو زخم درندے نے مجھے دیئے ہیں وہ تب ہی بھریں گے جب میں اسے اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے ہوئے دیکھوں گی۔'' وردا مضبوط لہجے میں بول رہی تھی۔

ادھر رفیق فون پر ساری باتیں سن رہا تھا۔ ''یار کوئی مجھ سے بھی بات کر لے۔''

''اوہ سوری۔ میں بھول گیا تھا کہ تم فون پر ہو۔ میں راجو اور وردا کے ساتھ باتوں میں لگ گیا تھا۔'' مراد نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں میں تم لوگوں کی باتیں سن رہا تھا۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ ہم سب ایک ساتھ وہاں نہ جائیں۔ ہم دونوں چلتے ہیں۔ باقی لوگ محفوظ جگہ پر رک جائیں۔'' رفیق بولا۔

''میں کہیں نہیں رک رہی ہوں۔ بھول گئے، تم نے کہا تھا کہ آپ خود گولی ماریں گی درندے کو۔ آج وہ موقع آیا ہے تو مجھے ساتھ نہیں رکھنا چاہتے۔'' شہلا طیش میں بولی۔

''میڈم آپ سو فیصد فٹ نہیں ہیں۔ اور آپ ساتھ ہوں گی تو ہمارا دھیان آپ پر ہی رہے گا۔'' رفیق نے کہا۔

''میڈم پر دھیان کیوں رکھو گے؟'' مونا کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔

''ارے میری باس ہیں۔ ان پر دھیان نہیں رکھوں گا تو سسپنڈ کر دیں گی۔ سمجھا کرو۔'' رفیق

بات کو گھماتا ہوا بولا۔

''لیکن میرے خیال سے میڈم ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ہم سب وہاں چلیں گے۔ میرے لیے یہ اسٹوری بہت اہم ہے۔ میڈیا میں میرے نام کی دھوم مچ جائے گی۔ ایسی کوریج آج تک کسی رپورٹر نے نہیں کی ہوگی۔''

''رفیق اب کیا کریں۔ کوئی بھی رکنے کو تیار نہیں ہے۔ وہاں بہت خطرہ ہے۔ لیکن کوئی اس خطرے کو سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں ہے۔'' مراد نے کہا۔

''ہمارے پاس کسی کو کہیں ڈراپ کرنے کا وقت بھی نہیں ہے۔ ہمیں فوراً سے پیشتر اس فارم ہاؤس پر پہنچنا ہے۔ اگر فل اسپیڈ سے چلیں گے تب بھی ہمیں آدھا گھنٹہ تو لگ ہی جائے گا۔ چلو جیسی دوستوں کی مرضی۔ سب ہی چلتے ہیں۔ جو ہوگا دیکھی جائے گی۔'' رفیق بولا۔

تو پھر ایسا کرتے ہیں کہ ایک ہی گاڑی میں آجاتے ہیں سب۔ الگ الگ رہنے سے مشکل پیش آسکتی ہے۔ تم چینل کی گاڑی روکو ہم اسی میں آجاتے ہیں۔ اس میں جگہ کافی ہے۔'' مراد نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ میں گاڑی روک رہا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے رفیق نے وین روک دی۔

مراد نے کار سڑک کنارے پارک کردی اور تینوں بھاگتے ہوئے مونا کی وین میں آگئے۔

وین میں بیٹھتے ہی مراد کی نظر لیپ ٹاپ کی اسکرین پر پڑی۔ سحرش ڈری سہمی ایک کونے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ سحرش کو اس حال میں دیکھ کر مراد چلا اٹھا۔ ''سحرش! اوہ میرے خدا۔ اس نے میری سحرش کا یہ کیا حال بنا دیا ہے۔ رفیق تم نے بتایا نہیں کہ لیپ ٹاپ پر سحرش کی لائیو کوریج آرہی ہے۔'' بولتے بولتے مراد کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''کیسے بتاتا یار۔ یہ سب ہم سے ہی نہیں دیکھا گیا تو تم کو کیسے بتاتے۔''

''تو کلرز زیرو سیون کسی کام نہیں آیا۔ ہم اس کے ساتھ گیم کھیلنے چلے تھے۔ مگر اب خود اس کی گیم میں پھنستے نظر آرہے ہیں۔'' مراد سحرش کو اس حال میں دیکھ کر رونے جیسا ہو گیا تھا۔

''ایسا نہیں ہے۔ وہ سحرش کی وجہ سے مذاکرات کر رہا ہے۔'' رفیق نے بتایا۔

''ہاں۔ مگر ہمارے کنٹرول میں تو کچھ نہیں ہے نا۔ یہ گیم شروع ہم نے کی تھی۔ مگر اب کنٹرول وہ کر رہا ہے۔'' مراد بولا۔

''ہاں وہ بھی اس لیے کہ ہمیں سحرش کی فکر ہے۔ اگر سحرش اس کے قبضے میں نہ ہوتی تو ہم آج اسے گیم کھیلنا سکھا دیتے۔'' رفیق نے اپنی مجبوری بتاتے ہوئے کہا۔

''اس کی جان خطرے میں ہے۔ پھر بھی گیم کھیلنا چاہتا ہے۔ بہت ہی کمینہ ہے وہ۔ پتہ نہیں کس مٹی کا بنا ہوا ہے۔'' راجو نفرت سے بولا۔

''درندہ ہے نا۔ اپنی عادت سے مجبور ہے۔'' رفیق نے کہا۔

''ارے اسکرین سے ویڈیو غائب ہو گئی۔'' مراد چونک کر بولا۔

''وہ درندہ ہر لمحے اپنی چال بدلتا رہتا ہے۔ اسی لیے تو ہاتھ نہیں آتا۔ سالا ایک منٹ بھی چین سے نہیں بیٹھتا۔''

''اس نے ویڈیو کیوں بند کر دی؟'' شہلا نے پوچھا۔

''یہ تو وہی بتا سکتا ہے۔ اب وہیں جا کر پتہ چلے گا کہ کیا ماجرا ہے۔'' رفیق نے ایک موڑ کاٹتے ہوئے کہا۔

"وہ جگہ بہت سنسان ہے رفیق۔ اور ارد گرد چھوٹی بڑی پہاڑیاں بھی ہیں۔ ہمیں ہر پل ہوشیار رہنا ہوگا۔" مراد نے علاقے کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔

پندرہ منٹ بعد وہ اس فارم ہاؤس کے نزدیک پہنچ گئے۔ اچانک رفیق نے وین دائیں طرف موڑ کر کچے میں جھاڑیوں کے بیچ گھسا دی۔

"کیا کر رہے ہو؟" شہلا نے اسے ٹوکا۔

"یہاں سے دس منٹ کا راستہ ہے۔ وہاں تک پیدل جاؤں گا۔ وین لے کر فارم ہاؤس کے زیادہ نزدیک جانا ٹھیک نہیں ہوگا۔ تم سب لوگ اپنے اپنے موبائل چیک کرو۔ سگنل ہیں کہ نہیں۔ مراد تم جھاڑیوں کے بیچ میں سے ہوتے ہوئے وہاں پہنچنا اور چوکس رہنا۔" رفیق نے ٹیم کو کمانڈ کرنا شروع کر دیا۔

"کیا تم وہاں اکیلے جاؤ گے۔" شہلا نے پوچھا۔

"ہاں اس نے اینٹی ڈوٹ کے ساتھ مجھے ہی بلایا ہے۔ میں سامنے کے راستے سے جاؤں گا اور مراد پیچھے نظر رکھے گا۔ اپنے اپنے پستول نکال کر ہاتھ میں لے لو۔ ہمارا سامنا کس چیز سے ہونے والا ہے ہمیں خود نہیں پتہ۔ او کے۔" رفیق نے بیگ سے اینٹی ڈوٹ نکال کر جیب میں رکھی اور وین کا دروازہ کھولنے لگا

"رفیق۔" شہلا نے آواز دی۔

"جی میڈم۔"

"اپنا خیال رکھنا۔"

"آف کورس۔" وہ جھاڑیوں سے باہر آ گیا اور فارم ہاؤس کی طرف بڑھنے لگا۔

چاندنی رات تھی۔ اس لیے چاروں طرف روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ مگر ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ نہ آدم نہ آدم زاد۔ دور کہیں سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ سناٹا بھی ایسا کہ کمزور دل انسان تو برداشت ہی نہ کر پائے۔ سڑک دور تک سنسان نظر آ رہی تھی۔

مراد دبے پاؤں جھاڑیوں کے راستے فارم ہاؤس کے پیچھے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ ہاتھ میں پستول لیے ایک دم چوکنا نظر آ رہا تھا لیکن آنکھوں میں سحرش کا چہرہ گھوم رہا تھا اور دل میں ایک صدا تھی کہ "میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ کچھ نہیں ہونے دوں گا۔"

رفیق تیز قدموں سے چلتا ہوا دس منٹ میں اس فارم ہاؤس کے گیٹ پر پہنچ گیا۔ فارم ہاؤس کافی بڑا تھا اور چاروں طرف دیواریں تھیں جن کی اونچائی زیادہ نہیں تھی۔

مراد دیوار پھلانگ کر اندر آ گیا اور جھاڑیوں میں چھپتے چھپاتے اس چھوٹے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔

رفیق بھی پوری ہوشیاری سے چاروں طرف دیکھتا ہوا اس کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا۔ مراد کمرے کے بائیں طرف اور رفیق دائیں طرف تھا۔ دونوں دیوار سے لگتے ہوئے ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔

دروازہ کھلتے ہی رفیق اور مراد پستولیں تان کر کمرے کے اندر گھس گئے۔

"یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔" مراد کمرے میں نظریں دوڑاتا ہوا بولا۔

"ایک منٹ۔ غور کرو۔ یہ وہی کمرہ ہے جس میں اس نے سحرش کو رکھا ہوا تھا۔" رفیق نے کمرے کو پہچانتے ہوئے کہا۔

"اوہ ہاں اور وہ دیکھو دیوار پر کیمرہ بھی لگا ہوا ہے۔"

"آخر یہ حرامی چاہتا کیا ہے۔" مراد نے کہا۔

"وہ ہم سے پہلے ہی یہاں آ چکا ہے۔ اور کچھ نہ کچھ کر کے گیا ہے۔ کیا کر کے گیا ہے۔ یہی سوچنے کی

بات ہے۔" بولتے بولتے رفیق کی نظر کمرے کے ایک کونے میں رکھے ڈسٹ بن پر گئی اور وہ چونک کر مراد سے بولا۔ "اوہ میرے خدا..... مراد نکلو یہاں سے۔ اس نے شاید بم فٹ کیا ہوا ہے۔"

ان دونوں نے بھاگ کر کمرے سے باہر قدم رکھے ہی تھے کہ ایک دھماکے کے ساتھ زمین لرز اٹھی۔ بہت زبردست دھماکہ تھا۔

"یہ کیسی آواز تھی؟" وردا نے کہا۔

"یہ تو بم بلاسٹ کی آواز ہے۔" شہلا نے فوراً جواب دیا۔

"ہاں میڈم مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔ میں دیکھتا ہوں۔" راجو اٹھنے لگا۔

"میں وہاں جا رہی ہوں۔" شہلا نے کہا۔

"نہیں میڈم۔ آپ یہیں رکیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ آخر بات کیا ہے۔"

"تم یہیں رکو گے۔ میں جا کر دیکھتی ہوں۔" شہلا نے اپنی افسری دکھاتے ہوئے کہا۔

"میڈم میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔" مونا بولی۔

"کیا تم پستول چلا سکتی ہو؟" شہلا نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ پستول کے ساتھ ہاتھ پیر بھی چلانے آتے ہیں۔" مونا نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ چلو۔"

فارم ہاؤس کا منظر بہت ہی برا تھا۔ رفیق اور مراد خون میں لت پت زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ وہ دونوں کمرے سے باہر نکلنے میں تو کامیاب ہو گئے تھے۔ مگر پھر بھی دھماکے کی زد میں گئے تھے۔ دونوں کی پستولیں ہاتھ سے چھوٹ چکی تھیں اور انہیں یہ بھی ہوش نہیں تھا کہ وہ اس وقت کہاں پڑے ہیں۔

مراد نے پلکیں جھپکاتے ہوئے آنکھ کھولی تو اس کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں پھیلنے لگیں۔

"رفیق۔ وہ آ رہا ہے۔ تمہاری گن تو ہے نا تمہارے پاس۔ میری گن تو پتہ نہیں کہاں ہے۔"

"آہ......" رفیق کراہتے ہوئے بولا۔ "میری گن بھی پتہ نہیں کہاں ہے۔ مجھ سے تو اٹھا بھی نہیں جا رہا۔"

"ہمیں اٹھنا ہی ہوگا۔ اپنے دائیں طرف دیکھو۔ وہ ہماری طرف ہی آ رہا ہے۔" مراد نے کہا۔

رفیق نے دائیں طرف گردن گھما کر دیکھا۔ "تم صحیح کہہ رہے ہو۔ اسے شاید اینٹی ڈوٹ مل گیا ہے۔ وہ صرف ہمیں یہاں بلانے کے لیے ڈرامے بازی کر رہا تھا۔"

درندہ بڑے اسٹائل سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بیس بال کا بیٹ تھا۔

"کیسا لگ رہا ہے تم دونوں کو۔ امید کرتا ہوں کہ تم دونوں خود کو بڑا اچھا محسوس کر رہے ہو گے۔ بم بلاسٹ کا حصہ بننا بھی کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔" درندہ مزے لیتا ہوا بولا۔

"تمہیں اینٹی ڈوٹ کہاں سے ملا۔" رفیق نے کراہتے ہوئے پوچھا۔

"تم نے میرے ساتھ بہت اعلیٰ گیم کھیلا تھا اور میں تو تقریباً تمہاری اس گیم میں پھنس ہی چکا تھا۔ مگر میں نے ہوش سے کام لیا۔ سب سے پہلے تو اپنی جیب سے تمہارا اسپائی پین ہٹایا۔ پھر اپنے دوست ڈاکٹر شکیل کو فون کیا۔ ویسے تو کلرز ریوسیون خفیہ ہتھیار ہے مگر ڈاکٹر شکیل کو اس کا توڑ معلوم تھا۔ اس کا گھر میرے گھر سے نزدیک ہی ہے۔ اس نے فوراً مجھے ماسٹر ڈوز دیا۔ بس اس سے بات بن گئی۔ کیوں کیسی رہی۔" درندے کی مکروہ ہنسی فضا میں گونجنے لگی۔

"بہت خوب رہی لیکن جو بھی ہو۔ آج تم نے ثابت کر دیا ہے کہ تم نامرد ہو۔ دھوکے سے ہمیں بم

بلاسٹ کا نشانہ بنایا اور اب کسی بزدل کی طرح ہمارے پہلے سے ٹوٹے جسموں کا کچومر بنارہے ہو ۔" رفیق سیٹلز کرتے ہوئے کہا۔

"خاموش۔ زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم نہیں جانتے کہ خود کو نامرد کہنے پر میں نے اپنی بیوی کا کیا حال کر دیا تھا۔" درندہ غصے سے لال پیلا ہوتا ہوا بولا۔

"اوہ! تو تمہاری بیوی بھی تھی۔ کون تھی وہ بے وقوف عورت جس نے تم سے شادی کرلی تھی۔" رفیق نے اسے اور تپاتے ہوئے کہا۔

"ہاں تھی اور اس نے میری پیٹھ پیچھے میرے چھوٹے بھائی کے ساتھ تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ جب میں نے انہیں رنگے ہاتھوں پکڑا تو اس نے مجھ نامرد کہہ دیا تھا۔ اس کی یہ ہمت، میں نے کلہاڑی اٹھائی اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے بھائی کے بھی اتنے ٹکڑے کر دیئے جتنے کوئی قصائی گائے بکری کے بھی نہیں کرتا اور سچ بتاؤں۔ وہ میری پہلی واردات تھی۔ اور پہلا خون کرتے ہوئے مجھے جو مزا آیا مت پوچھو۔ میں بہت دیر تک ان کے خون اور بوٹیوں سے کھیلتا رہا تھا۔ آج بھی وہ دن یاد کرتا ہوں تو دل خوشی سے جھوم اٹھتا ہے۔ وہ میرا اب تک کا سب سے بہترین قتل تھا۔ اس کے بعد تو مجھے قتل کرنے کا نشہ سا ہو گیا۔" درندہ بڑی بے رحمی سے اپنی واردات کو بڑے مزے سے بیان کر رہا تھا۔

"تو میرا شک صحیح نکلا۔ تم سچ میں نامرد ہو اور ایک نامرد ہی تم جیسا بزدل اور ڈرپوک ہو سکتا ہے۔" جان پر بنی ہوئی تھی مگر رفیق اب بھی اس کے رعب میں نہیں آیا تھا۔

"تمہاری یہ زبان آج تم کو بہت تڑپتی ہوئی موت سے آشنا کروائے گی۔ کیوں نہ ایک گیم ہو جائے۔ میں سحرش ڈارلنگ کو لے کر آتا ہوں۔ تم لوگ اسے کمرے میں ڈھونڈ رہے تھے اور وہ درخت کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔" وہ ان کی پستولیں اور موبائل لے کر وہاں سے چلا گیا۔

درندہ سحرش کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹا ہوا وہاں لے آیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں تیز دھار کلہاڑی تھی، جس کا پھل چاند کی روشنی میں چمک رہا تھا۔

"میرے بم نے تم کو زیادہ نقصان نہیں پہنچایا۔ کوئی بات نہیں، دوسرا بم حاضر ہے۔ مجھے یقین ہے کہ سحرش بم ضرور کام کرے گا۔ کیوں سحرش ڈارلنگ۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں۔"

"جہاں ہو وہیں رک جاؤ۔ ورنہ گولی تمہارے سر کے آر پار ہو جائے گی۔" شہلا نے چلا کر کہا۔ اس نے ایس پی کے سر کا نشانہ لے رکھا تھا۔ اس کے ساتھ مونا بھی پستول لیے کھڑی تھی۔

"اوہ ڈی ایس پی صاحب۔ آپ بھی یہاں ہیں۔ بہت خوب۔ اب تو اور بھی زیادہ مزا آئیگا۔" ایس پی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"یہ کلہاڑی ایک طرف پھینک کر اپنے ہاتھ اوپر کرلو۔" شہلا نے حکم دیا۔

ایس پی نے کلہاڑی زمین پر گرا دی لیکن نہایت پھرتی کے ساتھ اس نے اپنی جیب سے پستول نکال کر شہلا پر فائر کیا۔ گولی شہلا کے ہاتھ پر لگی اور پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔ مونا نے وقت ضائع کئے بغیر درندے پر فائر کیا جو سیدھا اس کے سینے پر لگا۔ لیکن وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔

"مونا اس کے سر میں گولی مارو۔" شہلا نے درد سے کراہتے ہوئے کہا۔ اس کے ہاتھ سے خون بہہ رہا تھا۔

"اپنا پستول نیچے پھینک دو۔ ورنہ ڈی ایس پی

صاحبہ کی کھوپڑی میرے نشانے پر ہے۔" درندے نے چلا کر کہا۔

"میری فکر مت کرو۔ مار دو اسے۔" شہلا بولی۔

اور اگلے ہی پل مونا کے ہاتھ سے بھی پستول نکل گیا۔ اس کے ہاتھ سے بھی خون بہہ رہا تھا۔

"میرا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا۔ اسی لیے تمہارا بھیجہ بھی اڑا سکتا ہوں۔ مگر جب تم دونوں اتنی ہمت کر کے یہاں تک آ ہی گئی ہو تو تمہاری موت بھی بہت خاص ہونی چاہئے۔"

ایس پی شہلا کے قریب گیا اور اس کے جسم پر لاتیں برسانا شروع کر دیں۔ "بہت ڈھیٹ ہو تم۔ کھائی میں گر کر بھی بچ گئیں۔"

"کتے دور ہٹ جا۔" رفیق نے چیخ کر کہا۔

☆☆☆☆☆☆☆

"وردا! میڈم کو گئے ہوئے بہت دیر ہو گئی ہے۔ انہوں نے کوئی فون نہیں کیا۔" راجو نے کہا۔

"میں انہیں فون کرتی ہوں۔" وردا نے راجو کے ہاتھ سے موبائل لیتے ہوئے کہا۔

"کیا ہوا۔ انہوں نے کال ریسیو کی؟"

"نہیں۔ رنگ جا رہی ہے۔"

"اب تو مجھے جانا ہی ہوگا۔ لگتا ہے سب لوگ مصیبت میں ہیں۔" راجو نے کہا۔

"پتہ نہیں وہاں کیا ہو رہا ہے لیکن میری چھٹی حس کسی انہونی کا احساس دلا رہی ہے۔"

"مجھے بھی یہی اندیشہ ہے۔ ورنہ ان میں سے کوئی تو ہمیں فون کرتا۔ اب دیر نہیں کرنی چاہئے۔ جلدی چلو۔"

"ہاں چلو۔ پستول اٹھا لو اور گھبرانا بالکل نہیں۔" راجو نے اسے حوصلہ دلاتے ہوئے کہا۔

"میرے خیال سے جھاڑیوں کے راستے جانا ہی مناسب رہے گا۔" راجو نے کہا۔

"ہاں یہی ٹھیک رہے گا۔" وردا نے اس کی تائید کی۔

درندہ نہایت بے رحمی کے ساتھ شہلا کو لاتیں مار رہا تھا اور بیچ بیچ میں بونس کے طور پر ایک دو لاتیں مونا کے جسم پر بھی چلا رہا تھا۔

راجو اور وردا نے جب فارم ہاؤس کی دیوار سے اندر جھانک کر دیکھا تو ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"راجو اسے شوٹ کر دو۔" وردا نے آہستہ سے کہا۔

"شش۔ چپ رہو۔ ایسے بنا سوچے سمجھے کچھ نہیں کرنا چاہئے۔ دیکھو اگر میرا نشانہ چوک گیا تو وہ بوکھلاہٹ میں سب کو گولیاں مار سکتا ہے۔ وہ بہت ماہر نشانے باز ہے۔ اتنی دور سے میں فائر تو کر سکتا ہوں مگر اس بات کی ضمانت نہیں ہے کہ گولی اسے ہی لگے گی اور میری ذرا سی غلطی سب کی جان خطرے میں ڈال سکتی ہے۔ ابھی وہ صرف تشدد کر کے ان سے کھیل رہا ہے اور اگر اسے گولی لگ بھی گئی تو ہمارا مقصد ادھورا رہ جائے گا۔ میں اسے اتنی آسان موت نہیں مرنے دوں۔ اسے تڑپا تڑپا کر مارنا ہے۔" راجو جوش میں ہوش کے ساتھ بول رہا تھا۔

"ہاں اور اسی تڑپانے کے چکر میں ہی وہ سب اس کے چنگل میں پھنسے ہیں۔ تم سمجھتے کیوں نہیں۔ اس کے سر میں گولی مار کر زمین کا بوجھ ہلکا کر دو راجو۔" وردا کو درندے کا ایک لمحے زندہ رہنا بھی ناگوار گزر رہا تھا۔

"وہ سب ٹھیک ہے۔ مگر میری بات سمجھنے کی کوشش تو کرو۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ میرا نشانہ خطا ہو گیا تو پھر کیا ہوگا۔ سینے پر گولی مارنا رسکی ہے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے اس نے بلٹ پروف جیکٹ پہن رکھی ہو۔" راجو ابھی بھی ہوش کا دامن چھوڑنے کے لیے

تیار نہیں تھا۔

"تو کیا ہم یہاں چپ چاپ کھڑے ہو کر تماشہ دیکھتے رہیں۔" وردا نے تپ کر کہا۔

راجو نے اب دیر کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اس نے درندے کے سر کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ گولی اس کے کان کی لو کو چھوتے ہوئے نکل گئی اور وہ تڑپ کر چونک گیا۔

فائر کرنے کے بعد راجو اور وردا فوراً نیچے ہو گئے تھے۔ "اوہ گاڈ۔ وہ بچ گیا۔" راجو نے بوکھلا کر کہا۔

"آہ...... کون ہے وہاں۔ جلدی سے سامنے آ جاؤ ورنہ ان دونوں کو گولی مار دوں گا۔" درندہ کراہ کر بولا۔ اس کے کان کی لو سے خون بہہ رہا تھا۔

"جس بات کا ڈر تھا۔ وہی ہوا۔ اب کیا کریں۔" راجو کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"میں دس تک گنوں گا۔ جلدی سے سامنے آ جاؤ ورنہ سب کو گولی مار دوں گا۔" درندے نے پھر چلا کر کہا۔ اس نے اپنی جیب سے رومال نکال کر کان پر رکھ لیا تھا۔

"میں جا رہا ہوں۔" راجو نے کہا۔

"ہاں جاؤ۔" وردا بولی۔

"چاہے کچھ بھی ہو جائے تم یہیں رکنا۔ یہاں سے کسی صورت بھی مت ہلنا۔" راجو نے پھر سے تاکید کرتے ہوئے کہا۔

انسان پر جب بھی کوئی مشکل گھڑی آتی ہے تو وہ اپنے رب سے ہی رجوع کرتا ہے۔ وردا بھی یہی کر رہی تھی۔ کچھ سوچ کر وردا اٹھی اور دیوار کے ساتھ چلتی ہوئی پیچھے آگے بڑھ گئی۔ اس نے کچھ کرنے کی ٹھان لی تھی۔

راجو فارم ہاؤس میں کود کر دیوار کے ساتھ ہی کھڑا رہا۔

"آج میری زندگی کا سب سے بڑا دن ہے۔ آج پہلی بار ایک ساتھ اتنے لوگوں کو مارنے کا موقع مل رہا ہے۔ واہ...... واہ۔ تم کیا جانو کہ اس عمل میں کیا مزا آتا ہے۔ یہ صرف میں ہی جانتا ہوں۔ کیونکہ میں فنکار ہوں۔ اب جلدی سے یہاں آ جاؤ تاکہ تمہاری خاطر داری بھی شروع کر سکوں۔ فکر نہ کرو تمہارے ہر سوال کا جواب ملے گا۔ ہی ہی ہی۔" درندہ اب کھلکھلا کر ہنس رہا تھا۔ لگتا تھا کہ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں ہے۔ جیسے ایک بچہ بہت سارے کھلونے دیکھ کر نہال ہو جاتا ہے کچھ ویسا ہی حال اس وقت درندے کا بھی تھا۔

راجو خاموشی سے چلتا ہوا درندے کے قریب آ گیا۔

"بہت دن سے میں نے کسی کی کھوپڑی نہیں اڑائی۔ میرا پستول بہت شکوے گلے کرتا ہے مجھ سے۔ سوچتا ہوں آج یہ کمی بھی پوری کر دی جائے۔ تم نے میرے سر کا نشانہ لیا تھا نا۔ ہونہہ...... تم نے میرا کان زخمی کر دیا۔ تمہارا نشانہ تو خطا ہو گیا مگر میرا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا۔ میں اڑتی چڑیا کو گرا سکتا ہوں۔ تو سوچو تمہاری کھوپڑی کیسے بچ سکتی ہے۔"

یہ سن کر ایک پل کے لیے تو راجو کے ہوش اڑ گئے۔ "اس سے پہلے کہ یہ میری کھوپڑی اڑائے۔ اسی کی کھوپڑی اڑا دینی چاہیے۔" یہ سوچ کر راجو نے پھرتی کے ساتھ پیچھے کی طرف چھپایا ہوا پستول نکالی لیکن فائر نہیں کر سکا۔ کیونکہ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔

"اب بتاؤ کون ہے بے وقوف اور احمق۔ میرے سامنے کوئی پستول لے کر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ کوئی شک ہو تو اپنی ڈی ایس پی صاحبہ سے پوچھ لو۔ یا پھر اس رپورٹر سے پوچھ لو۔ کوئی اور پستول ہے تو وہ بھی نکال کر ٹرائی کر سکتے ہو۔" صورت حال پوری طرح سے

درندے کے کنٹرول میں تھی۔

"ہوتا تو ضرور ٹرائی کرتا۔" راجو مردہ لہجے میں بولا۔

درندے نے راجو کے ہاتھ سے گرنے والی پستول اٹھا کر اس کا چیمبر خالی کر کے دور پھینک دیا۔

وردا ان سب باتوں سے انجان دیوار کے سہارے چلتے ہوئے کافی دور آ گئی تھی۔ وہ چپ چاپ بنا آواز کیے دیوار پر چڑھ کر اندر کود گئی۔ وہ اس کمرے کے پیچ پہنچ گئی تھی جس کے آگے درندے کا کھیل چل رہا تھا۔ اس نے کمرے میں رکھی تیز دھار تلوار اٹھالی۔

اس سے پہلے کہ راجو اس درندے کی چال کو سمجھ پاتا' درندے نے بائیں ہاتھ سے خنجر پھینکا اور راجو کے سنبھلنے سے پہلے جڑ تک راجو کے پیٹ میں دھنس چکا تھا۔ راجو درد سے کراہ اٹھا۔

"کیوں کیسی رہی۔ مجھے مارنے چلے تھے۔ یہ بھول گئے کہ فنکارانہ موت کا ٹھیکہ صرف میرے پاس ہے۔"

درندہ راجو کی طرف بڑھا اور راجو نے درد کی پروا کیے بغیر اس کے سر کا نشانہ لے کر بیٹ کا وار کیا۔ لیکن درندے نے جھک کر اس کا وار خالی جانے دیا اور جھکنے کے ساتھ ہی گھوم کر لات چلائی جو سیدھی راجو کے پیٹ پر لگی۔ لات اتنی زور کی تھی کہ راجو سنبھل نہیں پایا اور پیٹھ کے بل رفیق اور شہلا کے اوپر گر گیا۔ درندے نے آگے بڑھ کر راجو کے پیٹ سے خنجر نکالا اور دوسری طرف گھونپ دیا۔ چاروں طرف راجو کی چیخیں گونجنے لگیں۔

وردا نے تلوار تو اٹھالی تھی' لیکن وہ شدید صدمے کی حالت میں تھی۔ بار بار راجو کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ اس نے کسی طرح اپنے جذبات کو قابو میں کیا اور تلوار کو دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام کر درندے کی طرف چل پڑی۔ تب تک درندے کو بھی ایک جھاڑی کے پیچھے سے اپنا پستول مل گیا تھا۔ جب وردا اس کے نزدیک پہنچی تو درندے نے اسے پہچان لیا۔

"کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ مگر نہیں۔ یہ تو حقیقت ہے۔ آؤ وردا آؤ...... خوش آمدید۔"

"میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ تم نے میری زندگی برباد کر دی ہے۔" وردا چلا کر بولی۔

اچانک درندے کے حلق سے چیخ گونج اٹھی اور وہ لڑکھڑا کر نیچے گر گیا۔ رفیق نے اس کے گھٹنوں کے نیچے بیٹ سے وار کیا تھا۔ درندے کے گرتے ہی رفیق بھی خود کو سنبھال نہیں سکا اور گر پڑا۔ اس حالت میں بھی اس نے صرف شہلا کی آواز پر بڑی مشکل سے اٹھ کر اپنی پوری طاقت سے درندے کی ٹانگوں پر وار کیا تھا۔

جیسے ہی درندہ نیچے گرا وردا نے وقت ضائع کیے بغیر اس کے دائیں ہاتھ پر تلوار سے وار کیا جو پہلے ہی سے خون آلود ہو رہا تھا اور اس کا ہاتھ پستول سمیت اس کی کلائی سے الگ ہو گیا۔ ایک بار پھر چاروں طرف درندے کی چیخ گونج اٹھی۔

وہ وردا کی طرف بڑھا ہی تھا کہ چیخ کر دوبارہ زمین پر گر گیا۔ اس بار شہلا نے اس کے گھٹنوں کے نیچے وار کیا تھا۔ وردا نے پھر ہمت دکھائی اور موقع گنوائے بغیر درندے کے بائیں ہاتھ پر تلوار سے وار کیا۔ اور اس کا بایاں ہاتھ بھی خنجر سمیت کلائی سے الگ ہو گیا۔ فضا میں درندے کی مسلسل چیخیں گونجنے لگیں۔

"جو خوف تم لوگوں کو دیتے تھے۔ آج وہی خوف تمہاری آنکھوں میں نظر آ رہا ہے۔ بہت بدصورت خوف ہے۔ بالکل تمہارے کردار کی طرح۔ میں تمہیں ایک منٹ کے لیے بھی زندہ نہیں رکھنا

چاہتی۔" یہ کہتے ہوئے وردا نے اس کے پیٹ میں گھونپنے کے لیے تلوار اوپر اٹھائی۔
"نہیں وردا۔ رک جاؤ۔ ہم اس کو اتنی جلدی اور آسان موت نہیں دیں گے۔" رفیق نے چلا کر کہا۔
وردا نے تلوار ایک طرف پھینک دی اور دوڑ کر راجو کے پاس آ گئی۔ "راجو..... راجو..... تم ٹھیک تو ہو نا؟"
"جس کی تم جیسی محبوبہ ہو اسے کیا ہو سکتا ہے۔" راجو نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
"میں نے اس کے دونوں ہاتھ کاٹ دیئے ہیں۔ اس نے انہی ہاتھوں سے تم کو مارا تھا نا۔ اس نے انہی ہاتھوں سے امی ابو کو بے رحمی سے مارا تھا نا۔ اس نے انہی ہاتھوں سے اتنے سارے لوگوں کو درد دیا تھا نا...... آج میں نے اس کے وہ دونوں ہاتھ ہی کاٹ دیئے ہیں۔ اب وہ ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔" وردا کے جذبات بے قابو ہو رہے تھے۔
"تم نے بالکل ٹھیک کیا۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ میری وردا اتنی بہادر بھی ہے۔"
رفیق بڑی مشکل سے ہمت کر کے دوبارہ اٹھا اور بولا۔ "سب ہمت کر کے یہاں آ جاؤ۔ آج ہم نے بہت کچھ برداشت کیا ہے۔ مگر اب وہ وقت آ گیا ہے جس کے لیے ہم سب ایک ساتھ جمع ہوئے تھے۔ مراد۔ آ جاؤ بھائی۔ اب ایک گیم ہو جائے اس پاگل کتے کے ساتھ۔"
شہلا نے تلوار اٹھالی اور درندے کے پاس کھڑی ہو گئی تاکہ وہ بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔ "ذرا بھی ملنے کی کوشش کی تو کاٹ کر رکھ دوں گی۔" شہلا پھنکارتی ہوئی بولی۔
رفیق، وردا کے پاس گیا اور کہا۔ "وردا۔ تم نے آج بہت ہمت دکھائی ہے۔ یہ تلوار تمہیں کہاں سے ملی۔"
"وہاں اس درخت کے پیچھے پڑی تھی۔ وہاں اور ہتھیار بھی ہیں۔" وردا نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔
"کیا وہاں کلہاڑی بھی ہے۔" رفیق نے پوچھا۔
"ہاں شاید ہے۔"
"راجو بس تھوڑی اور...... پھر ہم سب اسپتال چلیں گے۔ ہمت رکھو۔"
"میری فکر مت کرو۔ اسے ایسی موت دینی ہے کہ یہ جان جائے کہ موت اصل میں کہتے کسے ہیں۔" راجو بولا۔
رفیق نے اب مونا کو اٹھایا۔ "تم ٹھیک ہو؟"
"کم بخت نے سر میں ایسی لات ماری کہ اب تک سر گھوم رہا ہے۔ پیٹ میں بھی بہت درد ہو رہا ہے۔" مونا نے کہا۔
"میرے جسم کا برا حال ہے۔ مگر میں کسی طرح اٹھ ہی گیا ہوں۔ آؤ درندے کے ساتھ ایک گیم ہو جائے۔"
مونا کو اٹھانے کے بعد رفیق نے مراد کے پاس آ کر کہا۔ "اٹھو دوست۔ تمہارے بنا گیم ادھورا رہے گا۔"
مراد بھی بڑی مشکل سے اٹھا۔ اکیلے درندے نے ان سب کو تقریباً چیر پھاڑ کر رکھ دیا تھا۔ مراد نے اٹھ کر اپنی شرٹ اتار کر سحرش کو پہنا دی۔
مراد کو اٹھانے کے بعد رفیق سیدھا اس درخت کی طرف بڑھا جس کی طرف وردا نے اشارہ کیا تھا۔ وہاں سے اس نے کلہاڑی اٹھائی اور لڑکھڑاتا ہوا واپس درندہ کے پاس آ گیا۔ سب نے درندے کو اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا جو درد کی شدت سے زمین پر ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ راجو کے لیے کھڑا ہونا محال تھا۔ وردا نیچے بیٹھ گئی اور راجو نے اس کے گھٹنے پر اپنا سر ٹکا دیا۔
"سر آپ کو کیسا لگ رہا ہے۔" رفیق نے

درندے سے کہا۔ "اوہ میں تو بھول ہی گیا۔ آپ کو تو بہت اچھا لگ رہا ہوگا۔ بلکہ آپ تو یہ سوچ کر کچھ زیادہ ہی خوش ہو رہے ہوں گے کہ آپ کے دونوں ہاتھ ایک خوبصورت لڑکی کے خوبصورت ہاتھوں نے کاٹے ہیں۔ آپ خود کو بہت خوش نصیب سمجھ رہے ہوں گے نا۔ اب آپ یہ بتائیں کہ آپ کو سزا کیا دی جائے۔"

"رفیق۔" ایس پی نے کہا۔

"رفیق۔" رفیق نے مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا۔ "ارے آپ اتنی جلدی بھول گئے۔ مجھے تو آپ نے مغلِ اعظم کا خطاب دے رکھا ہے۔"

"دیکھو میں اپنے گناہ قبول کرتا ہوں۔ مجھے قانون کے حوالے کر دو۔ مجھے گرفتار کر لو۔ جیل میں ڈال دو۔ میں اپنے سارے جرم قبول کرتا ہوں۔" درندہ جو لوگوں کی گڑگڑانے سے لطف اندوز ہوتا تھا آج موت کو سامنے دیکھ کر خود گڑگڑانے پر مجبور ہو گیا تھا۔

"سوری ایس پی صاحب...... میں تو معطل ہوں۔ آپ کو گرفتار کیسے کر سکتا ہوں۔ ڈی ایس پی صاحبہ آپ کے دیئے ہوئے زخموں کے نہ بھرنے کی وجہ سے اب تک ڈیوٹی جوائن ہی نہیں کر سکی ہیں۔ اس لیے وہ بھی آپ کو گرفتار نہیں کر سکتیں۔ یہ ریاض حسین ہے۔ مگر یہ محض ایک سب انسپکٹر ہے اور اس کی اتنی اوقات ہی نہیں ہے کہ آن ڈیوٹی ایس پی کو گرفتار کرے۔ اس لیے معذرت کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ یہاں کوئی ایسا نہیں ہے جو آپ کو گرفتار کر سکے۔ کوئی اور راستہ ہے تو بتائیں۔" رفیق نے مزے لیتے ہوئے کہا۔

"دوسرے پولیس والوں کو بلا لو۔ سکندر کو بلا لو یا پھر چوہان کو بلا لو۔" درندہ ملتجی لہجے میں بولا۔

"بلا لیں گے۔ مگر آپ کو گیم کھیلنا بہت اچھا لگتا ہے نا۔ تو پھر کیا خیال ہے۔ ایک گیم ہو جائے۔ آپ ہمیں بھی تو تھوڑی بہت گیم کھیلنے کا موقع دیں نا سر۔" چونکہ رفیق سب کے جذبات کی ترجمانی صحیح انداز سے کر رہا تھا اس لیے ابھی تک کسی نے بیچ میں دخل اندازی نہیں کی تھی۔

"گیم...... کیسی گیم۔" درندے کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ جو زبردست تھا آج وہ زیردست ہو کر زیرو بن کر رہ گیا تھا۔

"میں کچھ سوال کروں گا۔ تم جواب دیتے جانا۔ اگر ایک منٹ کے اندر صحیح جواب نہیں دیا تو تمہارے بدن کا ایک حصہ کٹ کر الگ ہو جائے گا۔ ویسے ماننا پڑے گا۔ آپ نے کلہاڑی کی دھار بہت تیز رکھی ہے۔ اب آزما بھی لیں گے۔" رفیق کا لہجہ اور اس کا ایک ایک لفظ درندے کا خون خشک کر رہا تھا۔

"میں کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔ میرے ہاتھ کٹ گئے ہیں۔ مجھے فوراً طبی امداد چاہیے۔ جو پوچھنا ہے جیل میں پوچھ لینا۔" درندہ چیخ کر بولا۔

"کے کے کون ہے؟" رفیق نے پہلا سوال کیا۔

"میں نہیں جانتا۔"

"بس ایک منٹ ہے تمہارے پاس۔ دوبارہ نہیں پوچھوں گا۔ تم نے جواب نہیں دیا تو ایک منٹ کے بعد اس کلہاڑی سے تمہارا بایاں پاؤں کاٹ دوں گا۔" رفیق سنگدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

ایک منٹ بیت گیا اور درندے نے کوئی جواب نہیں دیا۔

رفیق نے جیسے ہی اس کا پاؤں کاٹنے کے لیے کلہاڑی اٹھائی۔ درندے کی آواز کھل گئی۔ "میں۔ میں ہی کے کے ہوں۔"

"تم کیسے ہو سکتے ہو۔ تمہارا نام تو سلطان بخاری ہے۔" رفیق نے حیرت سے کہا۔

''ہاں مگر میرے کچھ دوست کالج کے زمانے سے ہی مجھے کے کے کہہ کر بلاتے تھے۔''

''تو کیا سہیل اور کرنل داؤد خان بھی تمہارے کالج کے دوست تھے؟''

''ہاں۔''

''تو کیا تم نے ہی سہیل کو وردا کے خلاف جھوٹی گواہی دینے کے لیے کہا تھا اور وہ اس کے لیے راضی کیوں ہو گیا تھا؟'' رفیق نے پوچھا۔

''میں نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ وردا ہی درندہ ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ تم گواہی دے دو کیونکہ ایس پی ہونے کی وجہ سے میرا گواہی دینا مناسب نہیں ہوگا۔ وہ میرا دوست تھا اس لیے میری بات مان گیا۔'' درندے نے بتایا۔

''اور پھر تم نے اپنے دوست کو ہی مار دیا۔'' رفیق نے تالی بجاتے ہوئے کہا۔

''اس کا مرنا ضروری تھا ورنہ کبھی بھی میرا راز کھل سکتا تھا۔''

''داؤد خان کے گھر پر تم ہی رہ رہے تھے۔ ہیں نا۔'' اس بار مراد نے پوچھ لیا۔

''ہاں۔ کرنل داؤد خان زیادہ تر شہر سے باہر ہی رہتا تھا۔ اس لیے میں نے اس کا گھر کرائے پر لے لیا تھا۔''

''اب کرنل کہاں ہے؟'' رفیق نے مزید کریدا۔

''اس نے ایک دن میری پینٹنگز دیکھ لی تھیں۔ اس لیے اسے بھی مارنا پڑا۔ مار کر جنگل میں گاڑ دیا تھا۔''

''کیا سب انسپکٹر وحید ملک سے تمہارا کوئی رشتہ تھا؟'' رفیق نے ایک اور سوال کیا۔

''میں رضیہ کو جنگل والے ٹھکانے پر لے جا رہا تھا تو وحید ملک نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ اس وقت جنگل میں ایک لڑکی کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا تھا۔ میں اسے اور اس کے ساتھ جو لڑکی تھی، دونوں کو مار دینا چاہتا تھا۔ مگر وحید میرے پیروں میں گر گیا اور کہا کہ مجھے اپنے ساتھ ملا لو۔ میں نے اس سے کہا کہ جو لڑکی تمہارے ساتھ ہے پہلے اسے مارو اور وحید نے میرے سامنے اس لڑکی کا گلا کاٹ دیا۔ وہ میرا شاگرد بن گیا تھا۔ میں نے رضیہ کے قتل کی ویڈیو اسے دی تھی تاکہ وہ فنکارانہ قتل سیکھ سکے۔'' درندے نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''ہاں میں نے وہ سی ڈی دیکھی ہے۔ لیکن وہ تو ادھوری تھی۔'' رفیق نے کہا۔

''میں نے اسے دو ہی ڈیز دی تھیں۔''

''تم جو بلیک اسکارپیو استعمال کرتے تھے وہ کس کی تھی۔ کیونکہ تمہارے نام پر تو کوئی بلیک اسکارپیو نہیں ہے۔''

''میں بھلا اپنے نام کی گاڑی کیوں استعمال کرتا۔ اس کے لیے میں کرنل کی کار استعمال کرتا تھا۔ اب برداشت نہیں ہو رہا ہے۔ درد کی شدت بڑھتی جا رہی ہے۔ مجھے جلدی سے اسپتال پہنچا دو۔'' درندے نے التجا کرتے ہوئے کہا۔

''ہم سب ہی درد کی شدت برداشت کر رہے ہیں۔ تھوڑا صبر کرو۔ ہاں تو تم نے کالج کے دوست کی گاڑی بھی ہتھیا لی اور اس کا گھر بھی۔'' رفیق نے باتوں کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''اور پھر بیچارے کو مار کر جنگل میں گاڑ دیا۔ توبہ ہے ایسے دوست تو خدا دشمن کو بھی نہ دے۔'' موٹا نے بھی دل کی بھڑاس نکالی۔

''تم پر کوئی حملہ نہیں ہوا تھا۔ ہیں نا۔ تم یونہی ڈرامے بازی کر کے ہمیں گمراہ کرنے کے لیے اسپتال میں داخل ہو گئے' تاکہ تم پر کسی کو شک نہ ہو

جائے۔ ڈاکٹر شکیل تمہارا دوست ہے۔ اس لیے تمہیں کوئی پرابلم نہیں ہوئی۔ اور تم خواہ مخواہ آئی سی یو میں پڑے رہے اور وردا کے گھر پر حملہ بھی تم نے ہی کیا تھا نا اور جب سب کچھ تمہارے کنٹرول میں تھا تب تم وہاں سے بھاگ کیوں گئے تھے۔" رفیق نے ایک اور الجھن کو سلجھانے کے لیے پوچھا۔

"ہاں میں نے ڈاکٹر شکیل سے کہا تھا کہ ایک خفیہ مشن پر جا رہا ہوں اور وردا کے گھر پر جب سب کچھ میرے کنٹرول میں آ گیا تب اچانک ڈاکٹر شکیل کا فون آ گیا کہ تمہارا کوئی جونیئر تمہیں ڈھونڈ رہا ہے۔ اس لیے جلدی سے آ جاؤ تا کہ تمہارے اسپتال سے غائب ہونے کی خبر فاش نہ ہو۔ بعد میں پتہ چلا کہ چوہان مجھ سے ملنے آیا تھا۔ اس لیے مجھے سب کچھ بیچ میں ہی چھوڑ کر واپس جانا پڑا تھا۔ کاش اس دن اس چھنال کو اٹھا لاتا تو یہ نوبت ہی نہ آتی۔" درندے نے وردا کی طرف نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

رفیق نے مڑ کر دیکھا بیٹ مونا کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے کہا۔ "مونا یہ بیٹ مجھے دینا۔"

مونا سے بیٹ لے کر رفیق نے درندے کے گھٹنے پر زوردار وار کیا اور درندہ دوبارہ چیخنے پر مجبور ہو گیا۔

"اگر دوبارہ ہم نے کسی کو گالی دی تو اس سے بھی برا انجام ہوگا۔ یہ سمجھ لو۔ اچھا اب یہ بھی بتا دو کہ جنگل میں ڈی ایس پی صاحبہ پر گولی کس نے چلائی تھی۔ تم نے یا وحید ملک نے۔"

"وحید نے چلائی تھی۔ ڈپارٹمنٹ کی گولی استعمال کر لی تھی اس گدھے نے۔ اس کی وجہ سے میرا جنگل والا ٹھکانہ خطرے میں پڑ گیا۔ تم لوگوں کو اسی واقعے کے بعد جنگل پر شک ہوا تھا۔ خیر ویسے تو میرے پاس ٹھکانوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ مگر جنگل پھر جنگل تھا۔" جنگل کو یاد کر کے درندے نے ایک سرد آہ بھری۔

"ویسے تو میرا دل کر رہا ہے کہ تمہارے بدن کے ہزار سے بھی زیادہ ٹکڑے کر دوں۔ مگر کچھ وجوہات کی وجہ سے خود کو روکے ہوئے ہوں۔ ایک تو یہ کہ میں تمہاری طرح درندہ نہیں ہوں۔ اور دوسرا یہ کہ ہمارے ایک ساتھی کو فوراً اسپتال پہنچانا ہے۔ حالانکہ ہم سب کو طبی امداد کی سخت ضرورت ہے۔ تم نے ہماری حالت ہی ایسی بنا دی ہے۔ مگر راجو کے زخم بہت گہرے ہیں۔ ہمارے ساتھ گیم کھیلنے کا شکریہ ایس پی صاحب۔ اب گیم ختم۔ جسے یاد کرنا ہے کر لو۔ میں تمہاری ہی کلہاڑی سے تمہاری گردن کاٹنے والا ہوں۔ امید کرتا ہوں کہ اپنی کلہاڑی کا لمس محسوس کر کے تمہاری روح کو بہت تسکین ملے گی۔" رفیق ایک ایک لفظ کو چبا چبا کر بول رہا تھا۔

"میں نے تمہارے سارے سوالوں کے جواب دے دیئے ہیں۔ پلیز مجھے قانون کے حوالے کر دو۔" درندہ اپنے کٹے ہوئے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

"قانون تو آپ کے گھر کی لونڈی ہے ایس پی صاحب۔ میں خوب سمجھ رہا ہوں آپ کی بات۔ مگر مجھے انصاف کرنے میں تاخیر ذرا بھی پسند نہیں ہے۔ یہاں جو لوگ موجود ہیں وہ جیوری کا حصہ ہیں۔ تو میں تمہارے سامنے جیوری سے پوچھتا ہوں کہ ان کا کیا فیصلہ ہے۔" رفیق نے سب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس کی گردن کاٹ دو۔" مراد بولا۔

باقی سب نے بھی مراد کا ساتھ دیا۔ "ہاں اس کی گردن دھڑ سے الگ کر دی جائے۔"

"سوری ایس پی صاحب۔ جیوری کا فیصلہ ٹالا نہیں جا سکتا۔ گو ٹو ہیل۔"

رفیق نے مارنے کے لیے کلہاڑی اوپر اٹھائی تو ایس پی نے بچنے کے لیے کھسکنے کی کوشش کی اور مراد

نے فوراً خار دار بیٹ سے اس کے ماتھے پر وار کیا۔ اس کا ماتھا چھل گیا اور پورا چہرہ خون سے سرخ ہوگیا۔ ایس پی دوبارہ زمین پر گر گیا۔

"اب دوبارہ اٹھنے کی کوشش مت کرنا درندے۔ یہ حقیقت تسلیم کرلو کہ تمہارا گیم ختم ہو چکا ہے اور تمہارے جہنم میں جانے کا وقت ہوگیا ہے۔"

"تم مجھے نہیں مار سکتے۔ کیونکہ مجھے موت بھی نہیں مار سکتی۔ یاد رکھو۔ میں پھر آؤں گا۔ میں ضرور لوٹ کر آؤں گا۔"

بس اب باتیں بہت ہوگئیں۔ اگر تمہیں دوسرے جنم پر یقین ہے تو ہم تمہارا انتظار کریں گے۔ بائے۔" یہ کہتے ہی رفیق نے ایک جھٹکے سے درندے کی گردن دھڑ سے الگ کردی۔

"مونا کل صبح تمہارے چینل پر یہ نیوز آنی چاہئے کہ درندے نے ایک اور شکار کرلیا۔ ایس پی صاحب پر درندہ پہلے بھی حملہ کر چکا ہے۔ اس بار اس نے ایس پی صاحب کو جان سے مار دیا۔" رفیق نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ یہ کام ہوجائے گا۔" مونا بولی۔

"مگر اس نئے انسپکٹر سکندر کا کیا کریں گے۔ اسے کہیں ہم لوگوں پر شک نہ ہوجائے۔ ہمیں یہاں اپنی موجودگی کا کوئی نشان نہیں چھوڑنا چاہئے۔" مراد نے پتے کی بات کرتے ہوئے کہا۔

"مراد ٹھیک کہہ رہا ہے۔ درندے کو زمین میں گاڑ دو اور یہاں اپنی موجودگی کا ہر نشان مٹا دو۔ اس لیے کہ کوئی یہ نہیں سمجھ پائے گا کہ ہم نے ایسا کیوں اور کس وجہ سے کیا۔" شہلا بولی۔

"ٹھیک ہے۔ میں اور مراد یہ کام کرتے ہیں۔ تم لوگ فوراً اسپتال پہنچو۔" رفیق نے کہا۔

"لیکن طبی امداد کی ضرورت تو تم دونوں کو بھی

ہے۔" شہلا نے کہا۔
"آپ لوگ چلیں۔ ہم بھی تھوڑی دیر میں آجاتے ہیں۔ یہاں کا کام نمٹانا بھی تو ضروری ہے۔ مونا نیوز والا پلان کینسل۔ ایس پی صاحب کو ایسے ہی غائب ہو جانے دو۔" رفیق بولا۔
"او کے۔ جیسے تمہاری مرضی۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆

پوری ٹاسک فورس اسپتال میں موجود تھی۔ راجو کا آپریشن کامیاب رہا تھا اور اس کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ شہلا کے ہاتھ پر بینڈیج کر دی گئی تھی۔ یہ بھی شکر تھا اس کے پیٹ میں کوئی نیا زخم نہیں آیا تھا۔ درد کو کم کرنے کے لیے اسے درد کش انجکشن لگا دیے گئے تھے۔ اسے اسپتال میں رکنے کی ضرورت نہیں تھی مگر وہ اپنے ساتھیوں کی وجہ سے وہاں رکی ہوئی تھی۔ مونا کے ہاتھ پر بھی بینڈیج کر دی گئی تھی اور چینل کی جانب سے اسے کسی خبر کی کوریج کے لیے جانا پڑا گیا تھا۔ بم بلاسٹ کی وجہ سے رفیق اور مراد کی حالت بہت نازک تھی۔ جبکہ رفیق بیس بال بیٹ کی مار کی وجہ سے اور بھی زیادہ زخمی ہو چکا تھا۔ اس کی پیٹھ بری طرح سے چھلی ہوئی تھی۔ مگر ان دونوں کی حالت بھی خطرے سے باہر تھی۔ دونوں کو کہیں کہیں ٹانکے آئے تھے اور کئی جگہ پٹی باندھ دی گئی تھی۔ اور ہاتھ پاؤں تو تقریباً بینڈیج سے ڈھکے ہوئے تھے۔
دو دن بعد پوری ٹیم ہسپتال میں راجو کے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔
"یار راجو۔ یہ تو بتاؤ کہ ایس پی صاحب کی تصویر تمہارے پاس کہاں سے آئی۔" مراد نے اپنے دل میں ابھرنے والے سوال کو راجو پر ڈالتے ہوئے کہا۔
"وہ تو غلطی سے آ گئی تھی۔ ایک فنکشن میں فوٹو گرافر نے میری بھی کئی تصویریں کھینچی تھیں۔ میں نے اسے اپنی کئی تصویریں بنانے کے لیے کہہ دیا تھا اور غلطی سے میری تصویروں کے ساتھ ایک تصویر ایس پی کی بھی آ گئی تھی۔ وہ تصویر میں نے ایک کتاب میں رکھ دی تھی۔ اس کے ساتھ کچھ اور تصویریں بھی تھیں۔ میں وہ تصویریں فوٹو گرافر کو واپس کرنا چاہتا تھا مگر ہر بار بھول جاتا تھا۔" راجو نے تصویر کی موجودگی کی اصل وجہ بتاتے ہوئے کہا۔
سب ہی ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست بن چکے تھے۔ دوستی اور پیار میں تکرار تو چلتی رہتی ہے۔
دو مہینے سے پورے شہر میں سکون تھا اور اب لوگ درندے کو بھولنے لگے تھے۔ کسی کو پتہ نہیں تھا کہ درندہ اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے۔ ڈپارٹمنٹ ابھی تک اپنے ایس پی کو تلاش کر رہا تھا۔ یہی خیال کیا جا رہا تھا کہ شاید درندے نے انہیں اغواء کر کے قتل کر دیا ہے۔ میڈیا میں بھی اسی بات پر بحث ہو رہی تھی اور ٹاسک فورس کے لیے یہ اچھی بات تھی۔
مگر اب ایک اور اچھی بات ہونے والی تھی اور وہ اچھی بات تھی سحرش اور مراد کی شادی۔ سحرش کا ابا بھی بہت خوش تھا اور نغمہ بھی پھولے نہیں سما رہی تھی۔
شہلا شادی کی بھیڑ میں اکیلی پریشان سی گھوم رہی تھی۔ اس کی نظر راجو اور وردا پر پڑی تو جلدی سے ان کے قریب آ گئی۔
"ریاض تم نے رفیق کو دیکھا کہیں۔ اس کا فون بھی نہیں لگ رہا ہے۔" شہلا نے پوچھا۔
"میڈم۔ ہم تو ابھی اپنے گھر سے آ رہے ہیں۔ وردا کو لباس بدلنا تھا۔" راجو نے کہا۔
"رفیق کل نواب شاہ واپس جا رہا ہے نا۔ شاید پیکنگ میں بزی ہوگا۔" وردا نے کہا۔
"رفیق نے استعفیٰ دے کر اچھا نہیں کیا۔ اب تو

ان کی معطلی کا آرڈر بھی کینسل ہو گیا تھا۔" راجو بولا۔
"اچھا اگر رفیق نظر آئے تو اس سے کہنا مجھ سے مل لے۔"
"اوہ۔ پرسوں تو تمہاری منگنی کی تقریب ہے نا۔ میں تو بھول ہی گئی تھی۔" وردا نے یاد کرتے ہوئے کہا۔
"ہاں۔ پلیز اسے میرا میسج ضرور دے دینا۔"
"آپ فکر نہ کریں۔ جیسے ہی ملے گا سب سے پہلے یہی کام کریں گے۔" راجو بولا۔
رفیق کل سے غائب تھا اور اس کا فون بھی آف تھا۔ شہلا جب اس کے گھر گئی تو وہاں بھی تالا لگا ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شہلا رفیق کے لیے بہت پریشان ہو رہی تھی۔ اور شادی کی بھیڑ میں اس کی آنکھیں صرف رفیق ہی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔
کل سے اس کا دن بہت برا گزر رہا تھا۔ جب صبح اس کی آنکھ کھلی تھی تو آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے خواب ہی ایسا دیکھا تھا۔ خواب میں وہ رفیق کے ساتھ تھی۔
"میں نے آج تک اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا۔ محبت کا اظہار کر کے اس محبت کو کھونا نہیں چاہتی میں۔ اسی لیے یہ محبت اپنے دل میں دبا کر رکھ رہی ہوں۔ مگر رفیق کیا تم کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں۔ لیکن قسمت مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دے رہی ہے۔ بول دیتی اگر دل پر بوجھ نہ ہوتا۔ پتہ نہیں پاپا تم کو اتنا ناپسند کیوں کرتے ہیں۔" شہلا چپ چاپ بستر پر پڑی سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔
کچھ دیر شہلا یونہی پڑی رہی پھر اچانک اسے خیال آیا۔ "آج پھر پاپا سے بات کر کے دیکھتی ہوں۔ انہیں منانے کی ایک اور کوشش کر کے دیکھتی ہوں۔ اگر پاپا مان گئے تو میں اپنے دل کی بات چھپا کر نہیں رکھوں گی۔" دل میں ایک امید لے کر شہلا بستر سے اتر آئی۔
صبح کے سات بج رہے تھے۔ شہلا کے پاپا ڈرائنگ روم میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔
"گڈ مارننگ پاپا۔"
"گڈ مارننگ بیٹا۔ آج تم بڑی جلدی اٹھ گئیں۔"
"آپ سے ایک بات کرنی ہے۔" شہلا جھجکتے ہوئے بولی۔
"ہاں بولو کیا بات ہے؟" پاپا نے اخبار ایک طرف کر دیا۔
"پاپا۔ کیا میری پسند ناپسند کوئی معنی نہیں رکھتی؟"
"کیا مطلب...... میں کچھ سمجھا نہیں۔"
"میں رفیق کو پسند کرتی ہوں اور آپ زبردستی میری شادی کہیں اور کرنا چاہتے ہیں۔ کیا یہ صحیح کر رہے ہیں آپ؟"
"بالکل صحیح کر رہا ہوں۔ کہاں تم اور کہاں وہ۔ تم ایک ڈی ایس پی اور وہ ایک انسپکٹر۔ تم دونوں کا کوئی جوڑ نہیں ہے بیٹا۔" پاپا نے اپنے فیصلے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔
"تم مجھ سے زندگی میں پہلی بار زبان لڑا رہی ہو۔ میں نے اپنا فیصلہ سنایا ہے۔ بس۔" پاپا غصے سے بول رہے تھے۔
"پاپا میں زبان نہیں لڑا رہی۔ صرف اپنے دل کی بات بتا رہی ہوں۔"
"دل کی بات کرنے سے تمہاری زندگی نہیں سنور سکتی بیٹا، دماغ سے کام لو میں کوئی دشمن نہیں ہوں تمہارا۔ باپ ہوں۔ تمہارا بھلا چاہتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے پاپا اٹھے اور وہاں سے چلے گئے۔
شہلا تو کتنی ہی امیدیں لے کر اپنے پاپا سے

بات کرنے آئی تھی۔ مگر اس کی ساری امیدیں گہری مایوس میں بدل گئی تھیں۔ بڑی مشکل سے وہ تیار ہوئی اور ناشتہ کئے بنا ہی تھانے کے لیے نکل گئی۔

اپنے کمرے میں پہنچتے ہی شہلا کو فیکس ملا کہ رفیق کی معطلی منسوخ کر دی گئی ہے۔ اس فیکس سے شہلا کے دکھی دل کو کچھ سکون ملا۔ اور یہ سب شہلا کی اپنی کوششوں سے ممکن ہو سکا تھا۔ اس نے فوراً رفیق کو فون ملایا۔

"ہیلو رفیق۔ کیا ابھی وقت تھانے آ سکتے ہو۔" شہلا اسے فون پر کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی۔

"میں تھانے ہی آ رہا ہوں۔ راستے میں ہوں بس دس منٹ میں پہنچ جاؤں گا۔"

رفیق جب شہلا کے آفس میں پہنچا تو وہ چوہان کو کچھ ہدایات دے رہی تھی۔ رفیق دروازے پر ہی رک گیا۔

"مسٹر چوہان۔ اب تم جا سکتے ہو۔ جیسا کہا ہے ویسا ہی کرنا۔" شہلا نے چوہان سے کہا۔

چوہان رفیق کو گھورتا ہوا باہر نکل گیا۔

"رفیق آؤ بیٹھو۔ وہیں کھڑے رہو گے کیا۔ تمہیں ایک خوش خبری سنانی ہے۔"

رفیق خاموشی سے شہلا کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہے۔ کچھ کھوئے کھوئے سے ہو۔"

"نہیں بس یونہی۔"

"رفیق تمہاری معطلی منسوخ ہو گئی ہے۔ تم آج بلکہ ابھی سے جوائن کر سکتے ہو۔" شہلا نے خوشی سے خبر سناتے ہوئے کہا۔

یہ سن کر رفیق ہلکا سا مسکرایا اور بنا کچھ بولے شہلا کے سامنے ایک لفافہ رکھ دیا۔

شہلا کو رفیق کے ردعمل پر حیرت ہو رہی تھی۔

"کیا بات ہے رفیق۔ تمہیں کوئی خوشی نہیں ہوئی یہ سن کر۔" شہلا بولی۔

"خوشی تو بہت ہے اور آپ نے میرے لیے کوشش بھی بہت کی تھی۔ اس کے لیے شکریہ ادا کرتا ہوں۔" رفیق نے پھیکے لہجے میں کہا۔

"مگر تمہارے چہرے پر اس خوشی کا کوئی تاثر نہیں آ رہا۔ اس لفافے میں کیا ہے؟"

"کھول کر دیکھ لیجئے۔"

شہلا نے لفافے میں سے لیٹر نکالا اور پڑھتے ہی چونک گئی۔

"رفیق یہ کیا مذاق ہے۔ استعفیٰ کیوں دے رہے ہو۔ میں نے بڑی مشکل سے آرڈر کینسل کروایا ہے اور تم استعفیٰ دے رہے ہو۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ تم ایسا کیوں کر رہے ہو۔"

"پرسوں میں نواب شاہ واپس جا رہا ہوں۔ مجھے پولیس کی نوکری کبھی بھی پسند نہیں تھی۔ صرف اپنے والد کی وجہ سے یہ ملازمت اختیار کی تھی۔" رفیق نے کہا۔

شہلا کو ایک اور جھٹکا لگا۔ "نواب شاہ جا رہے ہو۔ مگر کیوں؟"

"یہاں نہیں رہ سکتا۔ میری کچھ مجبوری ہے۔"

"تم یہیں رہو میرے پاس۔ مجھے اکیلا چھوڑ کر مت جاؤ۔" شہلا نے جیسے التجا کرتے ہوئے کہا۔

"آپ نے آج تک اپنی زبان سے محبت کا اظہار تک نہیں کیا۔ آج میں جانے کی بات کر رہا ہوں تو آپ کو دکھ ہو رہا ہے۔"

"پلیز میرے ساتھ ایسا مت کرو۔ یہ استعفیٰ واپس لے کر یہیں اسی شہر میں رہو۔" شہلا روہانسی ہو رہی تھی۔

"آپ نے تو میری محبت کو مذاق بنا کر رکھ دیا ہے۔"

"میں نے تم کو محبت کرنے کے لیے نہیں کہا تھا۔"

"آپ کبھی کہہ بھی نہیں سکتی تھیں۔ میرا ہی دماغ خراب تھا جو آپ سے محبت کرنے کی بھول کر بیٹھا تھا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ میری محبت کی یوں تذلیل کی جائے گی۔" رفیق کے لہجے میں تڑپ تھی۔

"گیٹ آؤٹ۔ دوبارہ یہاں مت آنا۔ جاؤ یہاں سے۔ مجھے تمہاری کوئی پروا نہیں ہے۔" شہلا نے غصے سے کہا۔

اسی وقت چوہان کمرے کے اندر آ کر بولا۔ "میڈم یہ فائل دیکھ لیں۔ اس میں ساری تفصیل ہے۔"

چوہان کو آتے دیکھ کر رفیق کمرے سے باہر نکل گیا۔

کچھ دیر بعد جب شہلا کا غصہ سرد ہوا تو اس نے رفیق کو فون کیا مگر فون سوئچ آف تھا۔ کچھ دیر بعد شہلا رفیق کے پہنچی مگر وہاں تالا لگا ہوا تھا۔ شہلا کا پورا دن اور پوری رات بے چینی سے گزری۔ شہلا نے کئی بار رفیق کا فون ملایا مگر ہر بار فون بند ہی ملا۔

شہلا کو امید تھی کہ رفیق، مراد کی شادی میں ضرور آئے گا اسی لیے وہ شادی کی تقریب میں بے چینی سے صرف اسے ہی ڈھونڈ رہی تھی۔

مراد اور سحرش کا نکاح پڑھایا جا چکا تھا اور وہ دونوں پھولوں سے لدے اسٹیج پر بیٹھے ہوئے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

شہلا نے آخر کار اپنی محبت کا اظہار کر ہی دیا مگر رفیق کو یہ بات بھی بتا دی کہ اس کی آخری بار اپنے پاپا سے کیا بات ہوئی تھی اور انہوں نے شہلا کو کیا دھمکی دی تھی۔ رفیق نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کان میں ایک سرگوشی کی جس پر شہلا اسے حیران نظروں سے دیکھنے لگی پھر اس کا سر اثبات میں ہل گیا۔

شہلا نے رفیق کے موبائل سے اپنے پاپا کو فون کیا اور انہیں بتایا کہ رفیق اور میں شادی کر رہے ہیں۔ اب

اچھی باتیں

☆ غصہ کرنے کا مطلب ہے کہ ہم دوسروں کی غلطیوں کا انتقام اپنے آپ سے لیتے ہیں۔ یہ کتنی حیرت انگیز اور مضحکہ خیز بات ہے۔ (الیگزینڈر پوپ)

☆ اگر کوئی چیز اچھی ہے تو عین اسلام ہے۔ اگر کوئی چیز اچھی نہیں ہے تو یہ اسلام نہیں کیوں کہ اسلام کا مطلب عین انصاف ہے۔ (قائداعظم)

☆ جس گھر میں تعلیم یافتہ اور نیک ماں ہوتی ہے وہ گھر انسانیت اور تہذیب کی یونیورسٹی ہوتی ہے۔ (فریڈرک)

☆ خود اعتمادی، خود شناسی، خود ضبطی صرف یہ تین چیزیں انسان کی زندگی کو کامل بنا دیتی ہیں۔ (ٹینی سن)

☆ کانٹوں بھری شاخ کو پھول خوب صورت بنا دیتا ہے اور غریب کے گھر کو ایک نیک وفا شعار عورت جنت بنا دیتی ہے۔ (گولڈ اسمتھ)

☆ بکواس سے کوئی حسد نہیں کرتا سوائے بہرے کے۔ (خلیل جبران)

☆ جن میں خوبی ہوتی ہے وہ باتیں نہیں کرتے اور جن میں خوبی نہیں ہوتی وہ باتیں کرتے ہیں۔ (مستنصر حسین تارڑ)

وہ ان کے پاس کبھی نہیں آئے گی۔ شہلا کے پاپا نے غصے میں فون رکھ دیا۔

شہلا اور رفیق نے کورٹ میرج کر لی اس میں بھی ان کی پوری ٹاسک فورس موجود تھی سب کے چہروں پر خوشی کے آثار تھے۔ اسی خوشی کے ساتھ سب اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

رات کے ڈھائی بجے کا وقت تھا جب شہلا کا فون بے تحاشہ بجنے لگا۔ پہلے رفیق کی آنکھ کھلی۔ اس نے

شہلا کا موبائل اٹھا کر دیکھا۔ چوہان کی کال تھی۔ اس نے جھنجوڑ کر شہلا کو اٹھایا اور موبائل اس کے کان سے لگاتے ہوئے بولا۔ ”چوہان کی کال ہے۔“

”ہیلو چوہان۔ کیا بات ہے؟“ شہلا نے خمار آلود لہجے میں پوچھا۔

”میڈم۔ ایک بری خبر ہے۔“ دوسری طرف سے چوہان نے کہا۔

”اب کون سی بری خبر سنانی ہے تم نے۔“ شہلا درشت لہجے میں بولی۔

”میڈم۔ درندہ واپس آ گیا ہے۔“

شہلا یوں چونک کر اٹھ بیٹھی جیسے اس کے سر پر کسی نے بم پھوڑ دیا ہو۔ رفیق بھی اس کی حالت کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟“ وہ اس بات کا یقین کیسے کر سکتی تھی۔ جسے وہ اپنے سامنے جہنم واصل ہوتا دیکھ چکی تھی اس کی واپسی کس طرح ممکن تھی۔

”میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں میڈم۔ آپ فوراً جنگل والے کھنڈر میں آ جائیں۔“ چوہان نے کہا۔

”اوکے۔“ شہلا لائن کاٹ کر بستر سے اٹھ گئی۔

”کیا ہوا؟ کچھ بولو تو۔“ رفیق نے الجھتے ہوئے کہا۔

”درندہ واپس آ گیا ہے۔“ شہلا نے رفیق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا...... یہ کیسے ممکن ہے؟“ رفیق کے لہجے میں حیرت کا عنصر نمایاں تھا۔

”یہ ممکنات دیکھنے کے لیے ہی چوہان نے مجھے جنگل والے کھنڈر میں بلایا ہے۔“

”چلو میں بھی چلتا ہوں۔“

”اس نے مرتے وقت کہا تھا کہ وہ واپس آئے گا۔ تو کیا واقعی میں وہ واپس آ گیا ہے۔“ شہلا ابھی بھی حیرت میں تھی۔

”اتنی جلدی کوئی جنم نہیں لے سکتا۔ جیسے وحید ملک اس کا شاگرد تھا ہو سکتا ہے یہ بھی اس کا چھوڑا ہوا کوئی شاگرد ہو۔ جو اب اپنے استاد کا نام آگے بڑھانا چاہتا ہو۔“ رفیق نے اپنا اندازہ پیش کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔ یہ ہو سکتا ہے۔“ شہلا بھی رفیق کے اس خیال سے متفق نظر آ رہی تھی۔

دونوں جب کھنڈر پر پہنچے تو چوہان انہیں باہر ہی ٹہلتا ہوا ملا۔ وہ رفیق اور شہلا کے ساتھ کھنڈر کے اسی کمرے میں گیا جسے اب تک درندہ استعمال کرتا رہا تھا۔

اندر کا منظر دیکھ کر ایک لمحے کے لیے رفیق اور شہلا کو جیسے غش سا آ گیا۔ ایک برہنہ لڑکی دیوار سے ٹنگی ہوئی تھی۔ اس کے منہ میں بڑا سا خنجر پیوست تھا اور جگہ جگہ سے کھال ادھڑی ہوئی تھی۔

”یہ دیکھیں میڈم۔“ چوہان نے ایک طرف ٹارچ کی روشنی ڈالتے ہوئے کہا۔

دیوار پر درندے کے انداز کی تحریر موجود تھی۔

”میں کبھی نہیں مر سکتا۔ میں واپس آ گیا ہوں۔ ایک درندہ مرتا ہے تو اس کی جگہ دوسرا درندہ جنم لیتا ہے۔ اور یہ میرے آرٹ کا پہلا نمونہ ہے۔ اگر آپ کو پسند آیا ہے تو مزید نمونوں کا انتظار کریں۔ آپ کا اپنا درندہ۔

وہاں سے واپسی میں رفیق اور شہلا سوچ رہے تھے کہ کیا اب ان کی ٹاسک فورس کو دوبارہ میدان میں آنا ہوگا۔ یہ جاننے کے لیے کہ یہ نیا درندہ کون ہے؟

تمت بالخیر

⌘

پراسرار اشارہ

محمد سلیم اختر

انسان کی زندگی میں کبھی کچھ ایسے واقعات بھی رونما ہوتے ہیں جو حقیقت ہوتے ہوئے بھی عقل کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے لیکن وہ اسے جھٹلا نہیں سکتا۔
ایک ڈاکٹر کو پیش آنے والے حادثے کی روداد' وہ پراسرار اشارے کا شکار ہوگیا تھا۔

راولپنڈی کے ریلوے اسپتال میں تین سال کام کرنے کے بعد میری ڈیوٹی ایک پہاڑی علاقے کے چھوٹے سے اسٹیشن ڈومیلی کے اسپتال میں کردی گئی تھی۔ میں نے ڈیوٹی جوائن کرنے سے پہلے ایک ماہ کی چھٹی لے لی۔ گرمیوں کے دن تھے۔ اکیلی جان تھی' اس لیے میں چھٹیاں گزارنے مری چلا آیا...... میں نے ایک ماہ کے لیے ہوٹل ''ریکس'' میں کمرہ لے لیا اور مری کے ٹھنڈے موسم سے لطف اندوز ہونے لگا۔ میں ناشتا وغیرہ کرنے کے بعد ہوٹل سے نکلتا' کرایہ کی گاڑی میں کبھی ایوبیہ' کبھی نتھیا گلی اور کبھی گھوڑا گلی گھومتا رہتا۔ دوپہر کا کھانا میں باہر ہی کھاتا' اور شام ڈھلے ہوٹل لوٹ آتا۔ مجھے اکیلے ہی سیر کرنے میں مزہ آتا تھا۔ مجھے کسی ساتھی کی ضرورت نہ تھی کیونکہ میں شروع ہی سے تنہائی پسند تھا' اسکول اور کالج میں بھی میری دوستی کم ہی تھی۔ میں ہمیشہ پڑھائی میں ہی مگن رہتا اور ہر کلاس میں پوزیشن لیتا۔ ایم بی بی ایس میں' میں نے گولڈ میڈل حاصل کیا تھا۔ میڈیکل کالج میں اور پھر اسپتال کی نوکری کے دوران کئی لیڈی ڈاکٹرز اور نرسوں نے میری طرف ہاتھ بڑھانا چاہا لیکن میں نے ہر ایک کا ہاتھ جھٹک دیا۔ نہ جانے کیوں...... میرے من کو کوئی لڑکی بھائی ہی نہ تھی...... میں اپنی دنیا میں خوش تھا...... میں مریضوں کے معاملے میں نہایت ہی ذمہ دار اور سنجیدہ تھا۔ بیمار لوگوں کی خدمت کرکے مجھے روحانی سکون ملتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے میرے ہاتھوں میں شفا دے رکھی تھی۔ میری ہمدردی' دو پیار بھرے بول اور معمولی سی دوا سے مریض کو تندرست کردیتے تھے۔ مریض مجھ سے بہت ہی خوش اور مطمئن تھے۔ وہ لوگ مجھے دل سے دعا دیتے تھے اور ان کی یہی دعائیں میرا اثاثہ تھیں۔ مجھے کسی کی پروانہ تھی' کیونکہ میں اپنے پیشے سے مخلص تھا۔ مجھے سیر کرنے اور فلمیں دیکھنے کا شوق تھا۔ میں انڈیا کی آرٹ فلمیں خصوصی طور پر دیکھا کرتا تھا...... میں تین بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا' تینوں بھائیوں کی شادیاں ہوگئی تھیں' امی ابو اب مجھے بھی اس بندھن میں جکڑنا چاہتے تھے مگر میں شادی نہیں کرنا چاہتا تھا' اس لیے میں ان کو ٹال رہا تھا۔ نہ جانے کیا وجہ تھی کہ مجھے شادی کی کوئی خواہش ہی نہ تھی اور نہ ہی کوئی لڑکی میرے من کو بھائی تھی۔ امی ابو زیادہ زور دیتے تو میں ان کو یہ کہتا کہ...... ''میں نے اپنے پیشے سے شادی کرلی ہے۔''

میں مردانہ حسن و جمال کا نمونہ تھا۔ اس لیے لڑکیاں مجھ پر مرتی تھیں...... ڈاکٹر نیلوفر بھی ان میں سے ایک تھی۔ وہ وزارت ریلوے کے سیکریٹری کی بیٹی تھی...... حسن اور رعنائی میں اپنی مثال آپ تھی۔

اسپتال کے سارے ہی ڈاکٹر اس پر فدا تھے...... مگر وہ صرف مجھ پر مرتی تھی...... اس نے اپنی چاہت اور محبت کا ہر جال مجھ پر پھینکا...... مگر میں اس کے قابو میں نہ آیا۔ اس نے اپنا دل کھول کر میرے سامنے رکھ دیا اور شادی کی پیشکش بھی کر ڈالی...... مگر میں نے اس کی پیشکش ٹھکرا کر اسے خالی ہاتھ لوٹا دیا...... اس روز وہ بہت روئی تھی۔ جس روز میں نے اس کی محبت کو ٹھکرایا تھا' اس نے اپنی اس توہین کا بدلہ مجھ سے یوں لیا کہ اس نے اپنے باپ کو کہہ کر میرا تبادلہ اس دور دراز کے پہاڑی اور جنگلی علاقے کی ڈسپنسری میں کرا دیا...... میں نے اس پر بھی سکھ کا سانس لیا تھا کہ اب میں اس علاقہ میں آزادی کی زندگی گزاروں گا' کیونکہ وہاں میں نے وہی تمام ڈسپنسری سنبھالنی تھی...... میرے علاوہ وہاں اور کوئی ڈاکٹر نہ تھا۔

......☆☆☆......

"ریکس ہوٹل" جہاں...... میں ٹھہرا ہوا تھا' وہ بیضوی شکل کا دو منزلہ ہوٹل تھا...... نیچے والی منزل میں ریسٹورنٹ تھا' جبکہ دوسری منزل میں میں رہائشی کمرے تھے۔ جو بیضوی طرز پر ہی بنائے گئے تھے۔ درمیان کا حصہ خالی تھا۔ اس میں ایک چھوٹا سا تالاب بنایا گیا تھا' جس کا پانی نہایت ہی شفاف اور نیلا تھا...... اس میں رنگ برنگی خوبصورت مچھلیاں تیرتی رہتی تھیں' تالاب کے درمیان فوارہ تھا اور اس کے اردگرد رنگ برنگی لائٹس لگی تھیں۔ شام کو تمام لائٹس جلا کر جب فوارہ چلایا جاتا تو اس میں تیرتی مچھلیاں ایک مسحور کن نظارہ پیش کرتی تھیں۔ میں اکثر شام کو کمرے سے نکل کر بالکونی میں کھڑا ہو کر ان کا نظارہ کیا کرتا اور بہت ہی لطف اندوز ہوتا۔

ایک شام حسب معمول میں جب مچھلیوں کا نظارہ کرنے کے لیے بالکونی میں آ کر کھڑا ہوا تو میری نظر سامنے والے کمرے کی بالکونی میں کھڑی ایک دوشیزہ پر پڑی تو مجھے یوں لگا کہ میں برسوں صحراؤں کی خاک چھاننے کے بعد کسی نخلستان میں آ گیا ہوں...... وہ مچھلیوں کو تیرتا دیکھنے میں محو تھی اور میں اس کے لافانی حسن اور رعنائی کو دیکھنے میں محو تھا۔ میں نے اس سے قبل اس جیسی حسین لڑکی نہ دیکھی تھی۔ اس کے حسن نے چند لمحوں میں ہی مجھے اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا۔ میں جو پتھر کا بت تھا' چند لمحوں میں ہی موم کی طرح پگھل گیا۔ اس کا متناسب سیمیں بدن اور لازوال حسن میرے من میں ہلچل مچا گیا۔ میرا جی چاہتا تھا وہ اسی طرح مچھلیوں کو اور میں اسے دیکھتا رہوں۔ یوں ہی یہ شام رات میں ڈھل کر رہ جائے...... مگر یہ تسلسل برقرار نہ رہا' اس نے نظریں اوپر اٹھائیں تو مجھے اپنی طرف دیکھتا ہوا پایا تو وہ فوراً مسکراتی اور لجاتی ہوئی واپس کمرے میں لوٹ گئی۔ وہ میرے دل کا چین اور قرار بھی ساتھ ہی کر لے گئی۔ میں چند لمحے وہیں بالکونی میں کھڑا رہا کہ شاید وہ دوبارہ اپنا درشن کرانے آ جائے' مگر وہ نہ آئی' تو میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ مگر اب مجھے کسی پل بھی قرار نہ تھا۔ میں کھڑکی کے قریب کرسی رکھ کر بیٹھ گیا اور نظریں اس کے کمرے کی جانب لگا دیں' اس آس میں کہ شاید وہ دوبارہ بالکونی میں آ جائے۔ تمام رات بھی میں نے محبت کی اس آگ میں سلگتے ہوئے گزار دی جو پہلی نظر میں ہی میرے من میں سما گئی تھی' اگلا دن میں نے کمرے میں ہی گزار دیا۔ کہیں جانے کو جی ہی نہ چاہ رہا تھا۔ بس ہر لمحہ میری نظریں اس کے کمرے کی

جانب ہی لگی رہیں، مگر وہ نظر نہ آئی تو میں نے کمرہ سے باہر نکل کر گیلری کا ایک چکر لگایا مگر اس کا دیدار نہ ہوا...... ہوٹل والوں کو معلوم تھا کہ میں ایک ڈاکٹر ہوں، میں چونکہ ان کا ایک مہینے کا کسٹمر تھا، اس لیے وہ میری بہت عزت کرتے تھے۔ میں کوئی بھی کام کہتا تو منیجر فوراً ہی میرا مسئلہ حل کرا دیتا، لہٰذا میں نے سوچا کہ منیجر سے اس سلسلہ میں بات کروں اور پوچھوں کہ میرے کمرے کے سامنے والے کمرے میں کون لوگ ٹھہرے ہوئے ہیں...... مگر پھر اس خیال کو ترک کر دیا کہ منیجر نہ جانے میرے بارے میں کیا رائے قائم کرے۔

میں شام کو ہوٹل سے نکلا اور کشمیر پوائنٹ کی طرف گھومتا ہوا مال روڈ کی طرف نکل آیا، کچھ کھانے کا بھی موڈ نہ تھا۔ گیارہ بجے واپس ہوٹل آیا تو اس وقت بارش شروع ہوگئی اور ہوا میں خنکی بڑھ گئی۔ میں سونے کے ارادے سے لیٹ گیا۔ جلد ہی میری آنکھ لگ گئی...... رات دو بجے کا وقت ہوگا کہ کسی نے میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں بے دلی سے اٹھا، دروازہ کھولا...... ہوٹل کا منیجر باہر کھڑا تھا۔ اس کے ہمراہ ایک نوجوان لڑکی بھی تھی۔

"کیوں خیریت تو ہے؟" میں نے منیجر سے پوچھا۔

"ان کی دوست کو پیٹ میں شدید درد ہے، باہر بارش بہت تیز ہے، اس وقت انہیں کہیں لے جانا مشکل ہے۔ ڈاکٹر صاحب! اگر آپ ان کا چیک اپ کر کے کوئی دوا دے دیں تو مہربانی ہوگی۔"

منیجر نے اس لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"ہاں ہاں ...... ضرور۔" یہ کہہ کر میں واپس کمرے میں آیا اور ایمر جنسی بکس اٹھا کر ان کے ساتھ چل دیا۔

جب میں اس لڑکی کے ہمراہ اس کے کمرے میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ میرے سامنے وہی حسینہ درد سے تڑپ رہی تھی جس کو پہلی نظر میں ہی دیکھ کر پاگل ہوگیا تھا۔ میں نے اس کی نبض دیکھی، مختصر الفاظ میں اس کی تکلیف سنی تو مجھے یقین ہوگیا کہ اس کے گردہ میں درد ہو رہا ہے۔ میں نے فوری طور پر اسے دوا انجکشن لگائے...... تو درد میں افاقہ محسوس ہوا۔ میں کچھ دیر کے لیے وہاں ٹھہر گیا، جب اسے مکمل آرام آ گیا تو اسے نیند آ گئی، تو میں بھی واپس اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ میں بہت ہی مسرور تھا کہ میں نے ایک تو اپنا فرض نبھایا ہے اور دوسرا یہ کہ اس کا دیدار بھی ہوگیا ہے۔ جس کے لیے میں کئی گھنٹوں سے بے چین تھا...... اس کا نام صدف تھا اور ساتھ اس کی دوست نائلہ تھی۔ وہ دونوں بھی سیر کرنے کی غرض سے مری آئی تھیں۔

صبح جوں ہی میں اٹھا تو نائلہ آ گئی اور اس نے مجھے دعوت دی کہ آج آپ ناشتہ ہمارے ساتھ کریں گے۔ میں انکار نہ کر سکا۔ ہوٹل کے فیملی کیبن میں جب میں پہنچا تو صدف وہاں پہلے سے موجود تھی۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے تشکر کے جذبات تھے۔ پھر بھی اس نے زبان سے میرا شکریہ ادا کیا تو میں نے اس سے یہی کہا کہ یہ تو میرا فرض تھا پھر اس نے میری فیس اور ادویات کی رقم دینے کی بات کی تو میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ میرے خلوص اور فرض کا مذاق اڑا رہی ہیں۔"

وہ خاموش ہوگئی۔ ناشتہ کرنے کے دوران ہی ہم نے آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے کو بہت کچھ

دیا۔ صدف حسن اور رعنائی میں اپنی مثال آپ تھی۔ اس کی ہرنی سی بڑی بڑی آنکھیں، گلاب کی ادھ کھلی کلی کی پنکھڑیوں سے تراشے ہوئے لب، ستواں ناک جس میں بڑی نازک سی لونگ کا لشکارا میرے دل پر بجلیاں گرانے لگا...... جب میں نے اس سے اپنا مکمل تعارف کرایا اور یہ بتایا کہ اب میری تبدیلی ڈومیلی کی ڈسپنسری میں ہوگئی ہے تو وہ خوش ہوگئی اور کہنے لگی۔ میں بھی اسی علاقے کی رہنے والی ہوں۔ میرے والد ریلوے میں ہی ملازم ہیں، وہ ان دنوں ریلوے کراسنگ کے اس پار واقع گارڈ روم کے انچارج ہیں۔ اور وہ اکثر بیمار رہتے ہیں، انہیں کوئی دماغی اور نفسیاتی عارضہ ہے...... انہیں ڈر ہے کہ کہیں میڈیکل بورڈ والے ملازمت سے فارغ ہی نہ کردیں۔"

"تم فکر نہ کرو صدف! میں پیچیدہ اور نفسیاتی امراض کے مریضوں میں خصوصی دلچسپی رکھتا ہوں۔ میں تمہارے باپ سے ملوں گا۔ اس کا علاج کروں گا...... اور انشاءاللہ وہ صحت یاب ہوں گے۔"

صدف میری باتیں سن کر مطمئن سی ہوگئی اور کہنے لگی...... "کہ میں بھی اپنا علاج آپ ہی سے کراؤں گی...... مجھے گردے کا درد اکثر شدت سے ہوتا ہے۔" دو دن بعد ان دونوں نے واپس لوٹ جانا تھا۔ ان دو دنوں میں میں اور صدف ایک دوسرے کے قریب آگئے۔ ان دو دنوں میں جب بھی میری اس سے ملاقات ہوئی تو میں نے اس کی آنکھوں میں ایک عجیب پراسراریت محسوس کی...... کہ کبھی اس کی آنکھوں کا رنگ نیلا ہوا...... کبھی بلوری اور کبھی سیاہ...... میں اس اسرار کو نہ سمجھ پایا تھا...... وہ جب بھی مجھ سے جدا ہوکر اپنے کمرے کی طرف جاتی تو بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے "وی" کا نشان بناتی اور اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ میں نے ارادہ کرلیا تھا کہ ڈیوٹی جوائن کرتے ہی میں اس کے باپ کا علاج کروں گا اور جب وہ تندرست ہوجائے گا تو تب اس سے صدف کا ہاتھ مانگوں گا۔

❁❁❁ ...... ❁❁❁

اگلی صبح صدف اور نائلہ کی واپسی تھی...... میں شام کو ان کے کمرے میں ان کو خدا حافظ کہہ کر نکلا تو تب بھی صدف نے "وی" کا اشارہ دیا۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ میں صبح ان کو اپنی گاڑی پر ویگن اسٹینڈ پر چھوڑ آؤں گا...... صبح ہوئی تو میں تیار ہوکر ریستوران میں آگیا اور ان کا انتظار کرنے لگا۔ کافی دیر گزر گئی مگر وہ نہ آئیں...... تو میں ان کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ نہ وہ خود اور نہ ہی ان کا سامان...... میں نیچے آیا، اور منیجر سے پوچھا کہ وہ دونوں خواتین کس وقت ہوٹل چھوڑ کر گئی ہیں؟"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو وہ گئی ہیں۔"

منیجر کی بات نے مجھے حیران سا کردیا...... "کتنی دیر ہوئی؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"پندرہ منٹ گزرے ہوں گے۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے...... میں تو ایک گھنٹے سے ان کا انتظار کررہا تھا۔" یہ کہہ کر میں ہوٹل سے باہر نکلا اور گاڑی لے کر ویگن اسٹینڈ تک جاپہنچا۔ مگر وہاں تو ان کا نام ونشان نہ تھا۔ میں نے اڈہ والوں سے ان کا حلیہ بتا کر پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ایسی کوئی پسنجر ویگن پر بیٹھ کر پنڈی کی طرف نہیں گئی ہیں۔

میری الجھن اور پریشانی میں مزید اضافہ ہوگیا

کہ وہ مجھ سے ملے بغیر کیوں اور کہاں چلی گئی ہیں...... میں نے ان کو کافی تلاش کیا مگر مجھے ان کے بارے میں کچھ پتہ نہ چلا...... تھک ہار کر میں خاموش ہو گیا۔

❁❁❁......❁❁❁
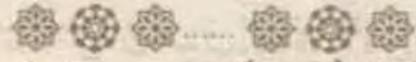
میری چھٹی ختم ہوئی تو میں راولپنڈی سے بذریعہ ٹرین ڈومیلی روانہ ہو گیا۔ ریل جوں ہی ڈومیلی کے دامن میں داخل ہوئی میں دروازے میں آ کر کھڑا ہو گیا اور پیچھے جاتے ہوئے درختوں اور پہاڑی سلسلوں کا نظارہ کرنے لگا۔ گاڑی کو چار مختلف سرنگوں سے گزر کر اسٹیشن تک پہنچنا تھا۔ یہ اسٹیشن اتنی بلندی پر واقع ہے کہ دیوہیکل انجن کے لیے بھی اس سے آگے نکلنا ناممکن ہو جاتا ہے...... میرا خاص مریض یعنی صدف کا باپ سب سے طویل اور آخری سرنگ کا نگران تھا اور پھر اس سے کچھ آگے میری منزل تھی۔

انجن بلندی کو سر کرنے کے لیے پورا زور لگا رہا تھا۔ اس کی چھک چھک نہایت خوفناک انداز میں پرسکون وادی کو بلا رہی تھی اور فضا میں سیاہ دھوئیں کا ایک دبیز بادل کسی اژدھے کی مانند جنم لے رہا تھا۔ گاڑی تین سرنگوں کی بھول بھلیوں سے نکل کر چوتھی سرنگ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ تینوں سرنگوں کے نگران شام کی دھند میں لالٹین ہلاتے بہت پیچھے رہ گئے تھے...... اور اب چوتھی سرنگ کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ میں اپنے مریض کا جائزہ چلتی گاڑی ہی سے لینا چاہتا تھا۔ نفسیاتی مریضوں کی حرکات و سکنات ان کی لاعلمی میں دیکھی جائیں تو بعض اوقات مرض کی تشخیص میں آسانی ہو جاتی ہے۔ میں نے انجن سے آگے پٹڑی کے ساتھ ساتھ نظر دوڑائی تو دور ایک ننھی سی روشنی حرکت کرتی دکھائی دی۔ یقیناً اس لالٹین کا مالک ہی صدف کا باپ ہوگا۔ لمحہ بہ لمحہ لالٹین قریب آتی گئی اور پھر لالٹین والے کا ہیولہ بھی نظر آنے لگا۔ گاڑی شاید زبردست چڑھائی اور سامنے آتی ہوئی سرنگ کی وجہ سے آہستہ ہو گئی تھی۔ میں دروازے میں چوکس ہو کر کھڑا ہو گیا اور اس کی حرکات و سکنات اور چہرے کے تاثرات اور ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ وہ پٹڑی کے بالکل ساتھ بنے ہوئے پختہ چبوترے پر ذرا پیچھے کھڑا لالٹین ہلا رہا تھا۔ قریب آنے پر میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ پچاس سال کے لگ بھگ ایک صحت مند انسان تھا۔ جسم کچھ فربہی مائل تھا...... ایک بات جو میں نے نوٹ کی وہ یہ تھی کہ وہ گاڑی کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ بلکہ اس کی آنکھیں سرنگ کے دھانے پر لگی ہوئی تھیں اور وہ لالٹین والا ہاتھ مشینی انداز میں ہلا رہا تھا۔ پھر میرا ڈبہ اس کے قریب سے ہوتا ہوا گزر گیا۔ اب میں نے گردن موڑ کر دیکھنا شروع کیا تاکہ اس کے چہرے کے تاثرات زیادہ صاف طور پر پڑھ سکوں، چہرے مہرے سے وہ خاصا مدبر نظر آ رہا تھا لیکن حواس باختگی کے آثار نمایاں تھے۔ اچانک میری نظر سب سے آخری ٹریلر پر پڑی جو گارڈ کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ گارڈ سفید وردی پہنے ٹریلر کا جنگلا تھامے قدرے باہر لٹک رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں چھوٹی سی گٹھڑی تھی۔ وہ شاید چلا کر لالٹین والے کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ جوں ہی اس کا ٹریلر لالٹین والے کے پاس سے گزرنے لگا، اس نے وہ گٹھڑی پختہ چبوترے پر دے ماری اور ٹریلر سے مزید باہر کی طرف لٹک کر

اسے کچھ کہنے لگا۔ میں نے لالٹین والے کی طرف دیکھا اس کی نظریں ابھی تک سرنگ کی طرف ہی لگی تھیں۔ اس کے چہرے پر سخت گھبراہٹ کے آثار تھے...... اچانک ایک دھماکہ ہوا اور گارڈ کی سر بریدہ لاش سنگلاخ زمین پر جاگری...... سر بریدہ اس لیے کہ گارڈ کا سر سگنل نما آہنی کھمبے سے ٹکرا کر پاش پاش ہو چکا تھا۔ قبل اس کے کہ میں حواس بحال کر کے گاڑی کی زنجیر کھینچتا...... میرا ڈبہ سرنگ کے اندھیرے میں گم ہو گیا۔ فوراً بعد ڈومیلی کا اسٹیشن تھا۔ اسٹیشن پر میں نے باقاعدہ رپورٹ درج کرائی اور بوجھل قدم اٹھاتا ہوا ڈاک بنگلے کی طرف چل پڑا۔

اگلا تمام دن سامان قرینے سے لگانے اور سفر کی تھکان اتارنے میں گزر گیا۔ شام کی چائے کے بعد میں یونہی سیر کی غرض سے نکلا اور اسٹیشن سے ہوتا ہوا سرنگ کی طرف چلنے لگا۔ کھلی فضا میں گرمی کم محسوس ہو رہی تھی۔ میں تیز تیز ڈگ بھرتا ہوا سرنگ میں داخل ہو گیا۔ سرنگ خاصی تاریک اور قوس کی صورت میں بنائی گئی تھی۔ اندر جا بجا ابابیلوں اور چمگادڑوں کے گھونسلے بنے ہوئے تھے اور ان کے فضلے کی بو نے فضا میں ایک تعفن پیدا کر رکھا تھا۔ میں اس بو سے نجات حاصل کرنے کے لیے تقریباً بھاگتا ہوا جوں ہی سرنگ کے دوسرے سرے پر نمودار ہوا...... نگران اپنی بینچ پر سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے منہ سے ایک نفرت انگیز چیخ ابھری اور وہ مخالف سمت میں بھاگ نکلا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس کا تعاقب شروع کر دیا اور اپنی رفتار تیز کر دی...... ایک بوڑھا فربہ اور خوفزدہ شخص ایک نوجوان سے کب تک مقابلہ کر سکتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اس بوڑھے کو جالیا۔ بوڑھا میری گرفت میں آنے کے باوجود مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے میں گوشت پوست کا انسان نہیں کوئی ہوائی شخصیت ہوں۔

''تت...... تت...... تم؟'' شدید گھبراہٹ اور خوف سے اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔ چہرے کی طرف دیکھا تو وہاں ہلدی کی بارش ہو رہی تھی۔

''ہاں بڑے میاں...... میں آپ ہی کے محکمے کا ڈاکٹر ہوں...... اور کل ہی یہاں پہنچا ہوں...... آج یونہی سیر کرتے ہوئے ادھر آنکلا ہوں۔''

میں نے ایک ہی سانس میں اپنا تعارف کروایا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر میں نے اسے جلد از جلد مطمئن نہ کیا تو کہیں میری گرفت میں ہی اس کی حرکت قلب نہ بند ہو جائے۔

بوڑھے نے ایک گہری سانس اپنے پھیپھڑوں میں اتاری...... بے یقینی اور بے بسی سے میری طرف دیکھا اور اپنا جسم میرے بازوؤں میں ڈھیلا چھوڑ دیا۔ میں نے اسے سہارا دیا اور ہم دونوں واپس کیبن کی طرف آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ میں قریب پہنچ کر اسے کیبن کے اندر لے گیا۔ ایسا کرتے ہوئے بوڑھے نے ایک اچٹتی سی نگاہ مجھ پر ڈالی...... اس کی آنکھوں میں شک کے سائے لہرا رہے تھے۔ اپنے مختصر سے کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ ایک چارپائی پر گر کر ہانپنے لگا۔ میں قریب ہی پڑی ہوئی ایک خستہ حال کرسی پر بیٹھ گیا اور کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ میز پر نہایت صاف دھلا ہوا میز پوش...... دو ٹرنک ایک طرف مٹی کے تیل کا چمکتا ہوا چولہا...... گلاس...... صراحی اور کتابوں کی ایک اوسط درجہ کی الماری...... میں نے بوڑھے کی طرف دیکھا...... وہ آنکھیں موندے گہری سانسیں لے

رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے جگمگا رہے تھے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ مریض کی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرلوں...... میں کتابوں کی الماری کی طرف متوجہ ہوا...... مریض کی ذہنی روش اور کسی خاص موضوع پر کتابوں کا انتخاب بھی اس کی نفسیاتی الجھنوں کو آشکار کرسکتا تھا۔ نفسیاتی مریض عموماً ایڈونچر' مہماتی' جاسوسی اور پراسرار قسم کی کہانیاں یا پھر ظلم وتشدد اور جنسی لذت کے حامل ناولوں کو پسند کرتے ہیں لیکن اس بوڑھے نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ اس کی الماری میں جہان دانش...... یادوں کی برات...... قائداعظم کی سوانح...... قاسم کی مہندی' خلافت اور ملوکیت' دشت وفا' دست تہ سنگ اور بانگ درا جیسی بلند پایہ مذہبی ادبی اور شعری کاوشات کا ذخیرہ تھا' جو اس کے صاف اور سلجھے ہوئے ذہن کی عکاسی کررہا تھا' کمرے میں کہیں بے ترتیبی یا ایسی افراتفری کا نشان تک نہ تھا جو اس کے کسی ذہنی الجھاؤ کی چغلی کھاسکے۔

میں نے صدف کے بوڑھے باپ کی طرف دیکھا وہ کافی سنبھل چکا تھا اور چور نظروں سے میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔

''بڑے میاں! اب طبیعت کیسی ہے؟'' میں نے نہایت نرم اور شستہ لہجے میں پوچھا۔

''ٹھیک ہوں......'' بوڑھے نے بے دلی سے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے جواب دیا...... سراسیمگی کی پرچھائیاں اب بھی اس کے زرد چہرے پر ناچ رہی تھیں۔

میں کرسی سے اٹھا...... میرے حرکت کرتے ہی وہ ایک دم چوکنا ہوگیا اور ایک بار تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اٹھ کر مجھ پر حملہ ہی نہ کر بیٹھے۔ لیکن میں اطمینان اور آہستہ سے چلتا ہوا صراحی تک گیا' گلاس میں پانی انڈیلا اور اسے ہاتھ کے سہارے سے اٹھا کر پینے کا اشارہ کیا۔ بوڑھا جیسے جنم جنم کا پیاسا تھا۔ ایک ہی سانس میں سارا گلا چڑھا گیا۔ میرے دل میں لاتعداد سوال سر اٹھا رہے تھے لیکن ایک ماہر ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے مرض کی مکمل نوعیت سمجھنے کے لیے ضروری تھا کہ صبر وتحمل کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دوں۔ میں نے نہایت شائستگی سے اس کی نبض کی رفتار اور دل کی دھڑکن کا جائزہ لیا۔ دونوں باقاعدگی سے چل رہی تھیں۔

''اچھا بڑے میاں' اب میں چلتا ہوں۔ کل مزاج پرسی کے لیے حاضر ہوں گا۔ اس دوران اگر طبیعت پھر ناساز ہوجائے تو بلاتکلف مجھے ڈاک بنگلہ سے بلوا لیجیے گا۔''

میں نے اس جملے کی ادائیگی میں اپنائیت کوٹ کوٹ کر بھردی تھی۔ تجربہ شاہد ہے کہ نفسیاتی مریضوں کا اعتماد حاصل کرلینا ہی بعض اوقات معالج کے تمام مسائل حل کردیتا ہے۔ گارڈ کے کمرے سے نکلتے ہی مجھے سرنگ کے اس تعفن کے خیال سے متلی سی آنے لگی جس میں سے گزر کر مجھے ڈاک بنگلے تک پہنچنا تھا۔

اگلی چند ملاقاتوں نے بوڑھے کو ایک کھلی کتاب بنادیا۔ میں نے اس سے ابھی تک صدف اور اس سے ملاقات کا ذکر نہیں کیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ جب وہ مکمل طور پر صحت یاب ہوجائے تو پھر اس سے اس بارے میں بات کروں گا۔ جوں جوں اس کی کتاب کے صفحات الٹتے گئے۔ وہ ایک ناقابل حل معمہ بنتا چلا گیا۔ صدف کے باپ کا نام امیر علی

تھا' تھا تو وہ مہاجر مگر وہ ذہنی طور پر جنم جنم کا پاکستانی تھا۔ دل میں اسلامی اتحاد کا درد رکھتا تھا۔ غالب سے اقبال اور میرامن سے میراجی تک بڑے متوازن اور رواں انداز میں تبصرہ کر سکتا تھا۔ اس کی عالمی سیاست پر بھی گہری نظر تھی جن بھوتوں' تعویذ گنڈوں' پیروں فقیروں اور بدروحوں وغیرہ کے متعلق بھی اس کا ذہن صاف اور رائے بے لاگ تھی۔ اس پس منظر کے ساتھ جب میں نے اس کی ناقابل یقین داستان سنی تو اس کی ذہنی الجھن یا کسی نفسیاتی مرض کا سراغ لگانا جوئے شیر لانے کے برابر دکھائی دیا۔ بلکہ سچ پوچھیے تو اس کہانی نے خود مجھے بھی بوکھلا دیا تھا۔

❁❁❁ ...... ❁❁❁
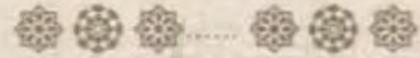
امیر علی کے بیان کے مطابق ایک روز مسافر گاڑی کو گزرنے کے لیے جوں ہی وہ جھنڈی پکڑ کر پختہ چبوترے کی طرف آیا' اچانک سرنگ کے دہانے پر ایک شخص نمودار ہوا اور وہیں کھڑے ہو کر امیر علی کی سمت دایاں ہاتھ اٹھایا' اس کے ہاتھ کی مٹھی بند تھی...... پھر امیر علی نے دیکھا کہ اس نے درمیانی اور شہادت کی انگلیوں کو وی کی شکل بنا کر بلند کیا اور ہوا میں لہرانے لگا۔ امیر علی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا' اور وہ اس کی طرف بڑھا تا کہ اس کے قریب جا کر اس سے اس اشارہ کی وضاحت طلب کرے' لیکن جوں ہی امیر علی آگے بڑھتا گیا' وہ شخص قدم قدم پیچھے ہٹتا چلا گیا اور آخر کار سرنگ کے پر تعفن اندھیرے میں گم ہو گیا۔ امیر علی ابھی اسے تلاش ہی کر رہا تھا کہ ریل کی چھک چھک' چھکا چھک سنائی دی...... وہ فوراً مڑا اور دوڑتا ہوا اپنی جگہ پر پہنچا اور جھنڈی ہلا کر ریل کو سب اچھا کا اشارہ دینے لگا......

ریل آئی اور بھاگتی ہوئی سرنگ میں داخل ہو گئی' ابھی وہ بمشکل سرنگ سے نکلی ہو گی کہ امیر علی کو مسافروں کی چیخیں سنائی دیں...... وہ غیر ارادی طور پر بھاگتا ہوا سرنگ میں داخل ہو گیا اور جب پرلے سرے پر نکلا تو جو منظر اس نے دیکھا...... اس نے اسے ساکت کر دیا' سامنے پٹڑی پر دو عورتوں کی لاشیں پڑی تھیں' وہ ماں بیٹی تھیں...... ان دونوں کا دھڑ دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا' بیٹی شاید نوبیاہتا تھی اور لہو اس کے سہاگ کے جوڑے کو سرخ بنا رہا تھا......

گاڑی سامنے ڈومیلی کے اسٹیشن پر رک چکی تھی اور لوگ بھاگتے ہوئے ان بدنصیب ماں بیٹی کی خودکشی کا نظارہ کرنے آ رہے تھے۔ امیر علی اتنا خوفزدہ ہو گیا کہ اس کی آواز ہی نہ نکل رہی تھی...... وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر آواز اس کا ساتھ نہ دے رہی تھی۔ اس کے ذہن میں جو بات چپک کر رہ گئی وہ نوجوان لڑکی کی لاش کے ساتھ ساتھ اس پراسرار شخص کی تصویر اور اشارہ تھا جو اس نے انگلیوں کی مدد سے بنایا اور کیا تھا۔

اس دن کے بعد آج تک چھ ماہ گزر چکے تھے اور ان چھ مہینوں میں وہ پراسرار شخص تین بار سرنگ کے دہانے پر نمودار ہوا' تینوں مرتبہ ہی امیر علی نے اسے اپنے ہاتھ کی انگلیوں کا اشارہ کرتے ہوئے دیکھا۔ اس کے اشارے کے فوراً بعد سرنگ سے ذرا پیچھے یا اسٹیشن سے پہلے ایک نہ ایک جان حادثاتی طور پر ضائع ہو گئی تھی اور میری آمد والے روز تو بے چارے امیر علی کا ایک رشتہ دار گارڈ ہلاک ہو گیا تھا۔ اس روز بھی امیر علی اس پراسرار شخص کی طرف متوجہ ہوا اور گارڈ اسے دھوبی کے دھلے ہوئے کپڑے پکڑانے کے لیے اس قدر باہر لٹک گیا تھا کہ اس

کا سر چبوترے کے کھمبے سے ٹکرا گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس روز میں نے کسی پراسرار شخص کو سرنگ کے دہانے پر انگلیاں لہراتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی سرنگ کے اندر یا اس سے آگے کوئی انسان نظر آیا تھا۔

لیکن یہ کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی۔ کیونکہ نفسیاتی مریضوں کو ایسے خیالی پیکر عالم بیداری میں دکھائی دیتے رہتے ہیں۔ سوچنے کی بات صرف یہ تھی کہ یہ خیالی پیکر حادثے سے پہلے کیوں نمودار ہوتا ہے...... میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ شاید امیر علی کی چھٹی حس ضرورت سے زیادہ بیدار ہے اور یہ سب اسی کی کرشمہ سازی ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود مجھے رہ رہ کر احساس ہوتا تھا کہ امیر علی اب تک اس داستان کی کوئی نہ کوئی کڑی مجھ سے چھپا رہا ہے۔ میری مسلسل کرید پر جب وہ کڑی واضح ہوئی تو مجھ پر اتنی زبردست بوکھلاہٹ کا حملہ ہوا کہ اگر میں اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش بھی کرتا تو یقیناً ناکام رہتا۔ امیر علی کے بیان کے مطابق اس پراسرار ہستی کی شکل ہو بہو مجھ سے ملتی تھی۔

"خدا کی قسم ڈاکٹر صاحب! میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کے دائیں گال پر اتنا ہی بڑا سیاہ تل ہے۔" اس نے میرے دائیں گال پر ایک تل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ "آپ کو یاد ہوگا کہ پہلے دن آپ کو سرنگ سے نکل کر اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ کر ہی میں خوف سے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔"

کسی اور کے لیے ہو تو ہو...... کم از کم ایک ڈاکٹر جو نفسیات کا بھی ماہر ہو...... کے لیے یہ بات قطعاً قابل فخر نہ تھی کہ وہ کسی مریض کے لاشعور میں کوئی شیطانی روپ دھار کر ایک منحوس کردار ادا کرتا پھرے۔

اب تک تو میں اس معاملے کو معمول کا ایک کیس سمجھ کر نمٹا رہا تھا لیکن اس انکشاف کے بعد میں نے اسے اپنے لیے ایک چیلنج کے طور پر قبول کر لیا۔ میں نے ایک بار پھر امیر علی سے اس کے خاندانی حالات اور پیدائش سے لے کر اب تک کے واقعات پوری تفصیل سے سنے...... تو مجھے ایک اور حیران کن انکشاف کا سامنا کرنا پڑا...... صدف اس کی بیٹی تھی، مگر وہ دو سال قبل کسی پراسرار بیماری میں مبتلا ہو کر مر گئی تھی۔ تو پھر وہ صدف کون تھی جو مجھے مری میں ریکس ہوٹل میں ملی تھی۔ مجھ سے محبت کا اقرار کیا تھا اور اپنے باپ کے علاج کے لیے کہا تھا۔ میں تو چکرا کر رہ گیا۔ کہ یہ سب کیا ہے؟ میں نے امیر علی سے صدف کے متعلق کوئی بات نہ کی...... میں نے امیر علی کی باتوں کا باریکی کے ساتھ تجزیہ کیا اور مجھے یہ کہنے میں عار نہیں کہ اپنے وسیع تجربے کے باوجود مجھے ایک بھی ایسا نفسیاتی نکتہ نہ مل سکا جسے پکڑ کر میں اس الجھی ہوئی ڈور کو سلجھا سکوں...... سرنگ کے دہانے پر میرے ہم شکل شخص کا نمودار ہو کر ہاتھ کی دو انگلیوں کا اشارہ کرنا...... اور صدف کا مری کے ہوٹل میں آخری بار مجھے اسی طرح دونوں انگلیوں کو "وی" کی شکل بنا کر الوداع کہنا...... یہ کیسی مماثلت تھی......؟ ناقابل یقین اور پراسرار......!

امیر علی سے میں نے وہاں سے گزرنے والی تمام گاڑیوں کے اوقات معلوم کیے، آخری حربے کے طور پر میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ میں تمام گاڑیوں کی آمد و رفت کے وقت امیر علی کے ساتھ موجود رہوں اور امیر علی کی حرکات و سکنات

کا جائزہ لوں بلکہ اگر وہ میرا ہمزاد سامنے آئے تو اس سے بھی دو دو ہاتھ کر سکوں...... میں ڈسپنسری کو تو بھول ہی گیا اور اسی کام میں لگ گیا۔ اگلے اکیس دن اسی ڈیوٹی میں گزر گئے...... امیر علی کبھی کبھی ہنس کر کہتا کہ......!

''صاحب جی! آپ ڈاکٹری سے زیادہ بہتر گارڈ کے فرائض انجام دے سکتے ہیں۔''

میں اس کے اس جملے میں چھپے ہوئے طنز کو برداشت کر جاتا...... ورنہ کہاں میں اور کہاں یہ پیشہ...... خدا خدا کر کے اکیسویں روز ہماری محنت رنگ لائی...... شام کا جھٹپٹا تھا...... شہر سے مسافر گاڑی کی آمد تھی ہوا کا ایک آدھ جھونکا...... چھک چھک چھک چھک کی آواز اڑاتا ہوا معدوم ہو جاتا...... امیر علی نے لالٹین جلائی اور پختہ چبوترے کی طرف چلنے لگا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہولیا...... وہ اپنے مخصوص چبوترے پر کھڑا ہو گیا...... میں اس سے دو تین قدم آگے سرنگ کی جانب ٹھہر گیا اور شہر کی سمت نظریں جما دیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد پٹڑی پر دیوہیکل انجن نمودار ہوا۔ اس کی چمنی سے گاڑھا کثیف دھواں اور شکم سے نہایت خوفناک آوازیں نکل رہی تھیں۔ جیسے وہ بلندی کو سر کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہو۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پوری وادی میں زلزلہ آ گیا ہے۔ پراسرار ماحول اور ملگجے اجالے میں امیر علی کی ہلتی ہوئی لالٹین کی روشنی سایوں سے دست و گریبان تھی۔ اچانک میری نگاہ امیر علی پر پڑی...... اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر ابلی ہوئی تھیں اور لالٹین والا ہاتھ مشینی انداز میں چل رہا تھا...... اس کی نظروں کے تعاقب میں...... میں نے سرنگ کے دہانے کی طرف دیکھا لیکن وہاں تو کچھ بھی نہ تھا...... ہمیشہ کی طرح ویرانی آج بھی رقص کر رہی تھی یا پھر چند ابابیلیں تھیں جو شاید انجن کے بے ہنگم شور سے گھبرا کر سرنگ کے دہانے پر پھڑ پھڑا رہی تھیں۔

''امیر علی...... امیر علی!'' میں نے قریب آتی ہوئی ریل کے شور میں اسے پکارا لیکن وہ تو جیسے پتھر کا بت بن چکا تھا۔ جس پر کوئی آواز اثر نہیں کرتی...... آخر میں نے قدم بڑھا کر اسے شانوں سے پکڑا اور جھنجوڑ ڈالا۔

''امیر علی...... امیر علی۔''

''وہ دیکھو ڈاکٹر! وہ اشارہ کر رہا ہے ایک عجیب وغریب اشارہ!'' اس کے ادھ کھلے منہ سے ایک عجیب آواز نکلی لیکن آنکھیں بدستور سرنگ کے دہانے پر جمی رہیں۔ میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا لیکن وہاں کچھ بھی نہ تھا...... نہ غم نہ خوشی نہ مذاق نہ اداکاری نہ حقیقت...... مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں ایک لاش کے پاس کھڑا ہوں ایسی لاش جس کا صرف ایک لالٹین والا بازو زندہ ہے......

میں نے اپنی عملی زندگی میں بے شمار مریضوں کو نفسیاتی دورے پڑتے دیکھے ہیں۔ لیکن ڈومیلی کی آخری سرنگ کے اس بوڑھے گارڈ کا دورہ میرے لیے ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔ مریض کا نفسیاتی دورہ معالج کے لیے ایک سنہرا موقع ہوتا ہے۔ اگر وہ اس وقت ذرا غور وفکر سے کام لے تو مرض کی تہہ تک پہنچنا خاصا آسان ہو جاتا ہے بعض مریضوں کے نفسیاتی دوروں کو جلد از جلد ختم بھی کیا جا سکتا ہے لیکن اس کیس میں ایسا کرنا مناسب نہ تھا۔ میں پورے دورے کی مدت میں بڑے صبر وتحمل سے امیر علی کی حرکات وسکنات دیکھتا اور اس کی تمام بے

سر و پا باتیں سننا چاہتا تھا تا کہ اس کے لاشعور میں چھپی ہوئی الجھن کا تجزیہ کر سکوں۔

"عجیب و غریب اشارہ؟ کیا آج وہ کوئی نیا اشارہ کر رہا ہے؟" میں نے کافی بلند آواز میں پوچھا۔ قریب آئی ہوئی ریل کا انجن جیسے نزدیک آ کر ہانپنے لگا تھا۔

"ہاں ڈاکٹر......! وہ آج ڈیڑھ انگلی کا اشارہ دے رہا تھا۔"

"ڈیڑھ انگلی کا اشارہ...... کیا مطلب؟"

"ہاں ہاں...... وہ دیکھو...... بالکل تم جیسا آدمی...... درمیانی انگلی کھڑی ہے اور شہادت کی انگلی کو درمیان سے خم دیئے دائیں ہاتھ کی مٹھی ہوا میں لہرا رہا ہے۔"

میں نے دیکھا کہ امیر علی اس مدہوشی کے عالم میں بھی لالٹین ہلا ہلا کر ریل کو سب اچھا کا سگنل دے رہا ہے۔ یہ اس کے مرض کا ایک قابل غور پہلو تھا...... میں نے ریل کی طرف دیکھا...... وہ تقریباً آدھے فرلانگ کے فاصلے پر تھی...... پٹڑی بالکل صاف تھی اور دونوں طرف دور دور تک کوئی ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سرنگ والے اس طرف اگلے چند ثانیوں میں کسی حادثے کا کوئی امکان نہ تھا لہٰذا میں اطمینان سے دوبارہ اپنے مریض کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"امیر علی! ذرا مجھے بھی تو دکھاؤ وہ شخص!"

"وہ دیکھو ڈاکٹر! سرنگ کی دیوار کی ساتھ...... وہ...... وہ سرنگ کی بل کھاتی دیوار کے ساتھ...... اب وہ آہستہ آہستہ پیچھے کھسک رہا ہے۔"

"مجھے تو کچھ نظر نہیں آ رہا...... کیا اب بھی وہ کوئی اشارہ دے رہا ہے؟"

"ہاں ڈاکٹر......! ڈیڑھ انگلی کا اشارہ...... دیکھو اب وہ کچھ اوجھل ہوتا جا رہا ہے۔" میں نے دیکھا امیر علی پلیٹ فارم کے کنارے لگے ہوئے کھمبے کو پکڑ کر اسے دیکھنے کے لیے پٹڑی کی طرف جھکا ہوا ہے...... اچانک وہ اور زیادہ لٹک گیا...... او ر پورے زور سے چیخا۔

"دیکھو ڈاکٹر......! وہ اب پھر سامنے آ گیا ہے۔"

میں فوراً سرنگ کی طرف گھوما...... اور چند ثانیے سرنگ کے اندھیرے میں اس پراسرار شخص کی تلاش میں نظریں گھماتا رہا۔ یکایک سرنگ سے پانچ ابابیلیں پھڑ پھڑاتی ہوئی برآمد ہوئیں۔ میں بے اختیار ہنس پڑا اور بولا۔

"یہ ہے میرا ہمزاد...... کیوں امیر علی؟" میں نے اس جملے کا ردعمل مریض کے چہرے پر دیکھنے کے لیے اپنی ایڑیوں پر گھومنے ہی والا تھا کہ مجھے اپنے عقب میں ایک زبردست دھماکہ سنائی دیا اور اس کے فوراً بعد یوں محسوس ہوا جیسے گوشت کے گرم گرم لوتھڑے میری گردن سے چپک گئے ہوں۔ ابھی میں بمشکل پیچھے گھوما ہی تھا کہ امیر علی کی سر کٹی لاش پورے زور سے مجھ پر آن گری۔ اس کا سر پٹڑی کی طرف بہت زیادہ جھک جانے کی وجہ سے پہلے ڈبے کے کونے سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا تھا۔ میں اس اچانک بوجھ کو برداشت کرنے کے لیے قطعاً تیار نہ تھا۔ لہٰذا اپنی پوری کوشش کے باوجود اپنے آپ کو نہ سنبھال سکا اور امیر علی کے مردہ جسم سمیت چبوترے سے نیچے پٹڑی کے کنارے جا گرا...... ریل...... ایک مشینی آرے کی طرح چلتی رہی اور میں بے ہوشی کے اندھیروں میں ڈوبتا چلا

گیا۔

❁❁❁........❁❁❁

اس حادثے کے آٹھ دن بعد جب میں ہوش میں آیا تو میں راولپنڈی کے ریلوے اسپتال میں تھا۔ میں نے چیف میڈیکل آفیسر اور ڈاکٹر نیلوفر کو اپنے اوپر جھکے ہوئے پایا۔ ان کے چہروں پر تشویش کی گہری پرچھائیاں لہرا رہی تھیں۔

''سر! کیا سرنگ والے حادثے میں امیر علی کے ساتھ کوئی اور جان بھی ضائع ہوئی تھی؟'' میں نے اپنی حالت کو نظر انداز کرتے ہوئے ان سے پوچھا۔

''نہیں صرف امیر علی ہی ہلاک ہوا تھا؟'' چیف میڈیکل آفیسر نے کہا اور اس کے ساتھ ہی ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ڈاکٹر نیلوفر کی آنکھیں بھی برسنے لگیں۔ ان دونوں کی آواز رندھ گئی۔ میں سمجھا کہ ان کو امیر علی کی موت کا دکھ ہوا ہے۔

''تو پھر ڈیڑھ انگلی کے اشارے کا کیا مطلب تھا؟'' میں منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

اتنے میں میرے ماں باپ اور بھائی کمرے میں داخل ہوئے...... میں نے انہیں خوش آمدید کہنے کے لیے کہنیاں ٹیک کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا...... درد کی شدید لہر میرے بدن میں بجلی کی طرح کوندی اور ایک دلخراش چیخ میرے ہونٹوں سے نکل کر کمرے میں پھیل گئی۔ پراسرار اشارے کا مطلب مجھ پر پوری طرح واضح ہو چکا تھا۔

میری دونوں ٹانگیں ریل کے پہیوں تلے کٹ کر میرے جسم سے الگ ہو چکی تھیں...... اور بغیر ٹانگوں کا آدمی...... آدھا ہی تو ہوتا ہے۔ ادھورا نامکمل انسان۔

ریلوے اسپتال کے بستر پر میں دو ماہ لیٹا رہا اس دوران میں میں نے گذشتہ دو ماہ سے قبل پیش آنے والے تلخ لیکن حیرت انگیز واقعات کا کافی حد تک تجزیہ کرنے کے بعد انہیں نفسیات کے کسی نہ کسی خانے میں فٹ کر ہی لیا تھا لیکن دو ماہ بعد ایک ایسی خبر سننے میں آئی جس نے میرے سارے تجزیئے نفسیاتی فلسفے کے علم کو تہ و بالا کر دیا ہے۔

میرے خیال میں علم نفسیات کی لاج رکھنے کے لیے مجھے ایک بار پھر ڈومیلی کے مقام پر جانا پڑے گا۔ وہ خبر کچھ یوں تھی کہ ڈومیلی کی سرنگ کے نئے انچارج خادم حسین کی آنکھوں کے سامنے ایک شخص نے ریل کے نیچے آ کر خودکشی کر لی تھی' لیکن اس حادثے سے قبل خادم حسین نے ایک پراسرار شخص اور ایک عورت کو سرنگ کے دہانے پر نمودار ہوتے دیکھا...... وہ دونوں اپنی ایک ایک انگلی لہرا کر اس سے ''وی'' کا نشان بنا رہے تھے اس پراسرار شخص کے دائیں گال پر ایک سیاہ تل تھا' اس کی دونوں ٹانگیں جڑ سے کٹی ہوئی تھیں اور وہ عورت کے ساتھ بیساکھیوں کے سہارے چلتا ہوا سرنگ کے اندھیرے سے روشنی میں آیا تھا...... یہ بھی بتایا گیا کہ وہ عورت امیر علی کی بیٹی صدف تھی۔

مگر مجھے نیلوفر نے دوبارہ ڈومیلی نہ جانے دیا تھا' کیونکہ اب وہ میری بیوی تھی...... اس نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ مجھ سے سچی محبت کرتی ہے۔

☐

گھونسلہ

زرین قمر

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں کسی شے کو بلا وجہ پیدا نہیں کیا' ہر چیز کا کوئی نہ کوئی مصرف ضرور رکھا ہے۔
دہشت گردی کا شکار ایک شخص کا احوال' اپنی دگرگوں حالت کے باوجود وہ کسی کے لیے زندگی کی علامت بن گیا ہے۔

شہر کے مصروف ترین علاقے میں ایک زبردست دھماکا ہوا تھا۔ ہر طرف افراتفری کا عالم تھا لوگ اِدھر سے اُدھر بھاگ رہے تھے' زخمیوں کی آہ و بکا اور چیخ و پکار کے ساتھ ایمبولینسز کے سائرن میں کان پڑی آواز سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ مختلف رضا کار تنظیموں کی یہ ایمبولینسز جائے حادثہ سے اسپتال اور اسپتال سے جائے حادثہ کی طرف دوڑتی پھر رہی تھیں مختلف ٹی وی چینلز کی گاڑیاں بھی موقع پر موجود تھیں جو اپنے اپنے نیوز چینلز کے لیے لائیو نیوز بھیج رہی تھیں۔ ہر کسی کی یہی کوشش تھی کہ اس کے چینل سے یہ خبر پہلے نشر ہو یا کوئی ایسی بات اس واقعے سے متعلق وہ اپنے چینل تک پہنچادیں جو کسی اور چینل سے نشر نہ ہوئی ہو مختلف نیوز رپورٹرز ہاتھ میں مائیک لیے لوگوں کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ کیمرہ مین ان کے ساتھ ساتھ تھے۔ موقع پر موجود کام کرنے والوں میں بہت سے چہرے تھے جو اداس تھے' پریشان تھے اور ملک میں موجود اس نا ختم ہونے والی صورت حال سے ناخوش تھے کوئی بھی ان خود کش حملوں کو پسند نہیں کرتا تھا۔

اس حادثہ میں کئی لوگ موقع پر ہی ہلاک ہوگئے تھے اور بہت سے لوگ زخمی ہوئے تھے جنہیں شہر کے مختلف علاقوں میں موجود اسپتالوں میں منتقل کردیا گیا تھا شہر میں تھا۔ چند گھنٹے گزرنے کے بعد جائے حادثہ پر لوگوں کا رش کم ہوگیا تھا اور اب اسپتالوں میں لوگوں کی تعداد بڑھ رہی تھی جو اپنے لواحقین کو ڈھونڈنے یا ان کی خیریت پتا کرنے وہاں آرہے تھے۔

سول اسپتال کے جنرل وارڈ میں سرخ دیوار کے ساتھ لگے بیڈ پر محی الدین خاموش لیٹا چھت کو تک رہا تھا اسے کچھ ہی دیر پہلے طبی امداد دی گئی تھی اور وہ اسی دھماکے میں زخمی ہوکر یہاں آیا تھا اس کا ذہن بالکل بلینک تھا اچانک چند لوگ ایک اسٹریچر پر ایک شخص کو تیزی سے وارڈ میں لائے اور اس کے بیڈ کے سامنے خالی جگہ پر دوسرا بیڈ لگا کر اس شخص کو لٹا دیا گیا اس کے آکسیجن لگی ہوئی تھی۔ ٹانگ اور کمر پر گہرے زخم تھے اور ابھی آپریشن تھیٹر سے اسے یہاں منتقل کیا گیا تھا وہ غالباً بے ہوش تھا کیونکہ چپ چاپ اور ساکت پڑا ہوا تھا۔

وارڈ میں ہر طرف زخمیوں کے کراہنے اور مریضوں کے ساتھ آنے والے لوگوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں لیکن محی الدین یہ آوازیں سننے کے باوجود ان الفاظ کو سمجھ نہیں پارہا تھا جو اس کے کانوں میں پڑ رہے تھے کچھ دیر وہ بے معنی نظروں سے وہاں موجود لوگوں کو دیکھتا رہا اور پھر آہستہ آہستہ اس پر غنودگی چھاتی چلی گئی۔

وہ وقت کی قید سے آزاد نجانے کب تک یونہی پڑا رہا تھا کہ اسے اپنے بازو میں چبھن کا احساس ہوا

اور اس نے آنکھیں کھولیں اس کے سامنے سفید لباس میں ملبوس ایک لڑکی کھڑی تھی اس نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو۔
''میں کہاں ہوں؟''
''خدا کا شکر ہے تمہیں ہوش آ گیا تم کل سے بے ہوش تھے۔'' سسٹر نے اس سے کہا اور اسے اچانک وہ دھماکہ یاد آیا جس کے بعد اسے اپنا ہوش نہیں رہا تھا۔
''ایک دھماکہ ہوا تھا۔'' اس نے کراہتے ہوئے کہا۔
''ہاں تم زخمیوں میں تھے تمہیں یہاں کوئی چھوڑ کر گیا ہے۔'' سسٹر نے کہا وہ خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔
''تم اپنا کوئی پتا یا فون نمبر دو تاکہ تمہارے گھر اطلاع کر دی جائے۔'' سسٹر نے پھر کہا۔
اس نے اپنا نام بتاتے ہوئے اپنا پتا اور فون نمبر بھی بتا دیا۔
''ٹھیک ہے محی الدین میں تمہارے گھر فون کرواتی ہوں تمہارے گھر میں کون کون ہے۔'' سسٹر نے پوچھا۔
''میری بیوی اور دو بچے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''دراصل میں یہاں پردیسی ہوں روزگار کی خاطر دوسرے شہر سے آیا ہوں میری بیوی سے کہیے گا کہ وہ گھر پر کسی کو اطلاع نہ دے وہ لوگ پریشان ہوں گے دور ہیں اتنی جلدی آ بھی نہیں سکتے۔'' محی الدین نے مایوسی سے کہا اور سسٹر اثبات میں سر ہلاتی ہوئی چلی گئی تب ہی محی الدین کی نظر ایک شخص پر پڑی جس کے آکسیجن لگی ہوئی تھی وہ خالی خالی نظروں سے محی الدین کو دیکھ رہا تھا۔ محی الدین نے وارڈ میں چاروں طرف نظر دوڑائی یہاں کم از کم دس بارہ افراد تھے جو اپنے مریضوں سے ملنے آئے تھے وہ مختلف بیڈز کے اطراف لگی بینچوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور اپنے مریضوں سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ محی الدین یہ ماحول دیکھ کر رنجیدہ ہو گیا اور ملک میں ہونے والے ان ناگہانی دھماکوں کے بارے میں سوچنے لگا جو کبھی خودکش حملوں کے نام پر کبھی دہشتگردی کے نام پر کیے جا رہے تھے اور جن کا شکار غریب عوام بن رہے تھے کتنے ہی گھر صفحہ ہستی سے مٹ گئے تھے جن کی کہانی سنانے والا بھی کوئی نہیں بچا تھا۔ کتنے ہی بچے اپنے کھو جانے والے باپوں کے منتظر تھے جو روزی کمانے نکلے اور کسی دھماکے کا شکار ہو گئے۔ اس نے ایک ٹھنڈی سی آہ بھری اور اپنے بیڈ کے قریب ہی دیوار میں بنی کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔
اس نے اندازہ لگایا تھا کہ اس کی ٹانگ بری طرح زخمی ہوئی تھی لیکن وہ سہارا لے کر بیٹھ سکتا تھا۔
''تم حادثے کے وقت کہاں تھے جو زخمی ہو گئے؟'' وارڈ میں موجود ایک اور زخمی کے رشتہ دار نے اس سے پوچھا۔
''میں پرچون کی دکان سے سودا لے رہا تھا کہ قریبی کھڑی کار میں دھماکہ ہوا تھا پھر لوگ اِدھر اُدھر بھاگنے لگے میں بھی گر گیا تھا بس...... اس سے زیادہ یاد نہیں۔'' اس نے دماغ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد اس سے یہ سوال کئی بار پوچھا گیا میڈیا والے کئی رپورٹر بھی اپنے مائیک اور کیمرے لیے وارڈ میں آئے تھے اور اس سے بھی

سوال کیے گئے تھے اس کا ایک ہی جواب تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ خبریں بنانے والے تو بہت آرہے تھے پر خبر گیری کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ اسپتال میں موجود ناکافی عملہ سے جو کچھ ہو رہا تھا وہ کر رہے تھے اچانک اسے سامنے والے بیڈ سے سسکیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ وہی شخص تھا جس کے آکسیجن لگی ہوئی تھی۔

''کیا ہوا دوست؟'' محی الدین نے پوچھا۔ سامنے والے نے اس کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے لیکن وہ خاموش تھا اچانک کمرے میں ڈاکٹر داخل ہوا اس کے ساتھ نرسز بھی تھی وہ باری باری تمام زخمیوں کا معائنہ کر رہا تھا اور ان کی خیریت پوچھ رہا تھا جو محی الدین کو دیکھنے کے بعد وہ اگلے بیڈ کی طرف بڑھ گیا۔

''اس کا کیا حال ہے' یہ ہوش میں آگیا ہے اور اب آکسیجن کی بھی ضرورت نہیں۔'' ڈاکٹر نے کہتے ہوئے آکسیجن ماسک اس کے چہرے سے ہٹا دیا محی الدین نے اندازہ لگایا وہ بیس بائیس سال کا نوجوان تھا اس کی کمر' سر اور پیروں میں گہرے زخم تھے وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنی آنکھیں صاف کر رہا تھا جس سے ظاہر تھا کہ رو رہا ہے۔

''ہمت کرو دوست ٹھیک ہو جاؤ گے۔'' محی الدین نے آواز میں خوشگواری لاتے ہوئے کہا۔ اس نوجوان نے اس کی طرف دیکھا۔

''کیا بات ہے' زیادہ تکلیف ہے؟'' محی الدین نے سوال کیا۔

''تکلیف تو اپنی جگہ ہے لیکن ڈاکٹر نے کہا ہے کہ تمہاری ٹانگ کاٹنا پڑے گی میں معذور ہو جاؤں گا۔'' اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''تمہارے گھر سے کوئی آیا؟'' محی الدین نے پوچھا۔

''میں اکیلا ہوں۔'' اس نے مایوس سے کہا۔

''میرے ماں باپ بچپن ہی میں مر گئے تھے مجھے میرے ماموں نے پالا ہے وہ ملک میں نہیں ممانی مجھے برداشت نہیں کرتی ہیں بھائی بھی کوئی نہیں ہے میں نوکری کے لیے یہاں آیا ہوں اب معذور ہو جاؤں گا تو کیا ہوگا؟'' وہ پھر رونے لگا۔

''اللہ کی ذات بہت بڑی ہے۔ دیکھو دوست اللہ سے دعا کرو وہ جو کرتا ہے اچھا کرتا ہے کوئی نہ کوئی بہتری کی صورت ضرور نکلے گی۔'' محی الدین نے پر یقین لہجے میں کہا۔

''میری تو دنیا اندھیر ہوگئی ہے۔'' اس نے سسکی لی۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' محی الدین نے پوچھا۔

''میرا نام شرافت علی ہے میری ماں پیار سے مجھے شفیع کہتی تھی۔'' اس نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

''تو بھائی میں بھی تمہیں شفیع کہوں گا۔'' محی الدین نے مسکراتے ہوئے کہا تو شرافت نے آہستہ سے اثبات میں گردن ہلا دی اس کا جسم آہستہ آہستہ کانپ رہا تھا شاید اس پر خوف سوار تھا اس کی وجہ سے ایسا تھا کچھ دیر محی الدین سے باتیں کرنے کے بعد شرافت سو گیا تھا اور محی الدین کو بھی اونگھ آ گئی تھی۔

''بچاؤ' بچاؤ'' کی زوردار آواز سے محی الدین کی آنکھ کھلی تھی سامنے لیٹا شرافت زور زور سے چیخ رہا تھا شاید اس نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔

''وہ...... وہ دیکھو'' وہ پھر چیخا۔ وہ آدمی تڑپ

رہا ہے۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا ہے۔" وہ بے ہنگم بولے جا رہا تھا۔ ایک وارڈ بوائے اس کو پکڑے ہوئے تھا اور سسٹر اسے لگانے کے لیے انجکشن تیار کر رہی تھی۔ شرافت بری طرح کانپ رہا تھا خوف سے اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا پھر سسٹر نے اسے انجکشن لگا دیا اور وہ آہستہ آہستہ بڑبڑاتے ہوئے پھر سے بے ہوش ہو گیا۔

محی الدین اپنی تکلیف بھول گیا تھا اس کے سر میں شدید تکلیف تھی شاید زخم سے خون بہہ رہا تھا پھر سسٹر اس کی طرف مڑی۔

"چلو تمہارے سر اور پیر کی بینڈیج کرنا ہے اس نے سامان اس کے بیڈ کے قریب رکھی ٹیبل پر رکھا اور محی الدین سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"تم نے احتیاط نہیں کی ہے دوہرا زخم ہے اسی کروٹ سے تم لیٹے رہو زخم سے خون رس رہا ہے۔" سسٹر نے زخم کی پٹی کھولتے ہوئے کہا۔ "تمہیں بخار بھی لگ رہا ہے۔ ابھی چیک کرتی ہوں۔" اس نے سر کے زخم کی پٹی بدلتے ہوئے کہا اور تھرمامیٹر اٹھا لیا۔

"اوہ تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔" سسٹر نے بخار چیک کرتے ہوئے کہا اور اسے دوا دی۔

"اب خیال رکھنا زخم کی طرف سے نہ لیٹنا تھوڑی دیر میں تمہاری ٹانگ کی پٹی بھی بدلواتی ہوں۔" اس نے کہا اور چلی گئی محی الدین خاموشی سے لیٹ گیا تھا اس کی نظر میں شرافت برنگی تھیں اور وہ اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

دوسرے دن محی الدین نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اور کچھ کرے نہ کرے لیکن شرافت کی تکلیف کم کرنے میں اس کی مدد ضرور کرے گا۔ وہ کم از کم اس کا دھیان حادثے سے ہٹا کر اس کے دل میں زندگی کی چمک پیدا کر سکتا تھا۔

"شفیع۔" اس نے شفیع کو ہوش میں آتے دیکھ کر اسے آواز دی اور شفیع اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"تمہیں پتا ہے دنیا میں ایسے بھی بہادر لوگ گزرے ہیں جو تمہاری طرح اکیلے تھے لیکن وہ بہت سے لوگوں کا سہارا بن گئے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا شفیع اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"دیکھو ہر انسان کے دنیا میں آنے کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہے اسے اللہ تعالیٰ کسی اہم کام کے لیے بھیجتا ہے۔"

"میں بھلا کیا اہم کام کر سکتا ہوں، بے سہارا اکیلا شخص۔" شفیع نے مایوسی سے کہا۔

"دیکھو ایک چیونٹی بھی اس دنیا میں بے مقصد نہیں آئی۔" محی الدین نے کہا اور پھر کچھ سوچ کر موضوع بدل دیا۔

"تمہیں پتا ہے آج موسم کتنا اچھا ہے دیکھو میری کھڑکی سے سب نظر آ رہا ہے۔" اس نے اپنے اندر خوشگواری پیدا کرتے ہوئے کہا شفیع خاموش لیٹا تھا۔

"آسمان پر بادل ہیں اور سامنے والے درخت پر چڑیا نے گھونسلہ بنایا ہوا ہے اس کے بچے گھونسلے سے جھانک رہے ہیں۔" محی الدین نے کہا۔ "شاید چڑیا کا انتظار کر رہے ہیں۔" محی الدین نے بات آگے بڑھائی اور شفیع اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"وہ یقیناً ان کے لیے دانہ لینے گئی ہوگی۔"

"اور اگر اسے کوئی کوا یا چیل پکڑ لے تو؟" شفیع

نے کہا۔
''زندگی میں خطرات تو آتے ہی ہیں۔ ان سے نمٹنا بھی آنا چاہیے چڑیا کو بھی مشکلات پیش آسکتی ہیں لیکن وہ اپنے چوزوں کے لیے آئے گی ضرور۔'' محی الدین نے یقین بھرے لہجے میں کہا۔
''اوہ...... وہ...... دیکھو آ گئی۔'' اس نے کچھ دیر بعد شفیع کو بتایا تو شفیع کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔
پھر یوں ہوا کہ شفیع اس سے خود پوچھنے لگا۔
''بھائی آج کیسا موسم ہے؟ آج چڑیا کے بچے کیا کر رہے ہیں باہر کیاری میں کس رنگ کے پھول کھلے ہیں؟'' اور محی الدین اس کے ان چھوٹے چھوٹے سوالوں کے دلچسپ جواب دیتا رہا لیکن اس کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی ٹانگ کا زخم خطرناک صورت اختیار کر گیا تھا پھر ایک رات اسے آپریشن تھیٹر لے جایا گیا وہاں اس کی ٹانگ کاٹی جانا تھی شفیع اس کا انتظار کرتے ہوتے سو گیا تھا۔
دوسرے روز جب اس کی آنکھ کھلی تو محی الدین اپنے بیڈ پر موجود تھا لیکن غنودگی میں تھا شاید ابھی تک آپریشن کے لیے دیے جانے والے انجکشن کا اثر باقی تھا پھر محی الدین سے اس کی بات شام کے وقت ہوئی جب سسٹر نے تھوڑا قہوہ دیا اور دوا پلائی۔
''تمہاری طبیعت کیسی ہے؟'' شفیع نے پوچھا تو محی الدین نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور اثبات سے سر ہلایا۔
''تم جلدی ٹھیک ہو جاؤ گے۔'' آج شفیع نے اس کی ہمت بندھائی جبکہ وہ زندگی سے مایوس تھا اور محی الدین اس کی ہمت بندھاتا تھا۔ وہ اس کی بات سن کر مسکرایا۔
''تمہیں پتا ہے آج چڑیا کے بچے گھونسلے سے باہر بھی آ رہے ہیں۔ وہ اس کے ساتھ شاخ پر بیٹھتے ہیں پھر گھونسلے میں چلے جاتے ہیں شاید وہ انہیں اڑنا سکھا رہی ہے۔'' محی الدین نے کہا۔
''اگر کوئی بچہ نیچے گر گیا تو؟'' شفیع نے فکر مندی سے کہا۔
''وہ اسے بچا لے گی یقیناً۔'' محی الدین نے جواب دیا۔
''تمہیں پتا ہے آج درخت کے نیچے والی کیاری میں سرخ گلاب کے پھول کھلے ہیں جن کا میں کئی دن سے انتظار کر رہا تھا۔'' محی الدین نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا اس کے چہرے پر کافی نقاہت تھی۔
''اوہ کاش میں بھی دیکھ سکتا کتنے اچھے لگ رہے ہوں گے۔'' شفیع نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔
''ہاں بہت خوب صورت لگ رہے ہیں۔'' محی الدین نے کہا اور آہستہ آہستہ پھر اس کی پلکیں بند ہو گئیں شاید نقاہت تھی شفیع اب اس کے بارے میں سوچ رہا تھا اسے اپنی تکلیف کی اتنی فکر نہیں تھی بلکہ محی الدین کی اور اس چڑیا کے بچوں کی فکر تھی جنہیں وہ اڑنا سکھا رہی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ وہ اپنے بچوں کو کیسے دوسرے شکاری پرندوں سے بچا کر اڑنا سکھائے گی۔
دوسری صبح شفیع پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا اس کی آنکھ کھلی تو محی الدین کو اسٹریچر پر ڈال کر لے جا رہے تھے تب اسے پتا چلا کہ محی الدین کا انتقال ہو گیا تھا اسے شدید بخار ہوا تھا اور اس کی حالت بگڑ

گئی تھی اور اسی کیفیت میں اس نے جان دے دی تھی۔ شفیع کو اس کی موت کا بے حد افسوس تھا۔ شاید پہلے زندگی میں کسی اور کی موت سے اسے اتنا صدمہ نہیں پہنچا تھا جتنا محی الدین کی موت سے پہنچا تھا وہ چند دن میں ہی اس کا دوست اس کا رفیق اور رشتہ دار بن گیا تھا اس نے اس کا غم ہلکا کیا تھا اس کے خوف پر اسے قابو پانا سکھایا تھا۔

''خدا تمہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔'' اس نے دل ہی دل میں اپنے دوست کو دعا دی۔

اگلے روز سسٹر محی الدین کا بیڈ جھاڑ کر نئی چادر بچھا رہی تھی تو اس نے اسے مخاطب کیا۔

''مجھے اس بیڈ پر لٹا دو۔'' اس نے فرمائش کی وہ اپنی آنکھوں سے اس درخت کو اور اس پر موجود چڑیا کے گھونسلے اور بچوں کو دیکھنا چاہتا تھا وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ اڑنا سیکھے یا نہیں۔

''ہاں' ہاں کیوں نہیں۔'' سسٹر نے خوشدلی سے کہا اور اسے محی الدین والے بیڈ پر منتقل کروا دیا۔ شفیع اطمینان سے لیٹ گیا تو اس نے بند کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

''اسے بھی کھول دو۔''

''ٹھیک ہے۔'' سسٹر نے کہا اور آگے بڑھ کر کھڑکی کھول دی لیکن شفیع حیران رہ گیا کہ کھڑکی کے پیچھے تو ایک سپاٹ دیوار تھی نہ درخت نہ گھونسلہ نہ چڑیا کے بچے نہ پھولوں سے سجی کیاری کچھ بھی نہیں تھا وہ حیرت سے باہر دیکھ رہا تھا۔

''کیا ہوا؟ کیا دیکھ رہے ہو؟'' سسٹر نے اس کے چہرے پر حیرت کے آثار دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ..... محی الدین تو مجھے بتاتا تھا کہ ادھر خوبصورت درخت ہے اس پر چڑیا کا گھونسلہ ہے اس میں چڑیا کے بچے ہیں..... اور نیچے کیاری..... جس میں خوب صورت گلاب کے پھول کھلے ہیں۔'' شفیع نے کچھ سوچتے ہوئے اداس لہجے میں کہا۔

''وہ تو اس نے تمہارا غم دور کرنے کے لیے ایک کہانی گڑھ لی تھی تمہیں یاد ہے اس سے پہلے تم کتنے خوفزدہ تھے۔ اس کی ان باتوں ہی سے تمہارا خوف کم ہوا تھا اور تمہاری حالت سدھر گئی تھی۔'' سسٹر نے کہا تو وہ اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

''واقعی محی الدین صحیح کہتا تھا اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں ہر شخص کو کوئی نہ کوئی اہم کام کو سر انجام دینے کے لیے بھیجا ہے محی الدین نے ایک کہانی بنا کر اسے سنائی اور اس کی زندگی میں موجود خوف سے اس کا دھیان ہٹا کر زندہ رہنے کی امید پیدا کی اور خود دنیا سے چلا گیا۔

وہ بیڈ پر لیٹا کھڑکی سے باہر دیوار کو گھور رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اگر دنیا میں دوسروں کی جان لینے والے دھماکے کرنے والے ظالم موجود ہیں تو محی الدین جیسے انسان بھی ہیں جو دوسروں میں زندہ رہنے کی امنگ پیدا کر سکتے ہیں اسے یقین ہو گیا کہ ایک دن چھوٹی چھوٹی نیکیاں بڑی برائی پر قابو پا لیں گی۔

ایمان کے کھلاڑی

محمد حنیف قادری

کسی شاعر نے کبھی کہا تھا کہ

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں بازی گر دھوکہ یہ کھلا

اگر آپ اپنے ارد گرد کا بغور جائزہ لیں اور حالات کا تجزیہ کریں تو آپ کو خطے کی پوری سیاست سمجھ میں آجائے گی کہ کس طرح ہمیں مذہب کے نام پر دین سے دور کیا جارہا ہے' کس طرح یہود اور ہنود اپنی عیارانہ چالوں سے جہاد کو بدنام کر رہے ہیں۔ زیر نظر ناول میں ایسے ہی نازک موضوع کو چھیڑا گیا ہے کہ کیسے ہمارے نوجوانوں کے اذہان کو مسموم پروپیگنڈے کا شکار بنا کر انہیں انسان سے درندہ بنایا جارہا ہے۔

ایک نوجوان کی روداد' اسے مذہب کے نام پر دین سے دور کر دیا گیا تھا۔

میرے والد نیاز علی علاقے کی مشہور سیاسی و سماجی شخصیت تھے۔ ہر الیکشن پر ہمارے حلقے میں مقابل کوئی بھی ہوتا، جیت ابو کی ہی ہوتی تھی۔ میرے والد انتہائی شریف، راست گو اور مہربان شخصیت تھے۔ وہ مثبت اور تعمیری سیاست کے قائل تھے گو کہ یہ اس دور میں ناممکن سی بات لگتی ہے مگر میرے والد نے کبھی اصولوں پر سمجھوتا نہیں کیا اور اس کے لیے انہوں نے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کیا۔

میری والدہ ایک مکمل گھریلو خاتون تھیں اور مجھ سے بہت زیادہ پیار کرتی تھیں۔ والدین کا اکلوتا ہونے کی وجہ سے میں ابو اور امی کا بہت زیادہ لاڈلا تھا اور اسی لاڈ پیار نے مجھ میں بے جا ضد کی نشوونما کی اور اسی ضد نے میری زندگی تباہ کر ڈالی۔ میٹرک تک تو اس ضد کی وجہ سے مجھ میں کوئی بڑی خرابی پیدا نہ ہو سکی مگر کالج میں داخل ہوتے ہی میری دوستی کچھ غلط قسم کے لڑکوں سے ہو گئی اور یہیں سے میری بربادی کا آغاز ہوا۔ ان دوستوں کی صحبت نے مجھ میں کچھ ایسا بگاڑ پیدا کر دیا کہ جس نے میرے ابو کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔

دراصل یہ سب میرے ابو کے سیاسی مخالفین کی چال تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے سامنے کوئی گردن اٹھا کر چل سکے۔ میرے ابو نے مجھے سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر میری بے جا ضد اور ہٹ دھرمی نے ان کی سبھی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ میرے ابو نے مجبوراً سیاست کو خیر باد کہا اور ملک میں پھیلے ہوئے اپنے کاروبار کی طرف توجہ دینی شروع کی مگر ابو ایک دفعہ سیاست سے پیچھے ہٹے تو ان کے سیاسی مخالفین کے حوصلے بڑھ گئے اور وہ ابو کو بلاوجہ تنگ کرنے لگے۔

میرے دوست نما دشمنوں نے مجھ میں دنیا کا ہر عیب کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا۔ میں شراب اور شباب کا عادی ہو چکا تھا۔ ان کاموں کے لیے میں نے علیحدہ سے جگہ بنا رکھی تھی۔ یہ ابو کا فارم ہاؤس تھا۔ اس فارم ہاؤس میں روز ہی ڈانس پارٹیز کا بندوبست ہونے لگا۔ یہاں تک کہ دور دراز سے اوباش قسم کے لوگ یہاں ڈانس دیکھنے اور جوا کھیلنے کے لیے آنے لگے۔ ابو کو جب ان باتوں کا علم ہوا تو انہوں نے مجھے عاق کرنے کی دھمکی دی۔

نشے کے عالم میں میں جانے ابو کے سامنے کیا

کیا بکتا رہا۔ مجھے کچھ علم نہ تھا۔ دوسرے دن ابو کی لاش کار سمیت ایک گہری کھائی سے ملی۔ مجھ پر شک کیا گیا۔ مگر اب ابو کی تمام جائداد میری ہو چکی تھی۔ میں نے پیسہ پانی کی طرح بہایا اور تمام الزامات سے بری ہو گیا۔ ویسے بھی ابو سے اختلافات اپنی جگہ پر، مگر میں نے ان کو قتل کرنے کا تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ کون شخص تھا جس نے ابو کو گاڑی سمیت گہری کھائی میں پھینک دیا تھا؟

کچھ دن میرے معمولات میں فرق آیا مگر جلد ہی میں اپنی پرانی روش پر لوٹ گیا۔ اب میری ماں گھر میں چپ چپ رہنے لگی تھی۔ مگر میں ایسا بدنصیب تھا کہ ان کے جیتے جی انہیں کوئی سکھ نہ دے سکا۔ میری عیاشیاں عروج پر تھیں۔ تمام انڈسٹری بک چکی تھی۔ اب زمین بھی آہستہ آہستہ بک رہی تھی۔ میرے ابو کے نام باون مربع اراضی تھی جو کہ اب صرف سات مربع رہ گئی تھی اور یہ جو سات مربع زمین بچ گئی تھی۔ وہ میری والدہ کے نام تھی اور میری والدہ نے مجھے سختی سے کہہ دیا تھا کہ وہ کسی بھی حال میں مجھے وہ زمین نہیں بیچنے دیں گی۔

میرے دوست نما دشمن اب مجھ سے کھچے کھچے سے رہنے لگے تھے۔ کیونکہ اب میں قلاش ہو چکا تھا۔ میں حیران تھا کہ میرے دوستوں کو دن بدن کیا ہوتا جا رہا ہے؟

اور پھر کچھ دنوں کے بعد میری والدہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ وہ اس دنیا میں واحد ہستی تھیں جو مجھ سے مخلص تھیں۔ والدہ کے چہلم کے بعد میرے ابو کا خاندانی وکیل مجھ سے ملا اور اس نے مجھ سے کہا۔

"صاحبزادے! اب یقیناً تم اپنی ماں والے سات مربعے بیچنا چاہو گے۔ مگر میں تمہیں بتانے آیا ہوں کہ تمہاری والدہ کی وصیت کے مطابق تم یہ زمین بیچنے کے مجاز نہیں ہو۔ اس وصیت نامے کی رو سے تم اس زمین کو ٹھیکے پر بھی نہیں دے سکتے۔ ہاں اگر تم چاہو تو اسے خود کاشت کر سکتے ہو۔ لہٰذا کوئی بھی ڈیل کرنے سے پہلے سوچ لینا...... ویسے تم کتے کی دم کی طرح کبھی سیدھے ہو ہی نہیں سکتے اسی لیے میں نے کل کے اخبار میں اشتہار بھی دے دیا ہے۔"

میں پاگلوں کی طرح اس پر چیخا اور اسے سخت برا بھلا کہا مگر وکیل میری بات سننے کے لیے رکا ہی کہاں تھا۔ وہ تو کب کا جا چکا تھا۔ میرے پاس پیسے ختم ہو چکے تھے۔ شراب نہ ملنے کی وجہ سے میری حالت غیر ہو رہی تھی۔ میرے دوست مجھے کب کے چھوڑ چکے تھے۔ کہیں سے کوئی وسیلہ نہیں بن رہا تھا۔ ایسے حالات میں میرے پاس ایک ہی آپشن باقی بچا تھا۔ وہ تھا میرے ابو کی چھوڑی ہوئی کوٹھی، جس کی قیمت لاکھوں میں نہیں کروڑوں میں تھی۔ جو اب تک ہماری رہائش گاہ تھی۔ میں نے اس کوٹھی کا سودا کرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ یہ بھی امی کے نام پر تھی اور وصیت کی رو سے میں امی کی جائداد استعمال تو کر سکتا تھا مگر اسے بیچ نہ سکتا تھا۔

میری عادتیں بگڑ چکی تھیں۔ مجھے ہر حال میں نشہ درکار تھا۔ میرا سارا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ میں نے دوستوں کو فون کرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ موبائل میں بیلنس ہی نہیں ہے۔ میں نے موبائل اٹھایا اور گاڑی لے کر بازار کی طرف چل دیا۔ یہ موبائل میں نے اچھے وقتوں میں باون ہزار کا خریدا تھا مگر جب میں اسے دکان پر بیچنے کے لیے گیا تو انہوں نے پچیس ہزار روپے قیمت لگائی۔ میں نے خاموشی سے پچیس ہزار لیے اور شراب لے کر فارم ہاؤس کی طرف روانہ ہو گیا۔

یہ فارم ہاؤس اور اس سے متعلقہ سات مربع اراضی امی کے نام پر تھی۔ میں نے فارم ہاؤس پہنچتے

ہی وہاں موجود چوکیدار کو چھٹی دے دی۔ میں سیدھا اپنے کمرے میں پہنچا اور پھر جب تک مجھے ہوش رہا میں پیتا رہا۔ دوسرے دن ایک بجے کے قریب مجھے ہوش آیا۔ میرا سر، درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے بار بار اندھیرا چھانے لگتا تھا۔ یہ نیم بے ہوشی کی کیفیت تھی۔ میری زبان پیاس سے خشک اور سینے میں شدید قسم کی جلن ہو رہی تھی۔ میں نے اٹھنا چاہا تو مجھے زبردست چکر آیا اور اس سے پہلے کہ میں دھڑام سے نیچے جا گرتا، کوئی تیزی سے کمرے میں داخل ہو اور میں اس کے بازوؤں میں جھول کر رہ گیا۔ جانے کون تھا؟ اور اندر کیسے آ گیا تھا؟ شاید رات میں کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرنا بھول گیا تھا۔ اس شخص نے مجھے دوبارہ بیڈ پر لٹا دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پانی لے کر آیا۔ میں نے پانی پیا تو مجھے کچھ ہوش آیا۔ میں نے پانی پلانے والے شخص کی طرف غور سے دیکھا تو میں اسے پہچان گیا وہ اس فارم ہاؤس کا چوکیدار تھا مگر اسے تو میں نے کل آتے ہی چھٹی دے دی تھی تو وہ اب تک یہاں کیا کر رہا تھا۔ اتنے میں چوکیدار نے ملتجی نظروں سے میری طرف دیکھا اور کہا۔

"صاب جی! میں آپ کا چوکیدار ہوں۔ ساری عمر آپ کا نمک کھایا ہے۔ کل آپ نے جب آتے ہی مجھے چھٹی دی تو میں نے آپ کی حالت کے پیش نظر چھٹی نہیں کی۔ اللہ بخشے آپ کے والد صاحب مجھے چوکیدار نہیں بڑا بھائی سمجھا کرتے تھے۔ ان کے لاتعداد احسان ہیں مجھ پر اور میرے خاندان پر۔ میں آپ کو اس حالت میں نہیں دیکھ سکتا۔ خدا کے لیے آپ یہ سب چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟" یہ کہہ کر چوکیدار رونے لگا اور یہ پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ اکثر ابو کے جاننے والے لوگ مجھے سمجھاتے سمجھاتے رو پڑتے تھے۔ یہ شاید ان کی ابو سے بے انتہا محبت تھی۔

میں اپنے حالات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں جو ایک دن میں لاکھوں روپیا بے دریغ لٹا دیا کرتا تھا۔ اب کوڑی کوڑی کا محتاج ہو گیا تھا۔ میں نے کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا تھا۔ والد صاحب کی بے انتہا دولت نے مجھے کبھی یہ سوچنے ہی نہیں دیا تھا گو کہ اب بھی میرے پاس سات مربع اراضی اور کوٹھی تھی جس کی مالیت لاکھوں میں نہیں کروڑوں میں تھی۔ مگر میں انہیں بیچ نہیں سکتا تھا۔ جن خراجات کا میں عادی ہو چکا تھا۔ وہ ان سے پورے ہو نہیں سکتے تھے۔ اگر میں اب بھی صبر اور کفایت شعاری سے کام لیتا تو میرے پاس بہت کچھ تھا۔ بلکہ آج کل کے دور کے لحاظ سے تو میں اب بھی امیر آدمی تھا۔ مگر جو بگاڑ مجھ میں پیدا ہو چکا تھا وہ اب مجھے کسی اور ہی سمت بہائے لے جا رہا تھا۔ میں نے انتہائی مایوسی کی کیفیت میں چوکیدار سے کہا۔

"اب کیا ہو سکتا ہے بابا؟ مجھے پچھلے کچھ دنوں سے اس بات کا شدت سے احساس ہو رہا ہے کہ میں نے والدین کے ساتھ بہت زیادتی کی۔ میرے دوست جنہیں میں سب کچھ سمجھتا تھا جن پر میں نے کروڑوں روپیہ خرچ کیا تھا۔ جو ہر وقت میرے آگے پیچھے کتے کی طرح دم ہلایا کرتے تھے۔ ان لوگوں نے مجھ سے پیسے لے کر کاروبار شروع کیے۔ میں نے ان لوگوں کا ہر برے وقت میں ساتھ دیا۔ اب مجھ پر وقت آیا ہے تو گرگٹ کی طرح رنگ بدل گئے ہیں سارے۔ آج میری آنکھیں کھلی بھی ہیں تو کس موڑ پہ آ کر۔ میں نے اپنی زندگی کا سب سے قیمتی اثاثہ اپنے والدین کو کھو دیا۔ کاش وہ زندہ ہوتے 'میں انہیں منا لیتا' ان کے قدموں میں گر کے رو رو کے معافی مانگتا ان سے۔ اے کاش۔"

"بیٹا! اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ ویسے بھی بیٹا! اس میں تمہارا اتنا قصور

نہیں تھا۔ یہ سب تمہارے والد کے سیاسی مخالفین کی چال تھی۔ تمہاری جگہ کوئی بھی ہوتا تو شاید ان کا مقابلہ نہ کر پاتا۔"

"نہیں بابا! یہ سب کیا دھرا میرا اپنا ہے۔ کسی کا کوئی قصور نہیں۔ میں ہی بے وقوف تھا۔ مجھے سوچنا چاہیے تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں؟ مجھے سزا ملنی چاہیے اور میں خود دوں گا اپنے آپ کو سزا اور اسی طرح سے شاید مجھے چین آئے گا۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆

اس فارم ہاؤس میں رہتے ہوئے آج مجھے ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ چوکیدار بابا علی نواز میری ہر طرح سے خدمت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرا دنیا سے دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ مجھے رات کو نیند نہیں آتی تھی۔ سبھی دوستوں سے میرا رابطہ ختم ہو چکا تھا۔ میں نے اپنا ایک موبائل تو پہلے ہی بیچ دیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی میرے پاس تین چار موبائل تھے۔ وہ میں نے بند کر دیے تھے۔ دنیا سے میرا رابطہ کٹ چکا تھا۔ شراب میں نے مکمل طور پر تو نہیں چھوڑی مگر میں اسے بتدریج کم کرتا جا رہا تھا۔ شراب کے علاوہ میں افیون اور چرس وغیرہ کا نشہ بھی کر لیتا تھا۔ مگر اب یہ میں نے مکمل طور پر چھوڑ رکھا تھا۔ اس کے علاوہ اب میں صبح کی نماز بھی پڑھنے لگا تھا اور رات کو سوتے وقت بھی میں وضو کر کے کچھ نہ کچھ پڑھ کے سوتا تھا۔ الغرض میں آہستہ آہستہ زندگی کی طرف لوٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر شاید خدا کو ابھی یہ منظور نہ تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

میڈم شیلا رائے اسٹیج کی دنیا میں انتہائی کامیابیوں کے بعد فلمی دنیا میں بھی اپنے فن کا لوہا منوا چکی تھی۔ مگر بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ اس کی ان کامیابیوں کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا۔ وہ واحد شخصیت تھی جس پر میں اندھا اعتماد کرتا تھا۔ ایک وقت تھا کہ وہ اس فارم ہاؤس میں ہونے والے مجروں کی جان ہوا کرتی تھی۔ میں نے اس کی کامیابیوں کے لیے اپنی دولت پانی کی طرح بہائی تھی اور اسے اس مقام تک پہنچانے کے لیے ہر ممکن ذرائع استعمال کیے تھے۔ وہ بھی مجھ سے محبت کی دعوے دار تھی۔ اس کا تو مجھے علم نہیں کہ وہ اس دعوے میں کہاں تک سچی تھی البتہ مجھے اپنا پتہ تھا کہ میرا اس کے بن دل نہیں لگتا تھا اور اگر یہی پیار تھا تو پھر مجھے انتہائی شدت سے اس سے پیار ہو چکا تھا۔

وہ انتہائی مصروف ہونے کے باوجود میرے لیے وقت نکال لیا کرتی تھی۔ ہم ہفتے میں ایک دفعہ ضرور ملا کرتے تھے اور فون پر تو روز ہی بات ہوتی رہتی تھی۔ فارم ہاؤس میں رہتے ہوئے مجھے دو ہفتے ہو چکے تھے۔ میرے فون بند تھے۔ مجھے اسے رابطہ کیے ہوئے پورے پندرہ دن ہو چکے تھے۔ مجھے شدت سے اس کی یاد تڑپا رہی تھی۔ میں اس سے رابطہ کرنا چاہتا تھا مگر آجکل جانے کیوں مجھ پر قنوطیت سی چھائی ہوئی تھی۔ میں اپنے آپ میں گم جانے کن سوچوں میں پڑا رہتا تھا۔

سردیوں کا موسم تھا۔ شام کا دھندلکا پھیل رہا تھا۔ صبح سے رزق کی تلاش میں نکلے پرندے اپنے گھونسلوں کی طرف لوٹ رہے تھے۔ فارم ہاؤس سے متصل باغیچے میں مختلف پرندوں کی آوازوں نے عجب سا سماں باندھ دیا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ مغرب کی سمت سے سرد ہوا چل رہی تھی۔ لگتا تھا کہ آج بارش ضرور برسے گی۔ میں نے گرم کپڑے پہن رکھے تھے اور باغیچے کے وسط میں بنی سیمنٹ کی بینچ پر بیٹھا ہوا موسم کی ستم ظریفی سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ سردی اور موسم کی خرابی کی وجہ سے چوکیدار دو دفعہ مجھے بلانے آ چکا تھا مگر میں نے اسے منع کر دیا تھا۔ اچانک سرد

ہواؤں نے زور پکڑا اور تیز بارش شروع ہوگئی۔
میں جس سیمنٹ کی بینچ پر بیٹھا ہوا تھا اس کے اوپر ایک گول چھتری دار شیڈ بنا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے بارش کا پانی مجھے بھگو نہیں رہا تھا۔ میں وہیں پر بیٹھا رہا۔ بجلی کی گرج چمک اور بادلوں کی گھن گرج جاری تھی۔ اچانک بجلی چمکی تو میں نے فارم ہاؤس کی طرف سے آنے والی پگڈنڈی پر بارش کے پانی میں شرابور شیلا رائے کو آتے دیکھا۔ میں تیزی سے اٹھا اور شیلا کی طرف بھاگا۔ شیلا مجھ سے کافی دور تھی۔ میں تیزی سے اس کی سمت بھاگ رہا تھا۔ مگر اچانک جب میں اس سے تھوڑا ہی دور رہ گیا تھا کہ مجھے زبردست ٹھوکر لگی اور میں منہ کے بل گرا اور میرا سر پگڈنڈی کے ساتھ سیمنٹ اور اینٹوں سے بنی روش سے ٹکرایا اور پھر مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔

☆☆☆☆☆☆☆

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو اپنے بیڈروم میں لیٹا ہوا پایا۔ میرے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ میں نے آہستگی سے سر پر لگی چوٹ کے مقام پر ہاتھ لگا کر دیکھا تو وہاں مجھے بڑا سا گومڑ محسوس ہوا۔ باہر سے بارش اور بادلوں کی گھن گرج کی آواز ابھی تک آ رہی تھی۔ اس کا مطلب ہے بارش ابھی تک جاری تھی۔ کمرے میں کسی کے مدھم لہجے میں بات کرنے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ لازمی بات ہے یہ شیلا تھی کیونکہ اس کے علاوہ میرے کمرے میں یوں کون آسکتا تھا۔ وہ شاید کسی سے فون پر محو گفتگو تھی۔ میں نے اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا مگر میں اس کی بات سن کر چونک گیا۔ وہ مترنم ہنسی کے ساتھ کسی سے کہہ رہی تھی۔
”ندیم میری جان! تم کیا مجھے پاگل سمجھتے ہو؟ شادی تو میں تمہی سے کروں گی...... جی جی...... دل لگی مائی فٹ۔ اس عقل کے اندھے سے دل لگی۔ جو شخص اپنے ماں باپ کا نہ ہوا کسی اور کا کیا ہو گا؟ ہاں ہاں کل صبح...... نہیں نہیں...... بے وقوف! سات مربع اراضی اور کروڑوں کی مالیت کی کوٹھی، میری تھوڑی سی محنت سے اگر حاصل ہو جائے تو تمہیں کیا اعتراض ہے ہاں ہاں صرف دو مہینوں کی بات ہے۔ ہر چیز اپنی ہو گی...... کیا کہا سوئٹزرلینڈ۔ ارے دولت ہو تو ہر جگہ سوئٹزرلینڈ ہے۔“
اس کے بعد بھی وہ دیر تک آہستہ آواز میں باتیں کرتی رہی مگر مجھے کچھ سنائی نہ دیا۔ میرے اندر کوئی چیز چھناکے سے ٹوٹی اور میرا وجود کرچی کرچی ہو گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

میرا دنیا سے دل اچاٹ ہو چکا تھا۔ مگر میں ان لوگوں کو سبق ضرور دینا چاہتا تھا جن لوگوں نے میرے ہنستے بستے گھر کو تباہ و برباد کیا تھا۔ اس رات میں نے شیلا کو زمین اور کوٹھی کی حقیقت بتادی تھی اور اس کے بعد اس نے پروڈیوسر کے فون کا بہانہ کر کے ایک منٹ بھی رکنا گوارا نہ کیا۔ کسی کنگال شخص سے محبت کا تصور ہی گناہ ہوتا جا رہا ہے ہمارے معاشرے میں۔ اس رات شیلا کے جانے کے بعد میں خوب رویا۔ اتنا رویا کہ اتنا زندگی بھر نہیں رویا۔
صبح نماز سے فارغ ہو کر میں نے گاڑی نکالی اور اپنے والدین کی قبروں پر حاضری دی۔ کافی دیر تک میں ان کے قدموں کی طرف بیٹھا روتا رہا۔ اور اپنے گناہوں کی تہہ دل سے معافی مانگتا رہا۔ جب میں وہاں سے اٹھا تو میرا من ہلکا ہو چکا تھا۔ اور میں اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں ایک لائحہ عمل طے کر چکا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆

اس سے اگلے دو سالوں کے دوران میں نہ صرف شیر کے منہ سے نوالہ چھیننے کے قابل ہو چکا تھا بلکہ چھین چکا تھا۔ جی ہاں وہ سبھی لوگ جنہوں نے مجھے

بے دریغ دونوں ہاتھوں سے لوٹا تھا۔ وہ مجھ سے چھینی ہوئی تمام دولت بمعہ سود مجھے واپس کر چکے تھے اور خوش تھے کہ میں نے ان کی جان بخشی کر دی تھی۔ کیونکہ میں اب اس مقام پر تھا کہ لوگ مجھ سے پنگا لیتے ہوئے ہزار بار سوچتے تھے۔ اس کے لیے مجھے بے انتہا محنت کرنا پڑی تھی اور یہ سب ابو کے مخلص دوست چوکیدار ندیم خان کی وجہ سے ممکن ہو سکا تھا۔

ندیم خان کی فیملی دو بیٹوں اور بیوی پر مشتمل تھی۔ بڑا بیٹا جہانگیر فوج میں تھا۔ وہ شادی شدہ تھا اور اپنی فیملی کے ساتھ اسلام آباد میں ہی رہتا تھا۔ وہ کبھی کبھار ملنے کے لیے آتا رہتا تھا۔ چھوٹا بیٹا ممتاز ہرفن مولا شخص، میرا بہترین اور مخلص دوست تھا۔ مجھے صحیح معنوں میں اللہ کے کرم کے بعد اسی نے اس قابل بنایا تھا کہ آج میں پہاڑوں سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ رہی شراب اور دوسرے نشوں کی بات تو وہ میں کب کا چھوڑ چکا تھا۔ اب مجھے اس نام سے بھی نفرت تھی۔

میرا اکثر وقت فارم ہاؤس پر ہی گزرتا تھا۔ فارم ہاؤس سے متعلقہ تمام زمینیں آباد ہو چکی تھیں اور بہترین آمدنی دے رہی تھیں۔ قریبی گاؤں فقیر نگر سے کچھ لوگ دن کے وقت یہاں کام کاج کے لیے آتے تھے جو کہ شام ہوتے ہی واپس اپنے گھروں کو چلے جاتے تھے۔ بجلی کے بحران کی وجہ سے میں نے ایک بڑا جنریٹر خرید لیا تھا جو کہ تمام زمینوں کی ضروریات کے لیے کافی تھا۔

آج میں فارم ہاؤس پر اکیلا تھا۔ ندیم خان کی فیملی میں کوئی شادی تھی اور وہ بھی لوگ فیصل آباد گئے ہوئے تھے۔ سردیوں کا موسم تھا۔ میں ضروری کاموں سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آ کر سو گیا۔ رات کا جانے کون سا پہر تھا کہ فارم ہاؤس کے احاطے سے کسی لڑکی کے زور زور سے چیخنے کی آواز نے مجھے بیدار کر دیا۔ آواز سے یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کچھ لوگ اس سے مار پیٹ کر رہے تھے۔ پتہ نہیں کیا چکر تھا؟ رات کے اس پہر یہ کون لوگ ہو سکتے تھے؟ اور پھر میرے فارم ہاؤس کے احاطے میں؟

یہی سب سوچتے ہوئے میں نے سرہانے رکھی رائفل اٹھائی، جلدی سے بوٹ پہنے اور تیزی سے کمرے سے نکل کر باہر احاطے کی طرف بھاگا۔ احاطے سے چیخ و پکار کی آواز ہنوز جاری تھی بلکہ اس میں شدت آ چکی تھی۔ میں بھاگتے ہوئے احاطے کی طرف نکلنے ہی والا تھا کہ میرا پاؤں کسی رسی میں الجھا اور میں دھڑام سے نیچے زمین پر آن گرا۔ جانے کہاں سے چھ سات بندے نکلے اور مجھ سے چمٹ گئے۔ میں نے بھرپور مزاحمت کی مگر سب بیکار رہا۔ لگتا تھا کہ یہ پروفیشنل لوگ تھے۔ انہوں نے مجھ سے رائفل چھین کر بے دست و پا کر کے رکھ دیا۔ اس کے ساتھ ہی لڑکی کی چیخ و پکار بھی تھم گئی۔ ان لوگوں نے نائیلون کی مضبوط ڈوری سے میرے ہاتھ پاؤں باندھے اور پھر کلوروفارم کی تیز بو میرے نتھنوں سے ٹکرائی اور میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

امونیا سنگھا کر مجھے ہوش میں لایا گیا۔ جونہی مجھے ہوش آیا ان لوگوں نے مجھ پر لاتوں اور گھونسوں کی برسات کر دی۔ میری ٹھیک ٹھاک پھینٹی لگانے کے بعد ان لوگوں نے بے دردی سے مجھے گھسیٹنا شروع کر دیا۔ سرد ریت پر ان لوگوں نے کیکر اور بیری کے کانٹے بچھائے ہوئے تھے جو کہ میری کمر میں چھریوں کی طرح پیوست ہو رہے تھے۔ میرے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا جس کی وجہ سے میرا سانس لینا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ درد کی لہریں میرے وجود میں سرایت کرتی جا رہی تھیں۔ الغرض ان لوگوں نے اپنی

تسلی کر کے میرے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکالا اور میری آنکھوں پر بندھی پٹی بھی کھول دی۔ میرے جسم کی انتہائی بری حالت تھی۔ اگر میں پچھلے دو سالوں سے سختیوں کو سہنے کا عادی نہ ہوا ہوتا تو میں کب کا دوبارہ بے ہوش ہو چکا ہوتا۔

میں ٹھنڈی ریت پر پڑا ہوا تھا۔ میرے جسم کے کئی حصوں سے خون رس رہا تھا۔ گھسیٹنے کی وجہ سے میری قمیص پشت کی طرف سے پھٹ چکی تھی۔ میرے ہاتھ اور پاؤں ہنوز بندھے ہوئے تھے۔ اچانک مجھے اپنے پرانے دوست سلیم اور شیلا رائے کے خاوند کی آواز سنائی دی۔ وہ مجھ سے مخاطب تھا۔

''تم کیا سمجھتے تھے کہ ہم تمہیں یوں ہی چھوڑ دیں گے؟''

میں نے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے سلیم، مجھے تمہیں اسی دن مار دینا چاہیے تھا جس دن تم کتے کی طرح میرے قدموں میں گر کر مجھ سے زندگی کی بھیک مانگ رہے تھے۔''

''میں یہ غلطی نہیں کروں گا میری جان! تمہارا آخری وقت قریب ہے کوئی دعائیں شعائیں مانگنی ہیں تو مانگ لو۔'' سلیم نے خباثت سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''سلیم! تم نے یہ سب کر کے اچھا نہیں کیا۔ اس کا خمیازہ تمہیں ضرور بھگتنا پڑے گا۔ اب کے میں تمہیں قطعاً معاف نہیں کروں گا۔''

''حرامزادے! تم زندہ رہو گے تب ناں۔ آج میں تمہاری زندگی کا چراغ گل کر کے یہاں سے جاؤں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے پاس کھڑے اپنے حواریوں سے کہا۔

''لے چلو اسے دریا کنارے......''

اس نے ابھی یہ کہا ہی تھا کہ ان لوگوں نے میری ٹانگوں میں ڈالے ہوئے مضبوط نائلون کے رسے کو پکڑا اور مجھے دریا کی طرف گھسیٹنا شروع کر دیا۔ میں بالکل بے دست و پا ہو چکا تھا۔ جانے یہ کون سا دریا تھا جس میں یہ لوگ مجھے پھینکنے کے لیے لائے تھے۔ میرے ہاتھ اور پاؤں نائلون کی مضبوط ڈور سے بندھے ہوئے تھے۔ میں انہیں جتنا بھی کھولنے کی کوشش کرتا تھا یہ اور مضبوطی سے میرے گوشت میں داخل ہو جاتی تھی۔ لگتا کہ واقعی میرا آخری وقت قریب تھا۔ اب کوئی معجزہ ہی مجھے بچا سکتا تھا۔ یہ لوگ مجھے چھوڑنے والے نہیں تھے۔ انہی سوچوں کے دوران دریا کا کنارہ آ گیا اور ان لوگوں نے مجھے بڑی بے دردی سے دریا کے سپرد کر دیا۔

☆☆☆

یہ دسمبر کا مہینہ تھا۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ دریا میں جس جگہ مجھے پھینکا گیا تھا اس جگہ پانی کا بہاؤ کافی تیز تھا۔ ہاتھ پاؤں بندھے ہونے کی وجہ سے میں تیرنے کی کوشش بھی نہ کر سکتا تھا۔ اوپر سے ان لوگوں کے بے انتہا تشدد کی وجہ سے میرے جسم کے کئی حصوں سے درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ جب وہ لوگ مجھے دریا میں پھینکنے لگے تھے تو میں نے ایک لمبا سانس کھینچ کر اپنے پھیپھڑوں میں حتی المقدور ہوا بھر لی تھی۔ میں پانی کے تیز بہاؤ کے ساتھ بہا جا رہا تھا۔ میرے پھیپھڑوں میں سانس کے بھرنے کی وجہ دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ میں آہستہ آہستہ سانس خارج کرنے لگا۔ یوگا کی مشقوں کی وجہ سے مجھے اس کی تھوڑی بہت پریکٹس تھی۔ مگر میں کب تک سانس روک سکتا تھا۔

میرے پھیپھڑوں میں ہوا کی مقدار قطرہ قطرہ کم ہوتی جا رہی تھی۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ میرے پھیپھڑوں میں ہوا مکمل طور پر ختم ہو جاتی اور

زنجیروں کی وجہ سے میں خاطر خواہ دوڑ بھی نہ سکتا تھا۔ میری دونوں ٹانگیں آپس میں ٹکرائیں اور میں دھڑام سے نیچے گرا۔ خیریت گزری کہ آگ اور دھوئیں کا مرغولہ میرے اوپر سے گزر گیا۔ عجیب خوف ناک صورت حال تھی۔ اچانک میرے آگے اور پیچھے آگ اور دھوئیں کا رقص جاری ہو گیا۔

گرمی کی حدت سے میرا جسم جھلس رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میرا وجود کسی تپتی ہوئی بھٹی میں ڈال دیا گیا ہو۔ میرے اوپر اور ارد گرد آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ کہیں جائے پناہ نہ تھی۔ آگ اور دھوئیں کی وجہ سے مجھے سانس لینا مشکل ہو رہا تھا اور پھر کھانسی نے میرا برا حال کر دیا۔ میں نے اپنا پورا جسم نیچے فرش سے لگا رکھا تھا۔ فرش بھی آہستہ آہستہ گرم ہو رہا تھا۔ میرے جسم کے ارد گرد موٹی زنجیروں کی وجہ سے فی الحال میرا پورا جسم فرش سے تھوڑا سا اوپر تھا اور کچھ بچت تھی۔ تھوڑی دیر گزری کہ فرش بھی بھٹی کی مانند تپنے لگا۔ اب فرش پہ پڑے رہنا بھی ناممکن تھا اور اگر میں کھڑا ہوتا تو فوراً سے پہلے آگ کی لپیٹ میں آجاتا۔ اسی دوران مجھے لگا کہ بے انتہا کھانسی کی وجہ سے میرا سینہ پھٹ جائے گا۔

جانے کب تک میرے ساتھ ایسا ہوتا رہا۔ وقت کا پیمانہ میرے لیے ختم ہو چکا تھا۔ آگ اور دھوئیں کی وجہ سے میرا رنگ کالا سیاہ ہوتا جا رہا تھا۔ اک عجب سی بے حسی اور بے چینی مجھ پر طاری رہنے لگی تھی۔ میرا وجود ہوش اور بے ہوشی کے درمیان لٹکا رہنے لگا تھا۔ آج بھی میرا وجود آگ اور دھوئیں کے سیلاب میں بہا جا رہا تھا۔ میرے دل کی حالت عجیب سی ہوتی جا رہی تھی۔ پچھلے کچھ عرصے سے میرا دل میری سمجھ سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ میرے اندر مسکینی بڑھتی جا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے میرے دل کے تار اس ذات اقدس سے جڑتے جا رہے ہوں۔ اتنی تکلیفوں اور دکھوں کے باوجود میرے اندر کبھی کبھی سکون کی دولت حدوں سے کراس کر جاتی تھی۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ اب میں جو بھی مانگوں گا وہ ذات لازمی عطا کر دے گی۔

میں نے سچے دل سے خدا سے اپنے کردہ اور ناکردہ گناہوں کی معافی مانگی اور شاید اس انتہائی مہربان ذات کو مجھ پر ترس آ گیا۔ آگ ایسے بجھ گئی جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ یوں کہ جیسے آپ روٹی پکانے کے بعد چولہے کی گیس کا بٹن آف کر دیں۔ میں نے کھانستے کھانستے کھڑے ہونے کی کوشش کی مگر یہ ممکن نہ ہو سکا اور میں ایک دفعہ پھر نیچے زمین پر آ رہا۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور میرا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ میرے سانس لینے کی آواز سیٹی کی آواز سے مشابہ تھی۔ مجھے ارد گرد کا کوئی ہوش نہ تھا۔ کھانسی نے مجھے بے حال کر دیا تھا۔ فضا آہستہ آہستہ صاف ہو رہی تھی اور میرا جسم بھی آہستہ آہستہ اعتدال پر آ رہا تھا۔ مگر یہ میری بھول تھی۔ جونہی میری کھانسی کچھ تھمی اور میرے سینے میں ہوا کی آمد و رفت کچھ بہتر ہوئی۔ ایک نیا امتحان میرے سامنے تھا۔ میرے پورے جسم پر جو چھالے بنے ہوئے تھے، ان چھالوں سے درد کی ہلکی ہلکی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ جانے میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا؟ ایک انجانے خوف سے میرا دل کانپ اٹھا۔

☆☆☆☆☆☆☆

میری طبیعت کچھ بحال ہوئی تو میں اپنی جگہ سے آہستگی سے اٹھا اور آنکھیں ملتے ہوئے ارد گرد نظر دوڑائی۔ کچھ دوری پر مجھے کالے رنگ کی ایک گٹھڑی سی نظر آئی۔ میں اس کی طرف چلا مگر جوں جوں میں اس کے قریب جا رہا تھا ایک انتہائی ناگوار قسم کی بدبو میرے ہوش و حواس کو ختم کرتی جا رہی تھی۔ میں نے قریب جا کر دیکھا تو میرا دماغ جھٹکے سے اڑ گیا اور

میں نے دیکھا کہ میرے پیچھے سبز رنگ کا چولا پہنے ایک شخص کھڑا تھا۔ اس کے سر پر سفید عمامہ تھا اور اس نے ہاتھ میں ایک ڈنڈا پکڑ رکھا تھا۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ میں واقعی مر چکا ہوں اور یہ شخص کوئی فرشتہ ہے۔ شاید یہ لوگ اب مجھے جزا و سزا کا فیصلہ سنانے والے ہیں۔

فیصلے کے خوف سے میری جان نکلی جا رہی تھی۔ میں نے دنیا میں کوئی نیک عمل نہیں کیا تھا۔ والدین کی نافرمانی کی تھی۔ اللہ کی حدوں کو توڑا تھا۔ میری زندگی گناہوں سے عبارت تھی۔ مجھے یقیناً یہ لوگ جہنم کے داروغہ کے حوالے کرنے والے تھے۔ اب کیا ہو سکتا تھا۔ میں دنیا میں اپنے حصے کا وقت گزار چکا تھا۔

میں انتہائی پشیمانی اور پریشانی کے عالم میں چلتا ہوا نورانی صورت باریش بزرگ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ میرا وجود پسینے میں شرابور تھا۔ پیاس کی شدت سے میرا حلق سوکھ چکا تھا۔ مہربان نورانی صورت بزرگ نے میری طرف دیکھا اور کہا۔

"نعمان! مجھے افسوس ہے۔ تمہارے گناہوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ لہٰذا تمہیں دوزخ میں بھیجنے کا فیصلہ ہو چکا ہے مگر آخری دو سالوں میں تم نے کچھ نیکیاں بھی کی ہیں۔ ان کے صلے میں تمہیں کچھ رعایت دی گئی ہے۔ تمہیں صرف دو نوری سال دوزخ کے سب سے کم تر درجے میں گزارنا ہوں گے۔ اس سے نرم سزا کوئی اور نہیں ہے۔ اس درجے میں کوئی خوش نصیب گناہ گار ہی جاتا ہے۔ اس وقت اس درجے میں تمہارے علاوہ ایک لڑکی بھی ہے۔ سزا کے پورا ہوتے ہی تمہیں وہاں سے نکال کر جنت میں پہنچا دیا جائے گا۔" یہ کہہ کر اس نے کرخت صورت فرشتے کو اشارہ کیا اور اس نے مضبوطی سے مجھے بازوؤں سے پکڑ لیا۔

مذہب کے بارے میں میری تعلیم واجبی سی تھی۔ میٹرک تک میں الٹرا ماڈرن اسکولوں میں پڑھا تھا۔ ان اسکولوں میں مذہب سے متعلق تعلیم پر کوئی خصوصی توجہ نہیں دی جاتی۔ بعد از مرگ اسلامی تصورات کیا تھے۔ اس بارے میں میرا علم نہ ہونے کے برابر تھا۔ مسجد میں ایک دو بار خطبے کے دوران دوزخ کے بارے میں مولوی صاحب کی تقریر سنی تھی جو کہ انتہائی ڈراؤنی اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر دوزخ مولوی صاحب کی تقریر کے مطابق ہے تو پھر میری خیر نہیں۔ تین چار کرخت صورت فرشتے میرے ارد گرد جمع ہو چکے تھے۔ انہوں نے سختی سے میرے گلے، پاؤں اور بازوؤں میں موٹی زنجیریں ڈال دیں۔ ان زنجیروں کی وجہ سے مجھے چلنے میں کافی دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ اتنے میں ہم ایک بڑے گیٹ پر پہنچے تو دروازہ خود بخود کھلتا چلا گیا اور ان لوگوں نے مجھے دوزخ کے داروغہ کے حوالے کر دیا۔ داروغہ کی شکل اتنی خوفناک تھی جسے بندہ دیکھتے ہی آدھا رہ جائے۔ لمبا تھل تھل کرتا وجود، کالی بھجنگ صورت، ہاتھ میں گرز لیے اس نے مجھے گردن سے پکڑا اور ایک زبردست دھکا دیا اور مجھے گھسیٹتے ہوئے ایک ایسی جگہ پہنچا دیا جو میرے لیے واقعی دوزخ تھی۔

چاروں طرف آگ ہی آگ جل رہی تھی اور اس آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے اوپر کی طرف نظر دوڑائی تو مجھے آگ اور دھویں کی سیاہی کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو جہنم کا داروغہ مجھے کہیں دکھائی نہ دیا۔ وہ شاید مجھے یہاں چھوڑ کر غائب ہو چکا تھا۔ اچانک میرے پیچھے سے آگ اور دھویں کا ایک مرغولہ اٹھا۔ اس سے بچنے کے لیے میں بے اختیار آگے کی طرف دوڑا مگر

..... شاید میرا وقت پورا ہو چکا تھا۔ مگر میں مایوس نہیں ہونا چاہتا تھا۔ میں آخری حد تک زندگی کی جنگ لڑنا چاہتا تھا۔ اچانک میرا جسم دریا کی تہہ سے ٹکرایا مگر پانی کا تیز بہاؤ مجھے آگے کی طرف دھکا لگائے جا رہا تھا۔ پھیپھڑوں سے تمام ہوا خارج ہو چکی تھی۔ خالی پھیپھڑے سانس روکنے کی حد بھی ختم ہونے کے قریب تھی کہ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میرا وجود کسی تیز بھنور میں پھنس چکا تھا۔ میرا وجود پانی میں بے پناہ تیزی سے چکر کھا رہا تھا۔ سانس روکنے کی میری حدیں ختم ہو چکی تھیں۔ میرے اعصاب آہستہ آہستہ جواب دیتے جا رہے تھے۔ میری آنکھوں کے پردوں کے پیچھے اندھیرے بڑھتے جا رہے تھے۔ اچانک میرے وجود کو ایک زبردست جھٹکا لگنے کا احساس ہوا اور اس کے بعد میں ہوش وحواس سے بیگانہ ہو گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

دوبارہ جب مجھے ہوش آیا تو مجھے محسوس ہوا کہ جیسے عزرائیل میری جان لینے کے لیے مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ مگر نہیں، شاید وہ میری جان لے چکا تھا اور میں ایک روح کی حیثیت سے اپنے وجود کو دیکھ رہا تھا۔ کالے رنگ کی عبا پہنے نورانی صورت میں بھیس بدلے، شاید موت کا فرشتہ میرے ہمراہ تھا۔ وہ میرا وجود دیکھ کے شاید منہ ہی منہ میں کچھ بڑ بڑا رہا تھا۔ شاید وہ کوئی ورد کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میرے چاروں طرف پانی کا تیز ریلا چکر کاٹ رہا تھا اور اس چکر کے درمیانی خلا میں میرا بے حس وجود پڑا تھا۔ شاید میں مر چکا تھا اور نورانی صورت موت کا فرشتہ مجھے اپنے ساتھ لینے آیا تھا۔

میں نے اپنے آپ کو حرکت دینا چاہی مگر اس معاملے میں میں نے خود کو بے اختیار پایا۔ یقیناً میری روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ شاید اسی لیے میں اپنے آپ کو ہلکا محسوس کر رہا تھا پھر نورانی صورت بزرگ نے میری آنکھوں کو اپنے ہاتھوں سے بند کیا اور میری آنکھوں کے آگے ایک کالے رنگ کی چادر سی تن گئی۔ میرا ذہن ایک بار پھر گہری تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

ہوش اور بے ہوشی کی کیفیت میں مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے میرا وجود آسمان کی وسعتوں میں کہیں محو سفر تھا یا پھر میں تحت الثریٰ کی اندھیری گہرائیوں میں کہیں گم ہو رہا تھا۔ میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں معدوم ہوتی جا رہی تھیں اور پھر مجھے متلی کا احساس ہوا۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے مجھے الٹی آ رہی ہو۔ اگر میں مر چکا تھا تو پھر مجھے یہ احساس کیوں ہو رہا تھا؟ اس کے بعد ایک دفعہ پھر میں دنیا ومافیہا سے بے خبر ہو گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

جانے کتنے طویل وقفے یا کتنی دیر بعد مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو ایک عجیب سی خواب ناک اور حیرت انگیز جگہ پر پایا۔ یہاں کا ماحول میری عقل وفہم سے بالاتر تھا۔ میں ایک دبیز سبز رنگ کے قالین پر لیٹا ہوا تھا۔ میرے ہاتھ اور پاؤں آزاد تھے۔ یہ ایک بہت بڑا ہال تھا۔ سارا ہال دودھیا قسم کی سفید سکون آور روشنی سے منور ہو رہا تھا مگر روشنی کا ماخذ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک کونے میں ایک نورانی صورت باریش بزرگ رجسٹر پر کچھ لکھ رہے تھے۔ اس کے سامنے ایک عورت التجائیہ انداز میں کھڑی ہوئی تھی اور اسے کچھ بتا رہی تھی۔ یہ میں کہاں آ گیا تھا؟ میں تو دریا میں ڈوب کر مر گیا تھا تو پھر یہ کون سی جگہ تھی؟ عالم ارواح، جنت یا پھر...... میں ابھی انہی سوچوں میں گم تھا کہ کسی نے مجھے پکارا۔

"نعمان! اٹھو اب تمہاری باری ہے۔"

میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بے حس ہونے لگیں۔ کیا کوئی اتنا بدصورت، اتنا کریہہ بھی ہو سکتا ہے؟ یہ گٹھڑی تھی یا بدبو کا ملبہ؟ یہ عورت تھی یا چڑیل؟ یہ کوئی انسان تھا یا بدبودار سڑا سوکھا گوشت کا لوتھڑا؟ اتنی بدبو تو' دنیا میں شاید کسی مردار جانور کے وجود سے بھی نہ اٹھتی ہوگی۔

نورانی صورت بزرگ نے کہا تھا کہ دوزخ کے اس حصے میں ایک عورت یہاں پہلے سے موجود تھی۔ مگر اب تک جانے یہ کہاں تھی؟ تو کیا یہ وہی عورت تھی؟

اس عورت کے وجود کے اکثر حصوں سے پیپ بہہ رہی تھی۔ اس کے چہرے کے اوپر والی جلد جانے کہاں غائب ہو چکی تھی۔ اب اس کے چہرے پر بدنما قسم کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں اور ان ہڈیوں پر کہیں کہیں سڑا گلا گوشت بھی نظر آ رہا تھا۔ باقی سارے جسم کی ہڈیوں کا بھی یہی عالم تھا۔ اس کی آنکھوں سے پلکیں غائب تھیں۔ شاید وہ جل چکی تھیں۔ اس کے ابرو کی جگہ بھی جلی ہوئی ہڈیاں نظر آ رہی تھیں۔ اس کا پورا چہرہ ہی ایک ایسی کھوپڑی سے مشابہ تھا کہ جسے روسٹ کرنے کی کوشش میں کسی نے جلا کر رکھ دیا ہو۔

یہ عورت تھی؟ نہیں نہیں یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ شاید کوئی مردہ ہے۔ میں نے انتہائی درد ناک اذیت محسوس کرتے ہوئے سوچا۔

مگر میں نے دیکھا کہ اس کے وجود میں سانس کی آمد و رفت جاری تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ ہڈیوں کے اس ڈھانچے میں سانس کا تصور ہی محال تھا۔ میں اس کے تھوڑا سا قریب ہو کر اس کے پاس جا بیٹھا۔ میں نے سینے کے مقام پر ہڈیوں سے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ تھا...... کچھ نہ کچھ تھا...... دل کے مقام پر ایک بدنما سوکھا سڑا گوشت کا پرزہ موجود تھا اور یہ واضح طور پر نظر آ رہا تھا جو حرکت کر رہا تھا۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ کیا اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی کوئی زندہ رہ سکتا ہے؟

نہیں نہیں یہ ناممکن ہے۔ مگر اللہ کے ہاں تو کچھ بھی ناممکن نہیں۔ میں نے ایک عجیب سی کیفیت کے درمیان سوچا۔

☆☆☆☆☆☆☆

قریب بیٹھنے سے بدبو کے بھبکے میرے نتھنوں میں گھس رہے تھے اور میری اندرونی حالت عجیب سے عجیب تر ہوتی جا رہی تھی۔ اس انتہائی عبرت ناک منظر نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیے تھے اور پھر شاید میرا دماغ الٹ گیا۔ میری زبان، دل بلکہ جسم کا روم روم چیخنے لگا اور اس چیخ و پکار میں میں نے دیکھا کہ وہاں موجود ہر شئے میرے ساتھ شامل ہو چکی تھی۔

''میرے پروردگار! تو کہاں ہے؟ میری صدا سن لے اور یقیناً تو سن رہا ہے۔ مجھے معاف کر دے۔ تجھے اپنے محبوب ﷺ کا واسطہ۔ ربِّ کائنات! تجھے اپنے پیاروں کا واسطہ......''

اور پھر میری التجاؤں میں جانے کیا کیا واسطے شامل ہوتے چلے گئے۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے میرا وجود ایک ذرہ تھا اور اس ذرے میں ساری کائنات سما گئی تھی اور ساری کائنات مجسم التجا تھی۔

''اے ربّ العالمین! تجھے اپنے محبوب رحمت اللعالمین ﷺ کا واسطہ۔ میرے مولا! یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ میرے گناہ تیرے محبوب ﷺ کی رحمت کے مقابلے میں زیادہ ہوں۔ مجھے انہی کے صدقے معاف کر دے میرے مولا' مجھے ایک موقع دے دے میرے مولا۔ ایک بار مجھے دنیا میں واپس بھیج دے۔ اب کے میں کبھی گناہ نہیں کروں گا۔''

میرا یہ کہنا تھا کہ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میری

ذات کائنات کی فضاؤں میں کہیں تحلیل ہو گئی تھی۔ یوں کہ جیسے میری ہستی کسی پرسکون وادی میں کہیں گم ہو گئی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆

دوزخ کا دروازہ کھلا اور نورانی صورت بزرگ فرشتوں کے ہمراہ دروازے سے اندر چلا آیا۔ اس نے مجھے آتے ہی کہا۔

"بڑے خوش قسمت ہو۔ تمھاری دعا قبول ہو گئی ہے۔ تمہیں واپس دوبارہ دنیا میں بھیجنے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ آؤ میرے ساتھ چلو۔"

میں ان کے ساتھ واپس جانے لگا تو کسی نے میرا دامن پکڑ لیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہی مردوں سے بھی بدتر کیفیت میں عورت میرا دامن پکڑے ہوئے تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو ایک دفعہ پھر میرا دماغ الٹ گیا۔

میں نے نورانی صورت بزرگ فرشتے سے کہا۔

"آپ اسے بھی میرے ساتھ لے چلیں اور اگر یہ ناممکن ہے تو مجھے بھی یہیں رہنے دیں۔"

"دیکھیے اس کا معاملہ الگ ہے۔ پہلی بات تو یہ میرے بس میں نہیں۔ دوسرے اگر اسے یہاں سے لے جانا ہے تو اسے اس کی اصل حالت میں لانا پڑے گا اور ایسا صرف اسی صورت میں ممکن ہے۔ جب اس کے بارے میں وہیں سے حکم آئے جہاں سے تمھارے بارے میں حکم آیا ہے۔"

اچانک جانے کہاں سے صدا بلند ہوئی۔

"جو یہ کہتا ہے مان لو۔ اس لڑکی کو اس کی اصل حالت میں لوٹا دو۔"

میں نے دیکھا کہ جونہی وہ آواز سنائی دی سبھی فرشتے سجدے میں گر گئے۔ ان کی دیکھا دیکھی میں بھی سجدے میں جا پڑا۔

آواز کے ختم ہوتے ہی فرشتے الرٹ ہو گئے۔ جانے کہاں سے وہ ایک شفاف صندوق لے کر آئے۔ عورت کے ہڈیوں کے ڈھانچے کو اس صندوق میں ڈال دیا۔ اچانک صندوق میں سفید دودھیا رنگ کا دھواں سا پھیلنے لگا۔ ایک دفعہ تو مجھے یوں لگا کہ جیسے شیشے کے صندوق میں دھوئیں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ مگر تھوڑی دیر بعد جب دھواں آہستہ آہستہ بند ہونے لگا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس میں ایک انتہائی حسین و جمیل لڑکی موجود تھی۔

وہ سبھی ہمیں وہاں سے لے کر اسی مقام پر لے آئے جہاں سے اس سارے سلسلے کا آغاز ہوا تھا۔ نورانی صورت بزرگ فرشتے نے ہمیں ایک طویل لیکچر دیا۔ جس کا یہاں بیان کرنا نامناسب ہے۔ انہوں نے ہمیں چند شرائط کے تحت دوبارہ دنیا میں بھیج دیا تاکہ ہم اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر سکیں اور ان مقاصد کی تکمیل کر سکیں جن مقاصد کے لیے ہمیں دوبارہ دنیا میں بھیجا جا رہا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆

اس سفر پر روانہ ہونے سے پہلے نورانی صورت بزرگ فرشتے نے ہمیں شراب طہورہ کا جام پیش کیا جو ہم نے خوشی اور سرشاری کے عالم میں نوش کیا۔ اس کے بعد ہم سو گئے۔

دوبارہ جب میری آنکھ کھلی تو میں نے ایک دفعہ پھر اپنے آپ کو دریا کے اس مقام پر پایا جو میں نے ہوش اور بے ہوشی کے عالم میں دیکھا تھا۔ میں نے دیکھا کہ سفید رنگ کا چوغہ پہنے کوئی شخص مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ اس آدمی نے مجھے سیدھا لٹا کر میرے پیٹ کو دونوں ہاتھوں سے دبایا۔ میرے منہ اور ناک سے پانی بہنے لگا اور یہ عمل وہ اس وقت تک دہراتا رہا جس وقت تک میرے پیٹ سے تمام پانی نکل نہیں گیا۔ مجھے کچھ ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ ہمارے

سروں کے عین اوپر پانی انتہائی تیزی سے چکر کھا رہا تھا۔ مگر ہم لوگ محفوظ تھے کیونکہ اس چکر کا درمیانی خلا محفوظ تھا۔

مجھے یاد آ گیا کہ میرے پیٹ سے پانی نکالنے والا وہی شخص تھا جس کے بارے میں نورانی صورت بزرگ فرشتے نے مجھے کہا تھا کہ وہ اللہ کا ولی اور خاص الخاص بندہ ہے اور یہ کہ مجھے باقی زندگی اس کی اتباع میں گزارنا ہے۔ اس کی جو نشانیاں مجھے بتائی گئی تھیں وہ ان پر سو فیصد پورا اترتا تھا۔ میں نے اپنے لہجے میں انتہائی عقیدت سموتے ہوئے پوچھا۔

''حضور! کیا آپ کا نام ابو جندل ہے؟''

''سبحان اللہ بھئی خوب پہچانے! اور اب یہ بھی جان لو کہ تمہارا نام ابو طلحہ ہے پرانے نام اور پرانی شناخت کو بھول جاؤ۔ یہاں تک کہ جہاں سے اب تم واپس آ رہے ہو اس جگہ کو بھی۔ یہاں سے ہمیں تمہارا وجود ہی درکار تھا وہ ہم نے لے لیا ہے۔ یہ بھی اس ذات کا معجزہ ہے کہ تمہارا وجود جو پچھلے کچھ عرصے سے یہاں پڑا گل سڑ چکا تھا دوبارہ اپنی اصل حالت میں آ چکا ہے۔ باقی باتیں ہم کیمپ میں چل کر ہی کریں گے وقت بہت کم ہے۔''

یہ تمام باتیں پانی کے بے پناہ شور کے درمیان ہو رہی تھیں اس لیے کافی اونچا بولنا پڑ رہا تھا۔ میرا تمام وجود تندرست اور چاق و چوبند ہو چکا تھا۔ چوٹوں اور گھسٹنے کے نشانات کا تو پتہ نہیں کہ وہ میرے جسم پر تھے یا نہیں کیونکہ مجھے اپنے آپ کو تسلی سے دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا البتہ مجھے محسوس یہی ہو رہا تھا کہ اس حوالے سے مجھے پریشان ہونے کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔

اتنے میں ابو جندل یہاں سے نکلنے کی تیاری کر چکا تھا۔ میرے جسم پر کالے رنگ کا ٹراؤزر موجود تھا۔ دوسری کئی باتوں کے ساتھ میں نے اس بات پر بھی کوئی دھیان نہ دیا کہ یہ سب کیسے ممکن ہوا کیونکہ میرا الیقین بن چکا تھا کہ اللہ کے ہاں کچھ بھی ناممکن نہیں اور یہ سب تو معمولی سی باتیں ہیں جب وہ موت کے بعد زندگی دے چکا تھا تو پھر اس کے ہاں کس چیز کی کمی تھی۔

ابو جندل اور میں دونوں اس خلا میں ایک طرف ہو کر بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک خلا کے درمیانی حصے کی زمین میں حرکت کے آثار نظر آئے۔ ریت اوپر اٹھ رہی تھی اور پھر آہستہ آہستہ ریت میں سے ایک شیشے کا چوکور بکس نمودار ہوا۔ بکس آہستہ آہستہ اوپر اٹھ رہا تھا اور اس پر پڑی ہوئی ریت نیچے گر رہی تھی۔ جب بکس تقریباً چھ فٹ کے قریب اوپر آ گیا تو ابو جندل کھڑا ہو گیا۔ اس نے جیب سے کوئی ریموٹ ٹائپ کا آلہ نکالا اور کوئی کوڈ پریس کرنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ ہماری طرف سے شیشے کی شیٹ نیچے جا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ یہ شیٹ مکمل طور پر نیچے چلی گئی۔ ابو جندل نے مجھے اشارہ کیا اور ہم دونوں شیشے کے اس چوکور بکس میں داخل ہو گئے۔ یہ بالکل لفٹ کی مانند تھا۔ شیشے کی شیٹ دوبارہ اوپر آئی اور بکس بند ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی بکس حرکت میں آیا اور ہم نیچے جانے لگے۔ ہم تھوڑا سا نیچے گئے تو لفٹ رک گئی۔ ایک سائیڈ کی شیٹ دروازے کی طرح کھلی اور ہم لفٹ سے نکلے۔ ابو جندل نے ٹارچ روشن کی تو میں نے دیکھا کہ جہاں ہم کھڑے تھے وہ ایک سرنگ تھی۔ بیٹریوں سے چلنے والی ایک بے آواز ٹورسٹ گاڑی بھی وہاں موجود تھی جو کہ یقیناً ہمارے لیے ہی تھی۔ ہم اس پر بیٹھے تو ابو جندل نے گاڑی کی ہیڈ لائٹس آن کر دیں۔

میں حیران تھا کہ دریا کے پانیوں کے نیچے اتنا بڑا سیٹ اپ؟ یہ سرنگ آخر کہاں جا رہی تھی؟ میں ایک نئے جہان حیرت سے متعارف ہو رہا تھا۔ گاڑی کی

رفتار نارمل تھی اور تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد گاڑی ایک جگہ پر رک گئی۔ مگر سرنگ یہاں ختم نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے بعد اسی طرح لفٹ کے ذریعے ہم اوپر موجود ایک سرکاری بنگلہ ٹائپ رہائش گاہ تک پہنچے۔ ابوجندل نے مجھے حیران و پریشان دیکھا تو ہلکا سا مسکراتے ہوئے کہا۔

"برخوردار! گھبراؤ مت۔ منزل تک پہنچنے تک نارمل رہو۔ میں تم سے کچھ بھی نہیں چھپاؤں گا۔ ہمیں تمھاری ذات پر مکمل اعتماد ہے۔ امید ہے تم بھی اسی اعتماد کے ساتھ ہمارے ساتھ چلو گے۔"

اس رہائش گاہ میں چھ بندے اور بھی تھے۔ جن میں وہ لڑکی بھی شامل تھی اور وہ بھی لوگ شاید ہمارا ہی انتظار کر رہے تھے۔ لگتا تھا ہماری منزل ابھی دور تھی۔ بنگلے میں ایک بڑا کنٹینر موجود تھا۔ ہم سب لوگوں کو اس کنٹینر میں پہنچا دیا گیا۔ اس کنٹینر میں کھانے پینے کا سامان ایک فریج میں موجود تھا۔ کھانا گرم کرنے اور چائے وغیرہ بنانے کے لیے ایک چھوٹا سا گیس سلنڈر بھی رکھا ہوا تھا۔ کنٹینر میں آرام دہ صوفہ سیٹ لگا ہوا تھا۔ جو کہ ہم سات نفوس کے لیے کافی تھا۔ اس پر ہم نہ صرف آرام سے بیٹھ سکتے تھے بلکہ سو بھی سکتے تھے۔ ابوجندل کنٹینر کے اندر آیا اور اس نے سبھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"آپ سبھی لوگ اس کنٹینر میں ہمارے معزز مہمانوں کی حیثیت سے سفر کرو گے۔ ہماری منزل ایک ہے مگر کچھ وجوہ کی بناء پر میں آپ کے ساتھ یہ سفر کرنے سے قاصر ہوں۔ آپ سب لوگ اس سفر کے دوران ایک دوسرے سے گپ شپ کریں۔ کھانے پینے کے تمام لوازمات کنٹینر میں موجود ہیں۔ ہوا کا مناسب بندوبست بھی ہے آپ کو راستے میں کوئی تکلیف نہ ہو اور میں امید کرتا ہوں کہ آپ کا یہ سفر انتہائی خوشگوار گزرے گا۔"

یہ کہہ کر ابوجندل نے کنٹینر کے وسط میں کھڑے ہو کر اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریموٹ کا بٹن پریس کیا تو کنٹینر کے وسط میں سٹیل کی ایک شیٹ حائل ہو گئی۔ اس کے بعد یوں محسوس ہوا کہ جیسے کچھ لوگ کنٹینر کے پچھلے حصے میں کوئی سامان لوڈ کر رہے ہوں۔ تقریباً آدھ گھنٹا بعد کنٹینر روانہ ہو گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

یہ چاروں طرف سے بلند و بالا پہاڑوں سے گھری ہوئی وادی تھی۔ وادی کے وسط میں ہمارا کیمپ تھا۔ یہاں قریب قریب کسی آبادی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ ہماری ٹریننگ جاری تھی۔ اس ٹریننگ میں ہم سات لوگ شامل تھے۔ ابوجندل کے علاوہ بھی یہاں کچھ لوگ تھے جو ہمیں ہر قسم کا اسلحہ چلانے اور جسمانی مشقت کی ٹریننگ دینے پر مامور تھے۔ اس کے علاوہ ہماری روحانی تربیت بھی ہو رہی تھی جو کہ ابوجندل خود کر رہا تھا۔ ہم سبھی لوگ ابوجندل اور اس کے ساتھیوں کے الفاظ پر دل و جان سے عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتے تھے۔ ہمارا مقصد جنت کا حصول اور رضائے الٰہی تھا۔ ہمارے ساتھ موجود لڑکی کا نام نوشین تھا اور یہ وہی لڑکی تھی جسے میری سفارش پر دوزخ سے نکالا گیا تھا۔ اس کا میری طرف جھکاؤ بڑھتا جا رہا تھا۔

ابوجندل کے روحانی تبلیغی دورانیے میں اسلام اور جہاد کے فلسفے پر بحث غیر محسوس انداز میں انتہا پسندی کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ ہماری سوچ کے زاویوں میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوتی جا رہی تھیں۔ سوال و جواب کے وقفے میں نوشین ایسے ایسے سوال کرتی تھی کہ ایک دفعہ تو لگتا کہ جیسے ابوجندل کو لاجواب کر دے گی مگر جونہی ابوجندل جوابی دلائل کا آغاز کرتا تو ہم سب کو لاجواب کر دیتا۔ ابوجندل کے خیالات ہمارے دل و دماغ میں نقش ہوتے جا رہے

تھے۔ دوسرے لفظوں میں ابو جندل ہمارے دل و دماغ پر حاوی ہوتا جارہا تھا۔ سوال و جواب کے وقفے کے دوران ایک بار میں نے ان سے پوچھا۔

"حضور! اسلام میں عورت کے لیے پردے کا سخت حکم ہے اور عورت کو چار دیواری کی زینت کہا گیا ہے جبکہ نوشین ہم سبھی لوگوں کے درمیان اس امر کی نفی کرتی ہوئی موجود ہے اور آپ نے اس بارے میں نوشین کو کبھی منع بھی نہیں کیا؟ کیا یہ درست ہے؟"

ابو جندل نے پرسوچ نظروں سے مجھے دیکھا اور ہلکا سا مسکرانے کے بعد فرمانے لگے۔

"بیٹا! آپ نے بہت اچھا سوال کیا ہے۔ اسلام میں عورت کے لیے واقعی یہ حکم موجود ہے مگر پردہ کیا ہے؟ پردے کا وہ مفہوم جو کہ آپ کو علما نے سمجھایا ہے وہ درست نہیں۔ اسے ٹھیک کرنے کی ضرورت ہے اور یہ ایک لمبی بحث ہے اور میں اس میں پڑ کر آپ سب لوگوں کا قیمتی وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ پردے کا حکم دینے کا مقصد صرف اور صرف یہ تھا کہ انسانی سوچ کو بھٹکنے سے بچایا جائے اور یہاں صورت حال یہ ہے کہ ہم سب لوگ صرف اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لیے جمع ہوئے ہیں اور ہم بعد از مرگ کے تلخ حقائق سے بھی آگاہ ہو چکے ہیں لہٰذا میرے خیال میں یہاں اس کی قطعاً ضرورت نہیں۔ بلکہ یہاں نوشین کی موجودگی نوشین سمیت آپ سب لوگوں کا امتحان ہے اور یہ سب ازلی فیصلے ہیں ان میں کوئی بھی ترمیم ناممکن ہے۔"

ہم صبح سویرے کی نماز سے فارغ ہوتے ہی باہر گراؤنڈ میں موجود ہوتے۔ ہلکی پھلکی ورزش کے بعد ہماری سخت جسمانی ٹریننگ شروع ہو جاتی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اسلحے کے استعمال کی تربیت بھی دی جارہی تھی۔ نوشین اور دوسرے لڑکے بھی آپس میں گھل مل گئے تھے۔ یہ تصور ہی ختم ہو گیا تھا کہ نوشین ایک لڑکی تھی۔ ہم بھی اپنی عاقبت سنوارنے کی فکر میں لگے ہوئے تھے۔ حالانکہ نوشین ہم سبھی لوگوں کے درمیان بے پردہ گھومتی رہتی تھی اور اس کا حسن بھی ایسا تھا کہ پارساؤں کے لیے بھی خطرہ ایمان تھا مگر مجال ہے کہ ہم میں سے کسی نے اس بارے میں سوچا بھی ہو۔ دن یوں ہی گزرتے جارہے تھے۔ ہماری ٹریننگ مکمل ہونے کے قریب تھی کہ ایک دن ایک عجیب سا واقعہ رونما ہوا جس نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔

باہر گراؤنڈ میں ہم سبھی لوگ ٹریننگ میں مصروف تھے کہ نوشین نے ہم سے کہا کہ وہ پانی پینے کے لیے غار میں جارہی ہے۔ پیاس تو مجھے بھی بہت لگی تھی مگر میں نے اس کے ساتھ غار میں جانا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ آتے ہوئے ہمارے لیے بھی پانی لیتی آئے مگر کافی دیر گزر جانے کے بعد بھی وہ واپس نہ آئی تو میں اس کے پیچھے غار میں چلا گیا۔ میں نے اندر جا کر پانی پیا اور دوسرے لوگوں کے لیے بھی تین چار بوتلوں میں پانی ساتھ لے لیا۔ میں نے ادھر ادھر نوشین کو تلاش کیا مگر وہ مجھے کہیں نہ ملی۔ میں مایوس ہو کر واپس جارہا تھا کہ ابو جندل کے کیبن سے مجھے نوشین اور ابو جندل کی باتوں کی آواز سنائی دی۔ ابو جندل کہہ رہا تھا۔

"نوشین ابھی یہ ناممکن ہے۔ ابھی ان لوگوں کے ذہن خام ہیں ابھی ان لوگوں کو سخت تربیت کی ضرورت ہے اور جو بات تم کہہ رہی ہو اس کے لیے مجھے بڑوں سے اجازت لینی پڑے گی۔"

اس کے بعد نوشین کی مدھم سی آواز سنائی دی۔ اس نے کہا

"دیکھو ابو جندل! سوچ لو...... مگر تمہارے لیے بہتری اسی میں ہے کہ فیصلہ میرے حق میں ہونا چاہیے۔"

”ہاں ہاں! کیوں نہیں۔ میں اپنی طرف سے پوری پوری کوشش کروں گا کہ میں بڑوں کو اس بارے میں راضی کرسکوں۔ ہم نے ان لوگوں پر بہت محنت کی ہے اور ہم نہیں چاہتے کہ انہیں ہماری ذات پر کوئی معمولی سا بھی شک ہو۔ تم بھی تھوڑا سا اپنے آپ پر کنٹرول رکھو ورنہ سب کچھ تباہ و برباد ہو جائے گا۔“

”ابو جندل! میں تو صرف اور صرف یہ چاہتی ہوں کہ ابو طلحہ سے میرا نکاح ہو جائے اور میں چند راتیں اس کے ساتھ گزار سکوں۔ ورنہ مجھے اس سے کوئی دلی لگاؤ نہیں ہے اور نہ ہی میں اس کی محبت میں پاگل ہوئی جا رہی ہوں۔ اتنی سی بات مان لینے سے کیا ہو جائے گا۔ اس کے بعد میں جانتی ہوں کہ ان لوگوں کے ساتھ کیا ہونا ہے۔“ نوشین نے نخریلے انداز میں غصہ دکھاتے ہوئے کہا۔

اور پھر مجھے یوں لگا کہ جیسے نوشین کیبن سے باہر آرہی ہو۔ میں چپکے سے وہاں سے تیزی سے نکلا اور باہر گراؤنڈ میں چلا آیا۔ میرے بعد نوشین بھی باہر گراؤنڈ میں آگئی۔

اس دن کی ابو جندل اور نوشین کی گفتگو نے میرے ذہن میں دراڑیں ڈال دی تھیں۔ میرے ذہن میں شکوک و شبہات جنم لے چکے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ سب کیا تھا۔ میرا ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بن چکا تھا۔ اگر یہ سب دھوکا تھا تو؟ اس کے بعد میری سوچ کام کرنا چھوڑ دیتی تھی۔ اتنا بڑا دھوکا؟ آخر یہ کون لوگ تھے جو ایسا کر رہے تھے؟ کم از کم یہ لوگ مسلمان تو نہیں ہو سکتے تھے۔ تو پھر یہ کون لوگ تھے؟ اور ان لوگوں کے مقاصد کیا تھے......؟

سوالات کا ایک ہجوم تھا جو میرے ذہن کے نہاں خانوں میں گردش کر رہا تھا۔ یہ کوئی بہت اونچا کھیل تھا اور اس کھیل کو سمجھنے کے لیے بہت زیادہ ہوشیاری اور عقل مندی کی ضرورت تھی۔ میں نے بہت اچھے طریقے سے ٹریننگ میں حصہ لیا تاکہ نوشین کو مجھ پر کوئی شک نہ ہو۔ ابو جندل کی ذات جسے میں اپنے ایمان کا حصہ بنا چکا تھا۔ اتنی گھناؤنی تھی؟ یہ تو میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ بہر حال اتنا میں سمجھ چکا تھا کہ ان لوگوں کا سارا سیٹ اپ ہی جھوٹ اور فریب پر مبنی تھا۔ یہ لوگ ہماری معصومیت کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ ہمارے ساتھ نوشین کے علاوہ پانچ لڑکے بھی اس ٹریننگ میں شامل تھے۔ یہ ٹریننگ اب اس مرحلے میں تھی کہ میرے خیال کے مطابق اگر میں ان لڑکوں سے کوئی بھی ایسی ویسی بات کرتا تو وہ میری تکہ بوٹی کرنے میں دیر نہ کرتے۔ مجھے بہت ہوشیاری سے کام لینا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆

ان لوگوں کو سبق سکھانا مجھ پر فرض ہو چکا تھا اور میں بڑی خوش اسلوبی سے یہ فرض ادا کرنا چاہتا تھا۔ جہاں تک ان پانچ لڑکوں سے بات کرنے کا تعلق تھا تو یہ بیکار تھا کیونکہ وہ لوگ سمجھانے کی منزل سے گزر چکے تھے۔ میں خود بھی اگر اپنے کانوں سے اس دن ان لوگوں کی گفتگو نہ سن لیتا تو کسی کی بات پر یقین نہ کرتا۔ میں نے رو رو کر خدا سے اس دلدل سے نکلنے کی دعا مانگی۔

اتنا بڑا دھوکا؟ یقیناً ان لوگوں نے کہیں دوزخ کا مصنوعی سیٹ اپ بنا رکھا تھا جہاں جدید سائنسی آلات کی مدد سے یہ لوگ یہ سیٹ اپ چلا رہے تھے۔ مگر نوشین کا بدبودار اور عبرت ناک جسم خوب صورتی میں کیسے ڈھل گیا؟ شیشے کے بکس میں جب دھواں سا پھیلا تھا تو اس دوران کچھ ہوا تھا۔ کیا یہ سب حقیقت تھا؟ اور یہی وہ نکتہ تھا جس نے میرے دماغ کو چکرا کر رکھ دیا۔ یہ سب ان لوگوں نے کیسے کیا؟ ایک عبرتناک وجود جو مردوں سے بھی بدتر

حالت میں زندہ تھا اور پھر وہ عبرت ناک وجود کیسے خوب صورت پیرائے میں ڈھل گیا؟

یہ سب کیا تھا آخر؟ یہ بات تو یقینی تھی کہ یہ لوگ جھوٹے تھے۔ نہ تو یہ لوگ ولی تھے اور نہ ہی خدا کے بر گزیدہ بندے...... تو پھر یہ کون لوگ تھے جو ہمارے ایمان سے کھیل رہے تھے اور جسے ہم آخرت کی بھلائی سمجھ رہے تھے وہ تو سراسر گھاٹے کا سودا تھا۔ میرے دل میں ان کے خلاف نفرت بڑھتی جا رہی تھی یہ تمام خیالات میرے ذہن و دل میں گردش کرر ہے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر کنٹرول کیا ہوا تھا اور اپنے چہرے کے تاثرات سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ مجھے اصل حالات کا علم ہو چکا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

صبح کی ہلکی پھلکی ورزش کے بعد ہماری سخت جسمانی ٹریننگ کا آغاز ہوتا تھا اور اس ٹریننگ میں پانچ میل کی دوڑ بھی شامل تھی جو کہ ہم پہاڑوں کے درمیان بنے قدرتی گراؤنڈ میں پوری کیا کرتے تھے۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ میں اپنے ساتھیوں میں سے کسی سے بھی ان لوگوں کی حقیقت کے بارے میں کوئی ڈسکس نہ کروں گا اور آج رات میں اس غار سے باہر نکل کر اس جگہ کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ غار سے باہر نکلنے کا ایک ہی راستہ تھا جو کہ ہم سبھی کے علم میں تھا اور اس راستے سے باہر نکلنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا کیونکہ غار کے دہانے پر رات کے وقت دو مسلح گارڈز کی ڈیوٹی ہوتی تھی اور یہ بھی ممکن تھا کہ ان کے علاوہ بھی کچھ لوگ باہر پہاڑوں میں کہیں چھپے ہوئے اس پہرے پر موجود ہوں۔

رات کے تقریباً بارہ بج چکے تھے۔ سبھی لوگ غار میں لکڑی سے بنے اپنے اپنے کیبنوں میں سو رہے تھے۔ میں آہستگی سے اپنے کیبن سے نکلا۔ میرے ہاتھ میں ایک پنسل ٹارچ موجود تھی اور میں نے کسی بھی قسم کی صورت حال سے نمٹنے کے لیے ایک پسٹل بھی اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ میں اس غار سے باہر نکلنے کا کوئی دوسرا راستہ ڈھونڈنا چاہتا تھا اور اس سارے سیٹ اپ کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا تاکہ میں آئندہ کے لیے پلاننگ کرسکوں۔ یہ غار کافی وسیع تھا اور اس میں کئی رخنے اور دراڑیں بھی تھیں مگر میرے علم میں اس غار سے نکلنے کا غار کے دہانے کے علاوہ کوئی راستہ نہ تھا اور آج کی رات میں یہاں سے نکلنے والا کوئی متبادل راستہ تلاش کرنا چاہتا تھا۔

میں نے پنسل ٹارچ کی روشنی میں غار کے پہلے سرے سے لے کر آخری سرے تک ساری تلاشی لے لی۔ غار کا کونہ کونہ چھان مارا مگر مجھے کوئی دوسرا راستہ نہیں ملا۔ مجھے کیبن سے نکلے پورا ایک گھنٹہ ہو چکا تھا اور اس تلاش میں میری کافی جسمانی قوت صرف ہو چکی تھی۔ میں نے مایوسی کے عالم میں ٹارچ بند کی اور ایک کونے میں بیٹھ کر ستانے لگا۔

اچانک مجھے کیبن کی طرف سے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ یااللہ خیر! رات کے اس پہر یہ کون ہو سکتا تھا؟ کیا انہیں میرے کیبن سے غائب ہونے کا علم ہو گیا تھا؟ کیا انہیں پتہ چل گیا تھا کہ میں ان کی حقیقت سے واقف ہو چکا ہوں؟ اگر میرے اندیشے درست تھے تو یہ بہت ہی خطرناک صورت حال تھی۔ میں غار کے ایک کونے میں دبکا ہوا سانس روکے کسی بھی صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ قدموں کی آہٹیں قریب ہوتی جا رہی تھیں۔ جہاں میں بیٹھا ہوا تھا اس کے بالکل سامنے غار کی دیوار کے قریب وہ لوگ رک گئے۔ اندھیرے میں مجھے دو ہیولے نظر آر ہے تھے اور پھر انہوں نے

آہستگی میں آپس میں کوئی بات کی۔ رات کے اس پہر غار کی فضا کے سناٹے میں جب ان لوگوں نے سرگوشیوں میں بات کی تو میں جان گیا کہ وہ کون تھے۔ یہ ابو جندل اور نوشین تھے۔ یہ اس وقت یہاں کیا کر رہے تھے؟ یاالٰہی یہ کیا ماجرا تھا؟ کیا ابو جندل اور نوشین؟ نہیں یہ کیسے ممکن تھا۔ نوشین کو ابو جندل میرے سامنے کئی دفعہ بیٹی کہہ کر پکار چکا تھا۔ یہ لوگ اتنے گھناؤنے اور مکروہ تھے یہ تو میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

مگر اس سے پہلے کہ میری سوچ کا پنچھی کہیں اور جا نکلتا' ایک حیرت انگیز اور محیر العقول صورت حال نے میری سوچ کے پنچھی کی پرواز کو بریک لگا دیے۔ غار کی دیوار ایک جگہ سے شق ہوتی نظر آ رہی تھی۔ یہ اتنا بڑا خلا تھا کہ اس میں سے دو بندے کھڑے ہو کر آسانی سے گزر سکتے تھے۔ نوشین اور ابو جندل آگے بڑھے اور اس خلا میں سے گزر کر باہر نکل گئے۔ ان کے جانے کے بعد خلا آہستہ آہستہ بند ہوتا جا رہا تھا۔ اس خلا سے باہر پہاڑوں میں پھیلی ہلکی سی چاندنی نظر آ رہی تھی میں بھاگ کر اس خلا کے قریب پہنچا۔ میں نے دیکھا وہ دونوں کافی جلدی میں تھے اور سیدھے بھاگتے جا رہے تھے میرے پاس وقت بالکل نہیں تھا اور پھر...... میں نے ایک خطرناک فیصلہ کیا۔ اس سے پہلے کہ خلا مکمل طور پر بند ہو جاتا میں نے جلدی سے چھلانگ لگائی اور خیریت گزری کہ میرا اسمارٹ سا جسم خلا میں سے آسانی سے گزر گیا اور اس سے تقریباً دو سیکنڈ بعد خلا اتنا بند ہو چکا تھا کہ اس میں سے میرا گزرنا ناممکن تھا۔ میں نے جلدی سے ادھر نظر دوڑائی جدھر ابو جندل اور نوشین بھاگتے ہوئے جا رہے تھے مگر وہ مجھے کہیں نظر نہ آئے۔ وہ لوگ اتنی سی دیر میں کہاں غائب ہو سکتے تھے؟

میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے فضا میں ہیلی کاپٹر کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دی۔ میں نے اوپر دیکھا تو مجھے ایک ہیلی کاپٹر نظر آیا۔ جس کی آواز نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ ہیلی کاپٹر تھوڑی دور بنی ایک چٹان پر آ کے رک گیا اور اسی وقت جانے کہاں سے نوشین اور ابو جندل نمودار ہوئے اور ہیلی کاپٹر میں سوار ہو گئے۔ ان کے سوار ہوتے ہی ہیلی کاپٹر نے دوبارہ پرواز پکڑی اور مغرب کی پہاڑیوں کی طرف پرواز کر گیا۔ جانے یہ لوگ کہاں جا رہے تھے؟

ہلکی چاندنی میں وہ جگہ نظر آ رہی تھی جس جگہ سے ہیلی کاپٹر نے پرواز کی تھی۔ میں نے دیکھا تو مجھے وہاں کمانڈوز کی وردی میں دو اشخاص نظر آئے۔ ان کا منہ دوسری طرف تھا۔ وہ آپس میں گفتگو کرتے نظر آ رہے تھے۔ میں کسی خیال کے تحت ان کی طرف بڑھا۔ اونچے نیچے راستوں سے ہوتا ہوا میں ان کی پشت پر جا پہنچا۔ میں ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں جا بیٹھا اور ان کی گفتگو سننے لگا۔ ان کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا کہ ان میں سے ایک لڑکی تھی۔ پتھر کی اوٹ سے میں نے دیکھا تو مجھے لڑکی بالکل برہنہ حالت میں نظر آئی اور اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ اس کا ساتھی اس کی کنپٹی سے پسٹل لگائے سختی سے کہہ رہا تھا۔

"دیکھو میگی! کرنل رونیڈن کو تو تم جانتی ہی ہو۔ تم اس سے جو مرضی کہنا۔ وہ تمہاری کوئی بات نہیں سنے گا کیونکہ وہ خود تمہارے جیسی کئی لڑکیوں کو اپنے استعمال میں لا چکا ہے اور یہی بات اس نے تم سے بھی کہی تھی مگر تم نے اس کی بات نہیں مانی اور اسی بات کی سزا دینے کے لیے اس نے تمہیں آج میرے ساتھ اس ڈیوٹی پر بھیجا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ تم میری بات رضا مندی سے مان لو۔ ورنہ اس جگہ پر تمہاری مدد کے لیے کوئی بھی نہیں آئے گا۔"

''ڈیوڈ! میں تم لوگوں کے ساتھ منہ کالا کرنے سے مرجانا بہتر سمجھتی ہوں۔ تم گولی چلاؤ اور میرا خاتمہ کر دو۔ میں ویسے بھی اس زندگی سے اکتا چکی ہوں۔ اگر یہاں آنے سے پہلے مجھے تھوڑا سا بھی یہاں کے حالات کا پتہ ہوتا کہ تم لوگ لڑکیوں کے ساتھ ایسا وحشیانہ سلوک کرتے ہو تو میں وہیں پر اپنے گلے میں پھندا ڈال کے مرجاتی۔ چلاؤ گولی بے غیرت انسان اور مجھے مار ڈالو۔ مجھے مار ڈالو۔''

میں آہستگی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور سیکنڈ کے بھی ہزارویں حصے میں وہ فاصلہ طے کرتے ہوئے گورے ڈیوڈ کے سر پر جا پہنچا اور اس سے پہلے کہ گورا ڈیوڈ کچھ سوچتا میں پسٹل کی نال اس کی کنپٹی سے لگا چکا تھا۔ میں نے انتہائی سرد لہجے میں کہا۔

''مسٹر ڈیوڈ! کوئی بھی غلط حرکت مت کرنا ورنہ میں تمہارے بھیجے میں سوراخ کردوں گا۔ او کے؟''

''او کے او کے سر! آپ کون ہے سر گولی مت چلانا۔ ہماری تمہاری کوئی دشمنی نا ہیں۔'' اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہنے کی کوشش کی۔

''او کے مسٹر ڈیوڈ اب اچھے بچوں کی طرح اپنا پسٹل دور پھینک دو۔ شاباش۔'' میں نے اسی خطرناک لہجے میں کہا۔

اس نے یہ سنتے ہی اپنا پسٹل میگی کی کنپٹی سے ہٹایا اور دور پھینک دیا۔ اس نے گھگھیاتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر اس سے پہلے ہی میگی نے کہا کہ اس کا دوسرا ساتھی بھی یہاں موجود ہے اس کا یہ بتانا بروقت تھا کیونکہ عین اسی وقت کسی نے میرے سر کے عقب میں پستول کا دستہ مارنے کی کوشش کی مگر میں اس سے پہلے ہی گھوم چکا تھا۔ پستول کا دستہ اچٹتا ہوا سا میرے کندھے سے ٹکرایا مگر یہ چوٹ قابل برداشت تھی۔ میں نے واپس مڑتے ہی اس شخص کے پیٹ میں گھونسا جڑ دیا۔ اس کے منہ سے اوغ کی آواز نکلی۔ اس نے میری طرف پستول کا رخ کر کے گولی چلا دی۔ میں تیزی سے نیچے بیٹھ گیا۔ گولی میرے سر کے بالوں کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ میں نے نیچے بیٹھتے ہی اس کے پستول والے ہاتھ پر کھڑی ہتھیلی کا وار کیا اور اس وار نے اسے بے حد اذیت میں مبتلا کر دیا۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کہیں دور جا گرا۔ اس کے بعد میں نے اس کی دھنائی شروع کر دی۔ جونہی میں اس کے ساتھ مصروف عمل ہوا تھا تو میگی نے ایک بہت زبردست کام کیا تھا۔ اس نے اپنے پاؤں کی زبردست ٹھوکر سے ڈیوڈ کو ڈھلان کی طرف دھکیل دیا اور وہ ڈھلان پر ایسا پھسلا کہ اس کی چیخوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ نیچے کہیں گہری کھائی میں جا گرا تھا اور اس کی طرف سے اب مکمل خاموشی تھی۔ جس شخص کے ساتھ میں مصروف عمل تھا۔ وہ اب نڈھال ہو چکا تھا اور اس کی ساری اکڑفوں ہوا ہو چکی تھی۔ وہ اس لڑائی سے پہلے شراب پی چکا تھا کیونکہ وہ دونوں آج ادھر میگی کے ساتھ جشن منانے آئے تھے۔ ان کے خواب وخیال میں بھی نہ تھا کہ ان کے ساتھ ایسا ہوگا۔

میں نے اس شخص کے سر میں پستول کے دستے سے ایک کاری ضرب لگائی اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس کے بے ہوش ہوتے ہی میگی میرے قریب چلی آئی۔ وہ ڈیوڈ سے نمٹنے کے بعد اپنی وردی پہن چکی تھی۔ اس نے انتہائی متشکرانہ نظروں سے مجھے دیکھا اور کافی صاف اردو میں کہا۔

''میں آپ کا شکریہ ادا نہیں کروں گی کیونکہ آپ کے احسان کے آگے شکریہ کا لفظ بہت چھوٹا ہے۔ بہر حال پھر بھی مجھے کچھ نہ کچھ تو کہنا چاہیے۔ مگر مجھے کیا کہنا چاہیے۔ اس کے لیے مجھے......''

میں نے اس کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی

اور کہا۔

''یہ سب ثانوی باتیں ہیں۔ زندگی رہی تو پھر کبھی یہ باتیں بھی ہوتی رہیں گی۔ کیا میں آپ کو میگی کے نام سے پکار سکتا ہوں؟''

''ہاں ہاں کیوں نہیں مسٹر؟''

''جی میرا نام......'' میں نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اس کی طرف غور سے دیکھا تو میرے دل نے کہا کہ میں اس پر اعتبار کر سکتا ہوں۔ میں نے کہا۔

''میرا نام نعمان ہے۔ گھر والے اور میرے دوست احباب مجھے پیار سے نومی بھی کہہ لیتے ہیں۔'' کیا آپ مجھے اپنے دوستوں میں شامل کرنا پسند کریں گے؟'' میگی نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''وائے ناٹ میگی۔ ہم شاید کچھ دیر پہلے اس کی ابتدا کر چکے ہیں۔ لہذہ اس پر زیادہ بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ کی اردو بہت صاف ہے۔ آپ کا تعلق کس ملک سے ہے؟''

''میرا تعلق تو امریکہ سے ہے مگر اردو میں نے اپنے پڑوسی انکل حیدر رضوی کی بیٹی شگفتہ سے سیکھی تھی۔ شگفتہ میری بہت اچھی دوست ہے۔ جہاں تک امریکن فورس جوائن کرنے کی بات ہے تو یہ ایک لمبی کہانی ہے اور میرے خیال میں ہم دونوں کے پاس اتنا وقت نہیں کہ ہم یہاں بیٹھ کے ان باتوں میں اپنا وقت ضائع کریں۔ کیونکہ تھوڑی دیر میں ہیلی کاپٹر واپس آنے والا ہے اور یہاں پستول کی گولی کی آواز بھی رات کے سناٹے میں دور تک سنی گئی ہو گی۔ مجھے یہاں کے حالات کا تو زیادہ علم نہیں کیونکہ ان لوگوں نے آج مجھے یہاں سزا دینے کے لیے بھیجا تھا اور اس سے پہلے میں یہاں کبھی نہیں آئی۔ البتہ مجھے اتنا ضرور علم ہے کہ یہاں سے امریکن فورسز کی چوکی زیادہ دور نہیں اور یقیناً ان لوگوں نے فائر کی آواز سن لی ہوگی اور وہ کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے ہیں۔''

''تمہارا تجزیہ درست ہے میگی۔ تو پھر تمہارا کیا مشورہ ہے، ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔'' میں نے پرسوچ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''دیکھیں نعمان! آپ کا تو مجھے علم نہیں کہ آپ یہاں کس سلسلے میں موجود ہیں اور آئندہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ مگر میری طرف سے ایک بات کنفرم ہے کہ میں کم از کم واپس ان لوگوں میں نہیں جانا چاہتی۔ کیونکہ مجھے علم ہے کہ وہ لوگ میرے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ میں......''

''مایوسی کی باتیں مت کرو میگی۔ حوصلہ رکھو۔ اللہ نے چاہا تو ہم جلد ہی اس جہنم سے نجات حاصل کر چکے ہوں گے۔ پہلے آؤ اس امریکی وحشی کو اس کے ساتھی کے پاس پہنچا دیں۔ کیونکہ اس کا زندہ بچ نکلنا ہمارے لیے کسی نئی مصیبت کا باعث بن سکتا ہے۔''

اس کے بعد میگی اور میں نے مل کر بے ہوش امریکی فوجی کو اس کے ساتھی کے ساتھ چٹان سے نیچے موجود گہری کھائی میں پھینک دیا۔ اس دوران میرے ذہن میں یہاں سے نکلنے کا منصوبہ تیار ہو چکا تھا۔ میگی اگر تھوڑی سی ہمت کرتی تو ہم بہت جلد یہاں سے نکل سکتے تھے مگر میں اپنے ساتھ موجود ان پانچ معصوم لڑکوں کو بھی یہاں سے لے جانا چاہتا تھا۔ اب پتہ نہیں وہ لوگ میرے ساتھ جانے پر تیار ہوتے یا نہیں مگر میں ایک کوشش ضرور کرنا چاہتا تھا۔

(آخری قسط آئندہ ماہ)

دوسرا عذاب

نبیلہ نازش راؤ

بیل سے ٹوٹے پھول اور گھر سے بھاگی لڑکی کا کوئی مقام نہیں ہوتا' پھول کو نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کسی کے سہرے میں سجے گا یا قبر پر چڑھے گا' اسی طرح وقتی جذبوں کا شکار ہونے والی لڑکیاں نہیں جانتیں کہ ان کا مستقبل کیا ہوگا۔

محبت کے نام پر اپنا وقار کھو دینے والی لڑکی کا احوال' وہ لمحہ لمحہ نفرت اور حقارت کی آگ میں جل رہی تھی۔

بیٹی کے پیدا ہونے پر لوگ روتے اور افسردہ ہوتے ہیں اور بیٹا پیدا ہونے پر خوشیاں مناتے' مٹھائیاں تقسیم کرتے ہیں۔ بیٹی کے مقدروں سے ڈر لگتا ہے یہی وجہ ہے کہ بیٹی کی پیدائش پر لوگ خوش نہیں ہوتے۔

شرم و حیا' عزت و عصمت رکھنے والی بیٹی والدین کے لیے فخر بن جاتی ہے جب کہ غیر چال چلن' بدچلن لڑکیاں والدین کو زندہ درگور کر دیتی ہیں اور ان کے لیے عذاب بن جاتی ہیں۔

بیٹی کو رحمت گھر کی زینت وزیور قرار دیا گیا ہے مگر آج کل جو حالات ہیں ان کی وجہ سے لوگ کہتے ہیں بیٹی رحمت نہیں زحمت زیادہ بن گئی ہے بلکہ دہرا عذاب بنی ہوئی ہے۔ پہلے بیٹی کی پرورش پڑھائی لکھائی اور ہنر سے آراستہ کرو پھر شادی کریں تو اپنی حیثیت کے مطابق بلکہ اپنی حیثیت سے بڑھ کر جہیز دیا جائے اور سسرال والوں کو وہ جہیز بھی جہیز نہیں لگتا اور ان کے مطالبات کے مطابق جہیز ہو یا پھر زندگی بھر والدین کی دہلیز پر بیٹھی بیٹھی انتظار کرے کون نیک انسان آئے اسے اپنے سنگ بیاہ کر لے جائے اور اسی امید پر بالوں میں چاندی اترتی دیکھ کر آس چھوڑ دیتی ہیں اور والدین کی دہلیز پر بیٹھے بیٹھے بوڑھی ہو جاتی ہیں۔

ہمارے معاشرے میں حوا کی بیٹی کو آج تک وہ مقام کبھی نہ مل سکا جو ہمارے دین نے دیا۔

یہ معاشرہ مردوں کا معاشرہ ہے عورتوں کے لیے اس میں جگہ ہے نہ کوئی مقام ہے مرد چاہے ریڈ ایریا میں کیوں نہ رات گزار کر گھر آ جائے اسے بڑے فخر سے کہا جائے گا' یہ مرد کی شان ہے اسے عزت و مقام وہی ملے گا جو اس کا پہلے ہوتا ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ وہ کہاں سے اور کیا کر کے آیا ہے۔

اگر عورت سے ذرا سی بھی بھول یا چوک ہو جائے تو اسے ذلیل وخوار کر دیا جاتا ہے' اسے نجانے کیسے کیسے الفاظ اور خطابوں سے نوازا جاتا ہے اس کی شان میں قصیدے پڑے جاتے ہیں۔ بے ہودہ الفاظ سے مخاطب کیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ماں کے قدموں تلے جنت دی تو بیٹی کو گھر کی زینت کہا گیا بیوی کو مرد کا لباس بنایا غرضیکہ ہمارے دین میں عورت کو بہت اعلیٰ عزت و مقام دیا مگر ہمارے معاشرے میں وہ عزت و مقام اور رتبہ عورت کو نہ ملا جو اس کا حق تھا اور اسے ملنا چاہیے تھا۔

عورت کا کوئی گھر نہیں والدین کے گھر رہے تو وہ بھائیوں کا گھر' شوہر کا گھر تو بیٹوں کا گھر اس کا گھر کون سا اور کہاں ہے یہ آج تک کوئی نہیں بتا سکا۔ بیٹا بیاہ کر لائے تو بہو کو اس گھر میں ایک

ٹوٹے جوتے سے بھی کم مقام دیا گیا' سسرال والے اسے جوتے کے برابر بھی اہمیت نہیں دیتے۔

جب چاہا جوتا پہن لو جب چاہو جوتا اتار کر پھینک دو یہ مقام ہے بہو کا سسرال والوں کی نظروں میں۔ بہو کو سسرال میں بیٹی کا مقام کبھی دیا نہ مل سکا' ساس نے اپنی بیٹی سمجھا نہ بہو نے ساس کو ماں کا درجہ دیا۔

ازل سے یہ روایت چلتی آئی اور چلتی رہے گی اور ساس بہو کے جھگڑے' نوک جھونک' نندوں کی لڑائی ایک فطری عمل ہے۔

اپنی بیٹی کو تو ماں چاہتی ہے اسے سسرال والے اور شوہر ہاتھ کا چھالہ بنا کر رکھیں اور اس کے جسم پر پھول کی چھڑی بھی نہ لگائیں' سسرال میں بیٹی کی حکمرانی ہو اور شوہر پر راج کرے لیکن اپنی بہو کو گائے بھینس کی طرح سمجھیں اور بری طرح قدموں میں روند ڈالیں۔ شوہر عزت احترام دے نہ قدر کرے۔ بیوی کا مقام ایک نوکرانی سے کم سمجھا جائے جس کی وجہ سے آپس میں نا چاقی پیدا ہوتی اور گھروں کا چین وسکون غارت ہو کر رہ گیا ہے' اگر مثبت اصول بنائے جائیں تو گھریلو حالات اور چین وسکون کبھی غارت نہیں ہوتے۔

عالیہ والدین کی دہلیز پار کرنے سے پہلے ہی اپنی عزت کو داؤ پر لگا چکی تھی۔ عالیہ اپنے ماموں زاد نوید سے محبت کرنے لگی یہ دونوں کزن تھے ان کے گھر کچھ فاصلے پر تھے اس لیے ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا معمول سے زیادہ رہتا' سب ایک دوسرے کے گھر آتے ایک جگہ اٹھتے بیٹھتے' کھاتے باہر ایک ساتھ آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی نہ ہی روک ٹوک اور شک وشبہات کی ذرا سی بھی گنجائش نہیں نکلتی تھی اسکول کالجوں میں بچے پڑھتے تھے۔

عالیہ سات بہنیں اور دو بھائی تھے بھائی چھوٹے اور بہن بڑی تھی۔ سب سے بڑی بہن بینک میں جاب کرتی تھی' چھوٹی بہن پولیس میں ملازم تھی' عالیہ تیسرے نمبر پر کالج جاتی تھی۔ نوید چار بہنیں اور تین بھائی تھے نوید سب سے بڑا تھا بہن بھائیوں میں پڑھتا کم آوارگی زیادہ کرتا اور عالیہ نوید کے چکر میں آ گئی اور اپنا سب کچھ گنوا بیٹھی۔

والدین کو بھی پتا نہ چل سکا ان کی بیٹی کیا گل کھلا چکی ہے۔

انہیں عقل تب آئی جب پانی سر سے اونچا ہو گیا۔

گھر میں ایک ہلچل اور طوفان برپا تھا نوید نے بھرے گھر میں کس طرح موقع تلاش کر کے عالیہ کو اپنے چنگل میں پھنسایا اس کی دوشیزگی سے کھیلا اور گھر میں کسی کو بھی علم نہ ہو سکا۔ پتا تب چلا جب عالیہ الٹیاں کرتی اپنے کارنامے کو چھپانے کوشش کر رہی تھی لیکن وہ زیادہ دن تک اپنے اس کارنامے کو نہ چھپا سکی۔ عالیہ کی ماں اسے ڈاکٹر کے ہاں لے گئی تو پتا چلا یہ تین ماہ کی حاملہ ہو چکی ہے اسے اپنی دنیا گھومتی اور سر چکراتا نظر آیا۔ عالیہ کی ماں نے اسے تھپڑوں' لاتوں سے مارنا شروع کر دیا۔

''بے غیرت یہ کیا کر دیا تو نے' شرم نہ آئی تجھے' باپ بھائی کی پگڑی رول دی' ان کی عزت کا خیال نہ اپنی بدنامی کا احساس ہوا تجھے' کس کے ساتھ منہ

کالا کروا کے آئی ہے تو بدذات بدبخت یہ کرنے سے پہلے مر کیوں نہ گئی تھی تو...... بتا یہ کس کا گناہ اٹھائے پھرتی ہے۔" عالیہ کو مجبوراً سب کچھ بتانا پڑا۔

عالیہ کی ماں (حمیدہ بیگم) حیران و پریشان سوچتی رہیں یہ سب کیسے ہوگیا' سب کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی تھیں کیا؟

انہیں خود پر بھی افسوس ہو رہا تھا بیٹیوں کے جوان ہوتے ہی مائیں اتنی گہری اور کڑی اور عقاب کی نظر رکھتی ہیں کہ چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی۔ بیٹیوں کی چال ڈھال' اٹھتے بیٹھتے' کھاتے' پیتے' سوتے یہاں تک کہ وہ ہر حرکت پر نظر رکھتی ہیں اور وہ ماں ہو کر عالیہ پر نظر کیوں نہ رکھ سکیں کہ وہ بیٹی کی چال ڈھال بدلتے رنگ بھی نہ پہچان سکیں۔ وقت ہاتھ سے نکل گیا اور سب کچھ لٹ چکا تھا۔

عالیہ کی اس حرکت سے دوسری بہنوں پر بھی اس کے کردار کا گہرا اثر پڑا اور اثر تو پڑنا تھا بلکہ پڑ چکا تھا۔

☆......☆......☆

حالات دن بہ دن بگڑتے چلے گئے تو ایک دن نوید رات کو عالیہ کو گھر سے بھگا کر اپنے دوست کے گھر لے گیا اور وہیں ان دونوں کا نکاح ہوا' دن اچھے برے گزرتے گئے۔ گاؤں میں بات پھیل گئی اور قصہ مشہور ہوگیا آخر کب تک اس گناہ کی پردہ پوشی ہوتی اور گھر سے عالیہ بھاگ گئی یہ خبر گاؤں میں پھیل چکی تھی۔

اس کے والدین زندہ درگور ہوگئے کسی کو منہ دکھانے نہ سر اٹھانے کے قابل رہے۔

نوید کے والد (جمیل احمد) نے سوچا جو ہوا سو

ہو گیا وہ واپس تو آ نہیں سکتا بہتر ہے مزید بدنامی سے بچنے کے لیے ان دونوں کو گھر واپس لانا چاہیے تھوڑی سی تگ ودو اور تلاش کے بعد بھانجی اور بیٹے کو گھر واپس لے آئے تاکہ تھوڑی بہت عزت بچ سکے تو وہ بچالیں۔ جمیل احمد بیٹے اور بھانجی کو گھر لا کر خود ایک سائیڈ ہو گئے گھر میں اس کے ساتھ کیا سلوک ہوتا انہیں اس کی کوئی پروا نہ تھی۔ ان کی بیوی' بیٹیاں کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتیں اسے ذلیل کرنے کا۔ عالیہ بے بسی سے اپنی غلطی کا خمیازہ بھگت رہی تھی۔

عالیہ کے ساتھ کیسا رویہ کیسا سلوک ہو رہا ہے یہ دیکھ کر بھی جمیل احمد آنکھیں اور کان بند کیے ہوئے تھے ان کا بیٹا جیسا تھا وہ سمجھ رہے تھے لیکن بھانجی نے جو کچھ کیا وہ شرمسار تھے کہ ان کے منہ پر مزید کالک عالیہ نے مل دی تھی۔

وہ چاہتے ہوئے بھی عالیہ کے لیے کچھ بھی نہ کر سکتے تھے انہیں عالیہ کا دکھ اور افسوس بھی ہوتا تھا کیونکہ آخر عالیہ ان کی بھانجی اور بہن کی بیٹی تھی اس واقعے کے بعد ان کی گھر میں چلتی نہ مانی جاتی تھی۔ گھر میں سیاہ سفید کی مالک ان کی بیگم حنیفہ تھی اور جمیل احمد گھر کے ہر معاملے سے لاتعلق ہو گئے تھے ان کی بھانجی جن حالات میں بہو بن کر آئی تھی وہ شرمندہ تھے اور خود کو بہت بے بس محسوس کرتے ان کے سامنے نازیبا الفاظ سے عالیہ کو نوازا جاتا' برا رویہ اور سلوک روا رکھا جاتا انہوں نے اپنی آنکھوں اور کانوں کو بند کیے رکھا۔ عالیہ کے حق میں بولتے نہ اسے سہارا دیتے ظاہر یہ کرتے اس کو گھر لا کر اس پر بہت بڑا احسان کر دیا ہو۔

جس حال میں وہ تھی اسے ٹینشن دینا مناسب نہیں تھا اس قدر اسے جلی کٹی سننا پڑتی وہ نوید کو امید بھری نگاہوں سے دیکھتی کہ عالیہ کے حق میں کچھ کہے گا تو وہ عالیہ کی آنکھوں میں بھرے پیام کو سمجھ کر خود کو بے بس ظاہر کرتا اس کے حق میں وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

عالیہ کی شکایت بھری آنکھیں دیکھ کر بھی انجان اور سنگ دل بن جاتا۔ نوید بھی بیوی کے حق میں بول سکتا نہ کچھ کر سکتا تھا۔ ماں بہنوں کے سامنے بے بس وہ عالیہ کو ہمدردی کے دو لفظ بول کے اس کی دل جوئی ہی کر دے لیکن وہ یہ بھی نہ کرتا۔ اسی طرح اس کی کچھ تکلیف اور ٹینشن دور کر دے' پیار سے ہی کچھ کہے اس کا دھیان بٹائے' سہارا بنے ''میں ہوں تم فکر مت کرو'' لیکن وہ تو بے حس بن چکا تھا' وہ تن تنہا سب سہہ رہی تھی۔

اس حال میں بھی عالیہ سے دن بھر کام لیا جاتا' گھر کا سارا کام بھاری ہو یا ہلکا سب وہی کرتی تھی' ایک پل چین نہ اسے فارغ بیٹھنے دیا جاتا۔ کھانا بنانا' کپڑے دھونا' لکڑیاں کاٹنا غرض کہ صبح سے شام سوتے وقت تک جتی رہتی پھر بھی سکون نہ لینے دیتے۔ شوہر سمیت ساس نند کوئی اسے یہ نہ کہتا ''آجاؤ کھانا کھالو' آرام کرلو'' کوئی یہ بھی نہ پوچھتا ''تم نے کچھ کھایا یا نہیں۔''

عالیہ سوچتی وہ ایک فالتو چیز اور کھلونا ہے جس کو گھر میں لا کر پھینک دیا گیا جس کی ضرورت نہ ہی قدر اور کوئی قیمت ہوتی ہے۔

عالیہ نوید سے شکایت کرنے کا حق بھی نہ رکھتی تھی جو اس کی تباہی کا ذمہ دار تھا وہ کولہو کے بیل کی طرح کام کاج میں لگی رہتی' رات کو چار پائی پر لیٹتی تو منہ سے ہائے ہائے نکلتی اور کراہتی رہتی۔ رات

بھر بھی نوید پوچھنے کی زحمت نہ کرتا کہ تم تھک گئی ہو یا تمہاری طبیعت خراب ہے۔ دن بھر کام کرنے کے بعد بھی اسے کام چور' کاہل سست نجانے اور کیا کیا کہا جاتا' وہ سنتی رہتی۔

اسی طرح گزرتے دن کے ساتھ وہ دن بھی آ گیا جب عالیہ ماں بن گئی۔ بیٹی کی پیدائش پر خوش تھی تو افسردہ بھی کہ اب اس ننھی سی معصوم جان کو بھی نہ بخشا جائے گا' اسے بھی سب سہنا اور سننا ہوگا جو کچھ میں سنتی آ رہی ہوں۔ اسے کہا جائے گا ''اے حرام کی بچی! بھاگی ہوئی ماں کی بھاگی بیٹی! تُو بھی ماں کی طرح چار چاند لگائے گی' باپ دادا کی پگڑی اچھالے گی اور مٹی میں رولے گی' خاندان کی ناک کٹوائے گی۔'' ایسے طعنوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

نوید اور عالیہ کے گناہوں کی سزا بے قصور معصوم بچی کو مل رہی تھی سارا قصور سسرال والوں نے عالیہ کے سر منڈ دیا' نوید کو پاک دامن اور پارسا قرار دے کر بے قصور ٹھہرا دیا۔

وہ سوچ رہی تھی ہم لڑکیاں کیا ہیں جو کچی عمر میں اپنی زندگیاں داؤ پر لگا دیتی ہیں' اپنی عزت و عصمت جس کی خاطر داؤ پر لگاتے ہیں وہ بھی ہمیں بے یار و مددگار چھوڑ دیتے ہیں' سب کچھ برداشت کرنے سہنے کو اکیلا چھوڑ جاتے ہیں۔ عالیہ بے ساختہ کہہ اٹھتی ہے۔

خدایا! یہ ہم لڑکیاں
کچی عمروں سے ہی خواب کیوں
دیکھنا چاہتی ہیں
آنکھوں میں آنسو ٹھہراتی بے قیمت
کھلونا کیوں بن جاتی ہیں

عالیہ اور نوید کے کرتوتوں کی سزا انہیں ہی نہیں بلکہ ان کے والدین بہن بھائیوں کو بھی مل رہی تھی' انہیں لوگ عزت بھری نگاہ سے نہیں دیکھتے اور انہیں دیکھتے ہی منہ موڑ لیتے ہیں۔

حنیفہ عالیہ کی ممانی کہتی ''کمینی نے دونوں خاندان کو رسوا کر دیا' دو آنے کی عزت نہ چھوڑی۔ لوگوں کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے' بے غیرت نے میرا بیٹا بھی ورغلایا' ہماری عزت دو کوڑی کی کر دی پلے کچھ نہ چھوڑا بے حیا نے۔''

''والدین کا خیال کیا نہ احساس' بے ضمیر انہیں بھی زندہ درگور کر آئی اپنی عزت اور بدنامی کا احساس تو نہ تھا' اپنے ماموں کی عزت کا ہی کم از کم خیال کر لیتی' ڈائن کہیں کی۔'' عالیہ ہر روز مرتی ہر روز جیتی تھی طعنے تشنوں میں زہر بھری زندگی گزار رہی تھی اس نے سوچا اپنی عزت وآبرو' والدین کی عزت داؤ پر لگا کے اسے کیا ملا سوائے ذلت و رسوائی خواری اور بدنامی کے داغ کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔

عالیہ کا دن بھر وہی روٹین کے مطابق کام کاج کرنا جب تک گھر کا کام ختم نہ ہو جائے وہ بیٹی کو گود میں لے سکتی نہ دودھ پلا سکتی تھی بیٹی روتی تو وہ تڑپ اٹھتی' اسے گود میں لینے کو بھاگتی تو ساس کہتی۔

''اسے رہنے دے' کام کر' تیرے ساتھ تیرے باپ نے نوکرانی نہیں دی جہیز میں جو تیری جگہ کام کرے تاکہ تو مہارانی آرام کرے جو لڑکیاں گھر سے بھاگتی ہیں' والدین کی عزت پاؤں تلے روند کر آتی ہیں والدین کی دہلیز پار کرتے وقت ایسی لڑکیاں کچھ نہیں سوچتیں' سسرال والے ان کو عزت و مقام گھر کے ایک نوکر کے برابر بھی نہیں دیتے ہیں' پھر یہ لڑکیاں زندگی بھر پچھتاتی ہیں۔''

سسرال میں عالیہ کو جہیز نہ لانے کے طعنے ملتے۔ ''کیا لائی ہے' کبھی یہ نہ سوچا ایک بھاگی ہوئی لڑکی جہیز کیسے اپنے ہمراہ لائے گی۔ ماموں کا گھر تھا ممانی ساس تھی یہ رشتے بھی بدل کر صرف سسرال رشتے بن گئے اور وہ رشتے جو کبھی اپنے تھے پرائے ہو گئے۔'' ایک غلطی کی کتنی بڑی سزا بن گئی اور تیر وطنز زہر سے بھرے زہریلے ناگ بن گئے جو اُسے ہر خود ڈستے رہتے ہیں۔ عالیہ سوچتی میرے جیسی لڑکیاں عزت نیلام کر دیتی ہیں خود اپنے دوپٹے کو کھینچ کر اپنا سر ننگا کر لیتیں اور والدین کو کہیں کا نہیں چھوڑتیں' ان کا سسرال میں یہی انجام ہوتا ہے جو خواب وہ دیکھ کر آتی ہیں وہ خواب لمحے بھر میں ٹوٹ کر چکنا چور ہو جاتے ہیں۔ قدم قدم پر زہر کا بھرا پیالہ پینا پڑتا ہے اور پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیں تو بھی پوری زندگی سسرال میں عزت و وقار بلند مقام حاصل نہیں کر سکتیں جو ایک بہو کبھی سسرال میں وہ مقام پاتی ہے۔ عالیہ وہ بھی نہ کر سکی ہر قدم پر نئے عذاب سے گزر رہی ہے اور نجانے کب تک دہرے عذاب سے گزرتی رہے گی۔

بھٹکی ہوئی روح

شہنی ارشاد

زندگی میں کچھ واقعات ایسے بھی پیش آتے ہیں جنہیں عام آدمی کی عقل تسلیم نہیں کرتی لیکن وہ حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں۔ جس دور میں میرے ساتھ یہ سب کچھ ہوا' اس وقت میں ایک رنگین مزاج بھٹکا ہوا نوجوان ہی تھا شاید آئندہ بھی ایسا ہی رہتا لیکن ایک مظلوم لڑکی کی بھٹکی ہوئی روح نے میری اصلاح کر دی۔ میں نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں یہ واقعہ شہنی ارشاد کو سنایا کہ وہ اسے کہانی کی شکل میں عام لوگوں تک پہنچا دے کہ شاید کسی کی اصلاح ہو جائے۔

یہ آج سے دس سال قبل کا ذکر ہے ان دنوں میں فارغ ہی تھا۔ غم روزگار کی کوئی فکر نہیں تھی' پرکھوں کی زمینیں تھیں' بہت سے ہاری کام کرتے تھے اور ہم بیٹھ کر کھاتے تھے۔ زمینوں کی دیکھ بھال کا کام اباجی اور مجھ سے بڑے دونوں بھائی کیا کرتے تھے میں چوں کہ اماں کا لاڈلا تھا اس لیے موج میلے میں مصروف رہتا تھا' پارٹی' دوستیاں نبھائی جا رہی تھیں۔

میں نے شہر جا کر اپنا گریجویشن مکمل کیا ان دنوں طبیعت پر عجیب بے زاری چھائی ہوئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں' ایک دن دوستوں کے ساتھ گپ شپ لگاتے ہوئے ارواح کا ذکر چھڑ گیا میں نے ترنگ میں آ کر کہا کہ میں ان چیزوں کو نہیں مانتا۔ سب بکواس باتیں ہیں' لوگوں نے یوں ہی اڑائی ہوئی ہیں۔ میری بات سن کر خالد بولا۔

''بچو! اگر کبھی کسی روح سے واسطہ پڑ گیا ناں تو نانی اماں یاد آ جائیں گی۔''

میں نے بھی کہہ دیا کہ ''ہاں ہاں آ جائے کوئی روح ہم بھی دیکھ لیں گے۔''

پھر دوست بہت سے قصے سناتے رہے اور میں ان کا مذاق اڑاتا رہا پھر سب نے مجھے چیلنج کر دیا کہ اگر میں اتنا ہی بہادر ہوں تو قبرستان میں ایک رات تنہا گزار کر دکھاؤ۔ ہمارے گاؤں میں ایک بہت پرانا قبرستان تھا اور اس کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ اس میں موجود نیم کے ایک پرانے درخت پر آسیب کا سایہ ہے' بہت سے لوگوں کے ساتھ وہاں عجیب و غریب واقعات پیش آتے تھے۔ پتا نہیں وہ لوگ سچ بول رہے تھے یا جھوٹ' لوگ رات تو رات وہاں دن میں بھی نہیں جاتے تھے۔

دوستوں نے یہ شرط لگائی کہ تم رات بھر اس نیم کے درخت کے نیچے بیٹھ کر گزارو گے' میں نے ان کا یہ چیلنج قبول کر لیا اور اگلی رات قبرستان چلا گیا۔ حویلی میں کسی کو نہیں بتایا کہ میں کہاں جا رہا ہوں ورنہ اماں جان تو مجھے قطعی جانے نہ دیتیں۔

میرے تینوں دوست قبرستان کے باہر موجود تھے اور میں رات بھر نیم کے درخت کے نیچے گزار کر بخیریت آ گیا۔ مجھے نہ تو وہاں کوئی نظر آیا اور نہ ہی کوئی اور بات ہوئی بس آنکھیں بند کر کے کلمہ اور درود شریف پڑھتا رہا۔ ویسے سچی بات تو یہ ہے کہ جب رات کے پر ہول سناٹے میں ہوا سے درخت کی شاخیں ہلتیں تو عجیب سے خوف کا احساس ہوتا لیکن میں اپنے آپ کو مسلسل سمجھاتا اور تسلی دیتا رہا کہ کچھ نہیں ہے۔ وہ رات خاصی طویل محسوس ہوئی' اللہ اللہ کر کے فجر کی اذانیں سنائی دیں تو میں باہر آ گیا۔ میرے دوست میری بہادری کے قائل ہو گئے اور

بات آئی گئی ہوگئی اور میں اپنا دل بہلانے کے لیے میڈم روزی کے پاس چلا گیا۔

یہ بات تقریباً ایک ماہ بعد کی ہے جب خالد میرے پاس آیا اور اس نے کہا۔

''یار طفیل! میں تیرے پاس ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔''

''بول یار! دوستوں کے لیے تو جان بھی حاضر ہے۔'' میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''کیا بتاؤں یار ایک عجیب سی پریشانی نے آن گھیرا ہے۔'' اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''تُو مسئلہ تو بول......؟'' میں نے محبت بھرے انداز میں اس کے کندھے پر اپنے ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔

''پتا نہیں یار تو میری بات کا یقین بھی کرے گا یا اسے مذاق میں ٹال دے گا لیکن میری بات مذاق نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے اور اسی وجہ سے اپنی اس پریشانی کو میں تیرے پاس لے کر آیا ہوں کہ میری اس پریشانی کو صرف تُو ہی دور کر سکتا ہے' تیرے علاوہ مجھے اور کوئی دکھائی بھی نہیں دے رہا۔'' اس نے لمبی چوڑی تمہید باندھی تو میں زچ ہو گیا اور قدرے جھنجلا کر کہا۔

''یار تو کچھ بتائے گا بھی یا پہیلیاں ہی بوجھتا رہے گا۔'' تو وہ بولا۔

''تُو تو جانتا ہے کہ ابا جی کا ایک فارم ہاؤس ہے اور وہاں گائے' بھینس' بکریوں کے علاوہ مرغیاں بھی ہیں اور ہمارا گزارہ بھی اسی فارم ہاؤس کی آمدنی سے ہوتا ہے وہاں پر کئی ملازم کام کرتے ہیں لیکن اب وہاں ایک عجیب صورت حال پیدا ہو گئی ہے' وہاں کے ملازم ایک ایک کر کے کام چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ وہ سب بے حد خوف زدہ ہیں' ان کا کہنا ہے کہ اس فارم ہاؤس میں اثرات ہیں' وہاں غیر مرئی مخلوق کا قبضہ ہے عموماً رات کو وہاں کسی جوان لڑکی کا ہیولہ گھومتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ کبھی راتوں میں وہ بے قراری کے عالم میں گھومتی ہے اور روتی ہے۔ کئی دفعہ وہ ان آدمیوں کو دکھائی دی ہے پھر ان ہی کی آنکھوں کے سامنے سے غائب بھی ہو جاتی ہے۔'' خالد خاموش ہوا تو میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''انٹرسٹنگ! واقعی وہاں کوئی جوان لڑکی موجود ہے۔'' میں ہنس رہا تھا تو وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

''یار تُو اس بات کو مذاق سمجھ رہا ہے لیکن یہ حقیقت ہے دراصل میں نے بھی اس لڑکی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور سب سے بڑی حیرت اور خوف کی بات یہ ہے کہ وہ اچانک آنکھوں کے سامنے سے غائب ہو جاتی ہے۔''

''ایک اور آزمائش...... میں سب سمجھ رہا ہوں تم لوگ ایک بار پھر مجھے آزمانا چاہتے ہو۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''یار طفیل تو بھی عجیب انسان ہے' میں انتہائی پریشان ہوں اور سنجیدہ ہوں اور تُو میری بات کو مذاق سمجھ رہا ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ جب یہ سارا معاملہ میرے سامنے آیا تو میرے ذہن میں تیرا ہی خیال آیا کہ تُو واقعی ایک جی دار بندہ ہے' تجھے ڈر وغیرہ بالکل نہیں لگتا۔ یار سارے ملازمین چلے گئے ہیں' جانوروں کی دیکھ بھال کرنے کے لیے کوئی بھی نہیں ہے اگر ایسا ہی رہا تو ہمارا تو کاروبار تباہ ہو جائے گا۔ جانور مر جائیں گے۔'' خالد نے روہانسے لہجے میں کہا تو میں بھی سنجیدہ ہو گیا اور کہا۔

''اچھا اگر یہ بات ہے تو تجھے بھی میرے ساتھ فارم ہاؤس میں چلنا ہوگا' اکیلے تو میں بور ہو جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔'' اس نے فوری کہا۔

''اچھا تو پھر آج رات ہی چلتے ہیں۔'' وہ بولا۔

"ٹھیک ہے لیکن یہ بتا کیا وہاں ایک بندہ بھی نہیں ہے یار کھانے پینے کا بندوبست کیسے ہوگا؟"
میں نے آمادگی ظاہر کی اور پوچھا۔

"اس کی تو فکر نہ کر' میں اپنے ایک ملازم کو ساتھ لے لوں گا۔ ہم لوگ ساتھ ہوں گے تو وہ بھی تیار ہو جائے جانے کے لیے۔"

پھر میں نے اپنی ضرورت کی کچھ اشیاء اور ایک دو جوڑے ایک بیگ میں ڈالے اور خالد کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

پہلے ہم خالد کے گھر گئے وہاں سے اس کے ملازم اور کھانے پینے کا سامان ساتھ لیا اور فارم ہاؤس کی جانب روانہ ہو گئے۔

وہ دسمبر کی ٹھنڈی یخ رات تھی' مجھے سردیوں کا موسم اور ٹھنڈی ہوا ہمیشہ سے اچھی لگتی ہے۔ میرے حساب سے موسم بہت شاندار تھا یہاں دو کمروں میں ہم نے رات گزارنے کا انتظام کیا۔ خالد کے ساتھ اس کا ملازم بھی تھا جب کہ میں نے کمرے میں تنہا رکنے کا فیصلہ کیا حالاں کہ خالد کا یہ کہنا تھا کہ ہم تینوں ایک ہی کمرے میں ٹھہر جاتے ہیں لیکن میں نے منع کر دیا اور کہا کہ ہو سکتا ہے کہ مجھے تنہا دیکھ کر وہ لڑکی مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کرے۔

رات کے کھانے سے فارغ ہو کر ہم نے کچھ دیر گپ شپ کی پھر سونے کے ارادے سے میں اپنے کمرے میں آ گیا پھر کچھ دیر کے بعد میں تنہا ہی فارم ہاؤس کا گشت لگانے نکل کھڑا ہوا۔ میں نے گرم چادر کی بکل ماری اور ہاتھ میں ٹارچ سنبھال لی۔ میں کافی دیر تک گھومتا رہا لیکن مجھے کوئی لڑکی دکھائی نہیں دی اور نہ ہی کسی کے رونے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ اس سے مایوس ہو کر میں نے اپنے کمرے کی جانب واپسی کے لیے قدم بڑھا دیے۔ رات سونے سے قبل میری ہمیشہ سے یہ عادت رہی ہے کہ میں کسی نہ کسی کتاب کا مطالعہ ضرور کرتا ہوں۔

اس رات چاند اپنے پورے جوبن پر تھا' چاندنی زمین پر پھیلی ہوئی تھی۔ روشنی اتنی اچھی اور تیز تھی کہ لائٹ جلائے بنا بھی ہم کتاب پڑھ سکتے تھے لیکن سردی کی وجہ سے مجھے کھڑکی بند کرنی پڑی تو چاند کی روشنی اندر آنی بند ہو گئی۔ میں نے بیگ سے کتاب نکالی اور سرہانے رکھا ہوا ٹیبل لیمپ روشن کر لیا اور لیٹ کر مطالعہ میں مشغول ہو گیا' تقریباً نو دس منٹ کے بعد مجھے کمرے میں کسی کی موجودگی کا واضح احساس ہوا۔

میں چونک گیا اور کتاب بند کر دی پھر اٹھ کر بیٹھ گیا اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا لیکن مجھے کوئی دکھائی نہیں دیا۔ میں نے اس احساس کو اپنا وہم قرار دیا اور دوبارہ لیٹ کر کتاب پڑھنے لگا۔ لیمپ کی روشنی کتاب پر پڑ رہی تھی باقی پورے کمرے میں بہت مدھم اجالا تھا۔

پڑھتے پڑھتے اچانک میری نگاہ کمرے کے وسط میں پہنچی اور مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میرے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا' کھڑکیاں بند تھیں پھر یہ کون ہے اور کہاں سے آئی؟

میں نے کمرے میں ایک نوجوان لڑکی کو کھڑے ہوئے دیکھا' میں بے ساختہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس پر نگاہ جما دی اور پھر...... اور پھر وہ میری آنکھوں کے سامنے سے غائب ہو گئی۔ میں بوکھلا کر کمرے میں چاروں جانب دیکھنے لگا لیکن وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دی اور پھر اچانک میرے کانوں میں کسی کی تیز سسکیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی کمرے کے کونے میں وہ مجھے فرش پر بیٹھی دکھائی دی اس نے اپنا سر گھٹنوں میں دے رکھا تھا اور وہ سسکیاں لے رہی تھی۔

''اے..... کون ہو تم.......؟'' میں نے تیز آواز میں پوچھا اور میرے سوال کے ساتھ ہی وہ میری آنکھوں کے سامنے سے غائب ہوگئی۔

پھر بقیہ رات میں نے سوتے جاگتے ہوئے گزاری اور وہ مجھے دکھائی نہیں دی، فجر کی اذانوں کے ساتھ ہی کسی نے میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دستک سن کر میں نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ سامنے خالد کھڑا تھا شب بیداری کے باعث اس کی آنکھیں متورم اور سرخ ہورہی تھیں۔

''کیا ہوا؟'' میں نے اس کے چہرے پر پریشانی دیکھی تو پوچھا۔

''مجھے چھوڑو تم سناؤ، رات خیریت سے تو گزاری، یار مجھے تو ساری رات نیند ہی نہیں آئی۔'' وہ کمرے کے اندر آتے ہوئے بولا۔

''ہاں خیریت ہی رہی لیکن تمہارے اس فارم ہاؤس کی نئی مہمان سے رات ملاقات بھی ہوگئی۔'' میں نے اس کے قریب بیڈ پر بیٹھتے ہوئے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا.....؟'' اس نے قدرے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ ''کیا وہ لڑکی تمہیں دکھائی دی تھی؟''

''ہاں۔'' میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''کہاں؟'' وہ بے ساختہ اور تیزی سے بولا۔

''یہیں اسی کمرے میں۔'' میں نے مزے سے ٹانگیں اوپر چڑھاتے ہوئے تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

''پھر..... اس نے کوئی بات کی تم سے، کیا کہہ رہی تھی، دیکھنے میں کیسی ہے؟'' خالد نے ایک ہی سانس میں کئی سوالات کر ڈالے۔

''نہیں، اس نے مجھ سے کوئی بات تو نہیں کی بس وہ اس کونے میں گھٹنوں میں سر دیئے سسکیاں لے رہی تھی پھر غائب ہوگئی۔'' میں نے اسے ساری بات تفصیل سے بتادی۔

''یار اس بلا سے چھٹکارہ کیسے حاصل کیا جائے، کتنا خوف و ہراس پھیلایا ہوا ہے اس نے۔'' خالد نے بے چارگی سے کہا۔

''چھوڑو یار وہ کسی کو کیا کہہ رہی ہے بلکہ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے وہ کوئی بہت ہی مظلوم لڑکی ہے ورنہ وہ اس طرح روتی کیوں اور تم ہی نے بتایا ہے کہ تمہارے ملازمین نے بھی اسے روتے ہوئے دیکھا اور سنا ہے۔'' میں نے بے پروا لہجے میں کہا۔

''کیا کہہ رہے ہو بھائی! یہی تو ساری مصیبت ہے ملازمین اس سے خوف زدہ ہیں اور کوئی بھی اس فارم ہاؤس میں واپس آنے کو تیار نہیں ہے۔ ان کا یہی کہنا ہے کہ پہلے اسے اس فارم ہاؤس سے باہر نکالیں۔'' خالد نے گھبرا کر کہا۔

''پھر تو تم نے مجھے بے کار ہی بلایا یہ کام تو کوئی عالم دین ہی کرسکتے ہیں۔ میں اسے یہاں سے کیسے بھگاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

''کہہ تو تم ٹھیک ہی رہے ہو خیر دیکھو اب یہ کام بھی کرنا پڑے گا۔ آج کا دن تو میں جانوروں کو دیکھوں گا، کل واپس چلتے ہیں ابا سے بھی بات کروں گا۔'' خالد نے سر کھجاتے ہوئے کہا پھر بولا۔ ''چل یار نماز پڑھتے ہیں۔''

''یار تُو جا کے پڑھ لے۔'' میں نے ڈھٹائی سے کہا۔

''کیوں، میں کیوں اکیلے پڑھوں کیا تُو مسلمان نہیں ہے کبھی تو اللہ کا خوف کھالیا کر۔'' خالد نے ملامت زدہ لہجے میں کہا تو میں شرمندہ ہوکر نماز کے لیے کھڑا ہوگیا۔

پھر سارا دن کوئی اہم واقعہ نہیں ہوا میں خالد کے

ساتھ رہا وہ لڑکی سارا دن دکھائی نہیں دی' خالد رات تک مصروف رہا پھر تھک کر لیٹ گیا اور بولا۔

"یار بہت زیادہ تھک گیا ہوں' کل صبح چلیں گے۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔" میں نے کندھے اچکائے۔

یہ اس رات کا واقعہ ہے کل صبح واپس جانا تھا خالد جلد ہی سو گیا لیکن حسب معمول میں اپنے کمرے میں آ کر کتاب کا مطالعہ کرنے لگا میرے ذہن کے کسی گوشے میں اس لڑکی کا خیال تھا اور میں بار بار کتاب سے نگاہ ہٹا کر کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا لیکن وہ نہیں آئی حد یہ کہ نیند سے میری پلکیں بوجھل ہونے لگیں تو میں نے مدھم روشنی کا نیلگوں نائٹ بلب آن کر کے ٹیبل لیمپ آف کر دیا اور سونے لیٹ گیا۔ ابھی میری نیند پکی بھی نہیں ہوئی تھی کہ مجھے دبی دبی سسکیاں سنائی دینے لگیں میں فوری طور پر بیدار ہو گیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا اور کمرے میں نگاہیں دوڑانے لگا لیکن وہ مجھے دکھائی نہیں دی البتہ اس کی سسکیاں مسلسل مجھے سنائی دے رہی تھیں۔

"اے پیاری لڑکی! تم کہاں ہو' سامنے کیوں نہیں آ رہیں پلیز سامنے آؤ اور مجھ سے بات کرو تمہیں آخر کیا دکھ ہے جو تمہیں اس طرح رلا رہا ہے؟" میں نے دھیمی آواز میں اسے پکارا تو وہ میری آنکھوں کے سامنے ظاہر ہو گئی اور فوری طور پر مجھے اپنے بہت نزدیک بیڈ پر بیٹھی دکھائی دی اس کو اپنے اتنے قریب دیکھ کر میں فطری طور پر تیزی سے پیچھے ہٹ گیا اور دوسرے ہی لمحے وہ ایک بار پھر میری آنکھوں کے سامنے سے غائب ہو گئی۔

"کیا تم اس کمرے میں موجود ہو؟ اچھی لڑکی! تم کہاں ہو سامنے آؤ؟" میں نے ایک بار پھر اسے پکارا تو وہ پھر ظاہر ہو گئی اس مرتبہ پھر وہ اسی کونے میں گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی رو رہی تھی۔

"تم کون ہو اور تمہارا نام کیا ہے؟ تم اپنا دکھ مجھے بتاؤ ہو سکتا ہے کہ میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔" میں نے بہت ہمت کر کے اس سے کہا تو اس نے آنسوؤں سے لبریز اپنا چہرہ اوپر اٹھایا اور پھر غائب ہو گئی۔

"لو بھئی یہ پھر غائب ہو گئی۔" میں نے خود سے کہا پھر اسے مخاطب کیا۔ "اگر تم اپنے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتیں تو یہاں سے چلی جاؤ۔ تمہاری وجہ سے میرے دوست کو بہت پریشانی ہے۔"

وہ ایک بار پھر میری آنکھوں کے سامنے تھی اس مرتبہ وہ سامنے پڑی کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کا رنگ گورا' بڑی براؤن کلر کی آنکھیں اور براؤن بال تھے جو اس کے شانوں پر پڑے تھے اس نے نیلے رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ حسین چہرہ بہت ستا ہوا اور افسردہ تھا میں یک ٹک اسے دیکھنے لگا تو وہ بولی۔

"میں یاسمین ہوں' یہ کمرہ جس میں تم ہو یہ کبھی میرا ہوا کرتا تھا۔" اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"تم...... تم...... تمہارا مطلب یہ ہے کہ تم کسی یاسمین کی روح ہو۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں...... مجھے مرے ہوئے بیس سال ہو چکے ہیں۔" وہ بولی۔

"لیکن اس فارم ہاؤس میں کیوں بھٹک رہی ہو اور روتی کیوں رہتی ہو کیا کسی نے تمہارے ساتھ ظلم کیا ہے۔ کیا تم اپنی طبعی موت مری تھیں۔" میں نے کپکپاتے ہوئے لہجے میں پوچھا تو اس نے زور زور سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"پھر......؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"میرے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے۔" اس نے کہا اور پھر سسکیاں لے کر رونے لگی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ میری آنکھوں کے سامنے سے غائب ہو گئی۔

"یاسمین...... یاسمین...... کیا تم یہاں موجود ہو؟"

میں نے اسے آوازیں دیں۔ کمرے میں چاروں جانب دیکھا تب وہ ایک بار پھر مجھے کمرے کے کونے میں پرانے انداز میں بیٹھی دکھائی دی۔

"کیا ہوا تھا تمہارے ساتھ؟" میں نے بیڈ سے اتر کر کھڑے ہو کر پوچھا تو اس نے اپنا آنسوؤں سے تر چہرا اٹھایا پھر غائب ہو گئی۔

وہ ایک بے چین و بے قرار روح تھی۔ بار بار مجھے دکھائی دیتی اور پھر غائب ہو جاتی وہ مجھے مختلف قسم کے لباس میں دکھائی دیتی۔ میں کمرے میں وسط میں چپ چاپ کھڑا اس کے بارے میں سوچ رہا تھا تب وہ ایک بار پھر مجھے کرسی پر بیٹھی ہوئی دکھائی دی۔

"تم بار بار کیوں غائب ہو جاتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"اس لیے کہ میرا ٹھوس وجود نہیں ہے اور کسی کو دکھائی دینا یا نہ دینا میرے اختیار میں نہیں ہے۔ پتا نہیں میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے میری روح کو قرار و سکون نہیں ہے۔ میں ایک مسلمان لڑکی ہوں لیکن بعد از موت نہ مجھے غسل دیا گیا اور نہ ہی نماز جنازہ پڑھی گئی کیا تم میری مدد کرو گی۔ میرے اوپر احسان کرو گے تا کہ میں سکون حاصل کر سکوں۔" اس نے پوچھا۔

"یقیناً میں تمہاری مدد کروں گا لیکن پہلے تم مجھے یہ تو بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا ظلم ہوا ہے اور کس نے یہ ظلم کیا ہے۔" میں نے کہا۔

"اچھا......" اس نے جیسے ایک گہری اور ٹھنڈی سانس لی یا مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے سانس لی ہے یا پھر ایک آہ بھری ہوگی۔ اس نے اپنے بارے میں بتانا شروع کیا۔

"ہم دو بہنیں تھیں اپنے والدین کی شفقت کے سائے میں پرورش پا رہی تھیں۔ ایک دن ہم دونوں بہنوں کو گھر میں چھوڑ کر ہمارے والدین کہیں گئے تھے وہ واپس آ رہے تھے تو ان کی کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور وہ موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے۔

ان کے انتقال کے بعد ہم دونوں بہنیں تنہا رہ گئیں تو میری خالہ اور خالو ہمیں اپنے ہمراہ لے کر اس جگہ آ گئے یہ فارم ہاؤس میرے خالہ خالو کا تھا وہ لوگ یہیں رہتے تھے۔ میں اسی کمرے میں رہتی تھی اس وقت میری عمر سولہ سال تھی اور میری چھوٹی بہن کی عمر آٹھ سال کی تھی۔

خالہ کی کوئی اولاد نہیں تھی وہ ہم بہنوں کو بے حد چاہتی تھیں، بالکل مما کی طرح ہمیں پیار کرتی تھیں لیکن خالو......" وہ اتنا کہہ کر رک گئی تھوڑی دیر بعد دوبارہ گویا ہوئی۔

"خالو کی نیت مجھ پر ٹھیک نہیں تھی ایک دن خالہ شازمین کو ڈاکٹر کے لے کر گئی ہوئی تھیں اسے بخار آ رہا تھا میں خالو کے ساتھ تنہا تھیں۔ تب خالو...... انسان سے وحشی درندے بن گئے ان پر میری فریادوں اور آہ و فغاں کا کوئی اثر نہیں ہوا اور میرے رونے پر میرے منہ پر ایک زور کا تھپڑ مار کر غرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اگر کسی کو یہ بات بتائی تو گلا دبا کر اسی کمرے میں دفن کر دوں گا۔"

میں کم عمر تھی ڈری ہوئی اور سہمی ہوئی، ماں باپ کی موت کے غم سے ابھی تک باہر نہیں نکلی تھی۔ میں خاموش رہی تو خالو کو مزید شہہ مل گئی وہ بار بار انسان سے وحشی بن جاتا۔ اس کے بار بار کے ظلم کے نتیجے میں ایک صبح الٹیاں کرتے ہوئے بیدار ہوئی مجھے بہت تیز بخار ا ہو رہا تھا، خالو آیا تو میں نے اسے بتایا۔ میں بہت ڈری ہوئی اور سہمی ہوئی تھی اس نے مجھ سے کہا کہ میں خالہ سے کوئی بات نہ کروں وہ اس کا کوئی حل نکال لے گا اور اس کا اس نے یہ حل نکالا کہ

ایک رات اس نے میرا گلا دبا کر مجھے مار ڈالا۔ خالہ کو اس نے شازمین کے ساتھ بازار بھیج دیا اور مجھے فارم ہاؤس کے اس پچھلے حصے میں دفن کردیا۔

خالہ جب گھر پر آئیں تو مجھے موجود نہ پاکر خالو سے میری بابت دریافت کیا تو اس نے کہا میں کسی لڑکے کے ساتھ فرار ہوگئی ہوں جس سے میرا پرانا معاشقہ چل رہا تھا جو لڑکا مجھے لینے کے لیے آیا تھا اس نے خالو کو پستول دکھا کر خاموش رہنے پر مجبور کردیا تھا۔

خالہ رو پیٹ کر خاموش ہوگئیں پھر چند سالوں کے بعد جب شازمین بارہ سال کی ہوئی تو خالو نے اس کے ساتھ بھی یہی ظلم دہرایا اور بعد میں اسے بھی مار کر اسی فارم ہاؤس میں دفن کردیا۔ اس دن کے بعد سے میری روح اسی فارم ہاؤس میں بھٹک رہی ہے پہلے میں کسی کو دکھائی نہیں دیتی تھی لیکن اب اللہ جانے کیسے میں لوگوں کو دکھائی دے جاتی ہوں۔"

اپنی کہانی سنانے کے بعد یاسمین کی روح غائب ہوگئی اور پھر دوبارہ مجھے دکھائی نہیں دی' مجھے اس مظلوم لڑکی کی کہانی سن کر بے حد افسوس ہوا اور میرا دل غمگین ہوگیا۔ میں ساری رات نہیں سو سکا اور اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔

صبح ہوئی تو میں خود چل کر خالد کے کمرے میں پہنچا وہ بھی بیدار ہوچکا تھا' مجھے دیکھ کر بولا۔

"آج پھر آئی تھی وہ......؟"

"ہوں......" میں نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"کیا بات ہے طفیل! خیریت تو ہے تیرے چہرے پر یہ گہری سنجیدگی اور خاموشی...... کیا معاملہ ہے؟"

"تو پہلے یہ بتا کہ یہ فارم ہاؤس تم نے کس سے خریدا تھا۔" میں نے پوچھا۔

"بس یار یہ بھی اتفاقاً ہمیں کم قیمت پر مل گیا' اس فارم ہاؤس کے مالک کو ایک پاگل کتے نے کاٹ لیا

اقوال آزاد

☆ تم دراصل ویسے ہی ہو جیسے تمہیں تمہارے ہمسائے بتاتے ہیں۔

☆ کسی ملک کی ترقی کی رکاوٹ اس ملک کی عوام میں اجتماعی قوت کا فقدان ہے۔

☆ میرے نزدیک اچھے دوست کا وصال محبوب کے وصال (وصال) سے زیادہ راحت بخش ہے۔

☆ دوست وہ ہے جو اس وقت تمہارا ساتھ دے جب تم خود سے بھی خود سے متنفر ہونے لگو۔

☆ انا پرستی بذات خود اچھی چیز ہے اگر مغروری کی حد تک نہ ہو تو۔

☆ برے دوست "جوکنگ مرر" کی طرح ہوتے ہیں جو شکل بگاڑ کر پیش کرتا ہے۔

☆ اور اچھے دوست نظر کی عینک کی طرح ہوتے ہیں کہ دھند اور جالے تک میں صاف صاف دکھائی دیتا ہے۔

تھا اور وہ بھی کتے کی مانند بھونک بھونک مرگیا۔ اس کی کوئی اولاد نہیں تھی صرف ایک بیوہ تھی' وہ بھی بیمار تھی اونے پونے دام پر فارم ہاؤس ہمارے ہاتھوں بیچ کر نجانے کہاں چلی گئی ویسے تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو۔" اس نے ساری بات بتانے کے بعد پوچھا تو میں نے یاسمین کی ساری کہانی اسے سنادی۔

"اوہو واقعی یہ تو بہت برا ہوا اس لڑکی کے ساتھ اور فارم ہاؤس کا ملک وہی بدبخت شخص ہوگا' جس کے ظلم سے کوئی اور واقف ہو نہ ہو اللہ تو واقف تھا اور یہ سزا اسی نے اس کو دی ہے۔"

خالد کی بات سن کر میری روح بھی کانپ اٹھی' میری آنکھوں کے سامنے میری خود کی حرکتیں کسی فلم کی ریل کی طرح چلنے لگیں میں نے اسی وقت دل میں فیصلہ کیا کہ میں اللہ سے گڑگڑا کر توبہ کروں گا اور آئندہ

اللہ تعالیٰ کی لگائی ہوئی حدود کی خلاف ورزی نہیں کروں گا حالانکہ میں نے جو کچھ بھی کیا اس میں کبھی کسی مجبور کے ساتھ زبردستی یا زیادتی نہیں کی بلکہ رقم خرچ کی اور ان لڑکیوں کو اس کا پورا معاوضہ ادا کیا تھا جو اپنی پوری رضامندی کے ساتھ اس کام پر آمادہ تھیں۔

میں اور خالد دونوں سوچوں میں گم تھے کافی دیر کے بعد ہمارے درمیان چھائی ہوئی اس گمبھیر خاموشی کو خالد نے توڑا اور بولا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟''

''کچھ نہیں یار بس اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی اس بات کا احساس دلایا ہے کہ ہم لوگ بھی تفریحاً کیا کیا کرتے رہے ہیں۔'' میں نے شرمندگی سے پُر لہجے میں کہا۔

''ہاں یار تو ٹھیک کہہ رہا ہے آج احساس ہو رہا ہے کہ ہم کیسے مسلمان ہیں کیسے اُمتی ہیں پیارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ ہم اپنے روپے پیسے کے زعم میں اپنے ربّ اور اس کے احکامات ہی کو بھول گئے۔'' خالد نے بھی ندامت کا اظہار کیا۔

''پھر اب کیا کرنا ہے' کیا ہم اس جگہ کو کھود کر دیکھیں کہ آیا یاسمین کی لاش وہاں دفن ہے یا نہیں۔'' میں نے کہا۔

''نہیں نہیں...... '' خالد نے تیزی سے کہا۔ ''تم ذرا سوچو اگر ہمارے فارم ہاؤس میں کسی کی لاش نکل آئی تو پولیس تو ہمارا جینا حرام کر دے گی تم ایسا کرنے کے بارے میں سوچو بھی مت۔''

''تو پھر ہم کیا کریں' ہمارے کسی عمل سے اس مظلوم لڑکی کی روح کو سکون ملے گا۔'' میں نے پوچھا۔

''یار اس کے بہت طریقے ہیں ہم اس کے لیے قرآن خوانی اور فاتحہ وغیرہ کروا سکتے ہیں اس کے ایصال ثواب کے لیے غریبوں کو کھانا کھلا سکتے ہیں بلکہ میں گاؤں میں اس کے ایصال ثواب کے لیے ایک کنواں کھدوا دیتا ہوں۔ ہم ابھی اس جگہ چل کر اس کے لیے فاتحہ خوانی کرتے ہیں۔'' خالد نے کہا تو میں نے اس کا ساتھ دینے کے لیے رضامندی ظاہر کر دی۔

پھر ناشتے سے فارغ ہو کر میں اور خالد فارم ہاؤس کے اس حصے کی جانب گئے جس جگہ کی نشاندہی یاسمین نے کی تھی۔ ہم نے اندازے سے وہاں کھڑے ہو کر اس کے لیے فاتحہ خوانی کی اور پھر ایک ایک سپارہ پڑھ کر اس کے لیے دعا کی۔

اس واقعے کے بعد میں اور خالد مزید ایک ہفتہ فارم ہاؤس میں رکے لیکن یاسمین کی روح دوبارہ مجھے دکھائی نہیں دی۔

ہم فارم ہاؤس سے لوٹ آئے یاسمین کے ایصال ثواب کے لیے بہت کچھ کیا اس سارے معاملے میں مجھے بہت بڑا فائدہ ہوا۔ میں نے اپنی تمام غلط حرکات سے اللہ سے سچے دل سے توبہ کر لی' نماز کی پابندی کی اور ہر نماز میں' میں یاسمین کے لیے دعائے مغفرت کرنا نہیں بھولتا۔

لوگ تو زندگی میں ہی بُرے لوگوں کی اصلاح کرتے ہیں لیکن یاسمین وہ لڑکی تھی جس نے مرنے کے بعد مجھ جیسے بھٹکے ہوئے انسان کی اصلاح کی۔ اللہ اس کی مغفرت کرے اور اسے اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے آمین۔

❋

قسط نمبر 11

قلندر ذات

امجد جاوید

قلندر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو شکر گزاری کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچ کر قرب الٰہی حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ رب تعالیٰ بھی ان کی خواہش کو رد نہیں کرتا۔ دوسرے وہ جو نات کے قلندر ہوتے ہیں۔ ان کا پیشہ بندر، ریچھ اور کتے نچانا ہوتا ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے مرد آہن کی ہے جو نات کا قلندر تھا۔ اس نے ان لوگوں کو اپنی انگلیوں پر نچایا جو اپنے تئیں دنیا تسخیر کرنے کی دھن میں انسانیت کے دشمن بن گئے تھے۔ انسانی صلاحیتوں کی ان رسائیوں کی داستان جہاں عقل دنگ رہ جاتی ہے اور فکر حیران۔ اس داستان کی انفرادیت کی گواہی آپ خود دیں گے۔ کیونکہ یہ محض خامہ فرسائی نہیں مقاصد کا تعین بھی کرتی ہے۔

خاکہ تو خاکہ ہی ہوتا ہے، سو فیصد تصویر تو نہیں ہوتی۔ جس خبر کے ساتھ وہ خاکہ شائع ہوا تھا، اس میں خاصی خرافات بھری تفصیل لکھی ہوئی تھی۔ نامعلوم دہشت گردوں کا ٹھکانہ آتشیں اسلحہ، بارود، نقشے اور دیگر ایسا مواد جس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ وہ دہشت گرد بھارتی پنجاب میں بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانا چاہتے تھے۔ اس کارروائی میں دو کمانڈو مارے گئے، جبکہ تیسرا بچ گیا اور اسپتال میں زندگی اور موت کی کشمکش میں تھا، چند دہشت گرد گرفتار کرلیے گئے تھے اور یہ خاکے والا فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اس کے علاوہ اور بہت ساری اوٹ پٹانگ باتیں تھیں۔ میں نے اس خبر اور اس کی تفصیلات پر توجہ نہیں دی۔ بلکہ یہ سوچنے لگا کہ ان تینوں میں سے بچا کون ہوگا، جس کی مدد سے انہوں نے یہ خاکہ بنایا تھا۔ مجھے یہ اچھی طرح یاد تھا کہ ایک کے سر میں سوراخ میں نے خود کیا تھا، دوسرے کو نوین کور نے مارا تھا، تیسرا جو باہر تھا، جسے میں نے مارا نہیں تھا، صرف بے ہوش کیا تھا، ظاہر ہے اسے ہوش آ گیا ہوگا اور وہ گاڑی جلنے سے پہلے ہی باہر نکل گیا ہوگا، کیونکہ خبر میں کسی عورت کا ذکر نہیں تھا۔ یہ میں نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ باہر والے کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اندر عورت بھی تھی۔

''یہ بھی ممکن ہے جمال کہ جب ہم باہر نکلے تھے تب ارد گرد کے لوگوں نے ہمیں دیکھ......'' نوین کور نے کہنا چاہا تو میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''نوین، کچھ بھی ہے لیکن یہ خاکہ ہمارے سامنے ایک حقیقت کی طرح ہے۔ یہ سب کیسے اور کیوں ہوا، اس پر سوچنے کی بجائے یہ دھیان کرنا ہے کہ اب ہمیں کیا کرنا ہوگا؟''

''وہ تو ہمیں گیانی صاحب نے بتانا ہے، وہ اگر رابطہ نہیں کرتے تو پھر ہمیں کوئی فیصلہ کرنا ہوگا۔'' نوین کور نے سکون سے کہا۔

''چلیں دیکھتے ہیں وہ کب رابطہ کرتے ہیں اور کیا کہتے ہیں۔'' میں نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا تو مسکراتے ہوئے بولی۔

''فی الحال تو ناشتہ کریں نا، میں چلی کچن میں، کیونکہ یہ ناشتہ مجھے ہی بنانا ہوگا۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکلتی چلی گئی۔ انٹرنیٹ آن تھا۔ میں نے اپنا میل باکس کھولا تو روہی سے میل آئی ہوئی تھی۔ میرے لیے یہی ہدایت تھی کہ اگر دوپہر تک گیانی صاحب رابطہ نہ کریں تو پھر مجھے ایک نمبر پر فون کرنا تھا اور یہ جگہ جہاں میں اس وقت تھا، وہ خطرے سے خالی نہیں تھی۔ مجھے یہاں سے جلد از جلد نکل جانے

کا کہا گیا تھا۔ میں نے وہ نمبر ازبر کیا' پھر سب کچھ صاف کر کے لیپ ٹاپ بند کر کے ایک طرف رکھا اور بیڈ پر لیٹ گیا۔ نئی اطلاع آجانے پر جہاں میں پر سکون ہو گیا تھا' وہاں یہ بے چینی بھی در آئی تھی کہ یہ جگہ خطرناک ہے۔ یہ کیسے خطرناک ہے؟ اس کا مجھے ادراک نہیں تھا لیکن ایک سوال شدت سے میرے ذہن میں گونجنے لگا۔ روہی والوں کے ہزار رابطے ہوں گے' نجانے کہاں تک رسائی ہو گی' لیکن انہیں میری موجودہ لوکیشن کے بارے میں کیسے علم ہے؟ کیا انہوں نے مجھ پر نظر رکھی ہوئی ہے' یا وہ مجھے آزما رہے ہیں؟ کیا یہ سب میرے ساتھ ڈرامہ ہو رہا ہے؟ کوئی ایسا ذریعہ تو تھا جس سے وہ معلوم کر لیتے تھے کہ میں کہاں ہوں۔ یہ ایک ایسا سوال تھا' جس کا جواب میرے پاس نہیں تھا لیکن ایک گرہ کی مانند میرے دماغ میں بیٹھ گیا۔ ظاہر ہے وقت کے ساتھ ہی اس کا جواب ملنا تھا۔

"چلو یار! شہر کی سیر کو نکلیں۔" ناشتے سے فراغت کے بعد میں نے نوین کور سے کہا تو اس نے مجھے حیرت سے دیکھا' پھر اس حیرت بھرے لہجے میں بولی۔

"تم ہوش میں تو ہو' لوگوں کو شراب چڑھتی ہے' نشہ دماغ گھما دیتا ہے' لگتا ہے' تجھے ناشتے نے نشہ کر دیا ہے۔"

"نوین یار' میں تجھے بتا نہیں سکتا' میرا دل ڈر رہا ہے' چاہتا ہوں کھلی فضا میں جاؤں۔" میں نے جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ تب اس نے سنجیدگی سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا یہاں تم نے کوئی خطرہ محسوس کیا ہے؟"

"نہیں بھی اور ہے بھی' سچ پوچھو تو تذبذب کا شکار ہوں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"او کے' کچھ دیر انتظار کر لیں' گیانی صاحب کے فون کا' پھر نکلتے ہیں۔" اس نے ایک دم سے کہا اور برتن اٹھا کر باہر چلی گئی۔

⌘ ...... ✿ ...... ⌘

دوپہر ہونے والی تھی' مگر گیانی صاحب کا فون نہیں آیا تھا۔ میں کمرے میں بیٹھا ہوا اُکتا گیا تھا۔ میں ٹی وی دیکھنے کی بجائے حالات پر غور کر رہا تھا جبکہ نوین کور لیپ ٹاپ پر گندی فلمیں دیکھ کر اپنا نشہ پورا کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے احساس ہوا تھا کہ یہ فلمیں کس حد تک لت کی طرح بندے کو لگ جاتی ہیں۔ اس نے ضد کر کے ایک فلم کا تھوڑا حصہ مجھے دکھایا تھا' وہ ایک ایسی فلم تھی' جس میں تشدد دکھایا جا رہا تھا۔ مجھ پر اس کا الٹا اثر ہوا۔ مجھے صلیبی جنگوں کے دوران عیسائیوں کے اس ہتھیار کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا' کس قدر زہر انسانیت کی رگوں میں دوڑا دیا گیا تھا۔ صرف مسلمان ہی اس زہر کے عادی نہیں ہوئے تھے بلکہ پوری انسانیت کو اس میٹھے زہر کا عادی بنا دیا گیا تھا۔ ان کی اپنی قوم نے اس خنجر سے خود کو زیادہ لہولہان کر لیا تھا۔ میں نے نوین کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ دوپہر ہو گئی۔ اس کا احساس میں نے اسے دلایا تو وہ ایک دم سے اٹھ کر چلنے کو تیار ہو گئی۔ پھر وہاں سے نکل کر پیدل چلتے ہوئے ایک سڑک تک آئے' وہاں سے رکشہ لیا اور شہر کے پررونق علاقے میں چلے گئے۔ وہیں میں نے نوین سے ہنستے ہوئے کہا۔

"یار' تیرے شہر میں یہ جو پل پر کاریں چل رہی ہیں' ان کی سیر کرنا تھی' یہ تو کی ہی نہیں۔"

"کی جا سکتی ہے' اگر ہم بس اسٹاپ پر ہوں یا ہرمندر صاحب...... درمیان میں نہیں' چلو وہاں چلتے ہیں۔ میں تمہیں سیر کروا دوں۔" نوین کور نے پل پر

چلتی ہوئی کار کو دیکھ کر کہا۔
"نہیں، فی الحال کہیں سے اچھا سا روایتی کھانا کھاتے ہیں، پھر......"
"یہیں قریب ہی بھائیوں کا ڈھابہ ہے۔ وہاں چلتے ہیں۔" اس نے مجھے بتایا۔
"لیکن پہلے مجھے ایک پبلک بوتھ سے فون کرنا ہے۔" میں نے کہا تو وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔
"او کے...... وہ دیکھو، وہ سامنے...... چلو۔" اس نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
پبلک بوتھ پر پہنچ کر میں نے وہ فون نمبر ملایا تو دوسری طرف سے مردانہ مگر ملائم سی آواز سنائی دی۔
"میں دلجیت سنگھ تھورا بات کر رہا ہوں۔ پرم جیت سنگھ جی سے بات کرنا ہے۔" میں نے کہا تو دوسری جانب سے بڑی سنجیدگی سے بات ہونے لگی۔ ظاہر ہے وہ کوڈ ورڈ تھے جس کے بعد میں نے ڈھابے کے بارے میں بتایا۔ اس نے مجھے کوڈ میں ایک کار کا نمبر بتایا جسے میں نے ذہن نشین کر لیا اور فون بند کر دیا۔ مجھے کھانے کے بعد باہر نکل کر اس کار کے پاس آ جانا تھا اور ڈرائیور کو بلا کر اپنا نام بتانا تھا۔
نوین کور خاموشی سے میرے ساتھ کھانا کھاتی رہی۔ بل چکانے کے بعد جب ہم اُٹھنے لگے تو میں نے اس سے کہا
"نوین، اب تیری اور میری راہیں الگ الگ ہیں۔ زندہ رہے تو کبھی ملاقات ہوگی۔ اس لیے تم یہاں سے ذرا بعد میں نکلنا، میں پانچ منٹ بعد واپس نہ آیا تو تم چلی جانا۔ او کے؟"
"او کے۔ تم مجھے یاد رہو گے۔" اس نے اپنی عینک کے اوپر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کا چہرہ جذبات سے عاری تھا۔ میں اٹھ کر باہر آ گیا۔ میں محتاط انداز میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک سرخ رنگ کی کار کھڑی تھی۔ میں بلا جھجک اس کے پاس گیا تو اس کا ڈرائیور باہر آ گیا۔ میں اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنا نام بتایا وہ بغیر کچھ بولے مڑا اور پچھلی نشست کا دروازہ کھول دیا۔
ہماری منزل ایک پرانے طرز کی حویلی تھی جو کم از کم ڈیڑھ سو سال پرانی تھی۔ مگر رنگ و روغن اور دیکھ بھال کے علاوہ توجہ دینے پر وہ بالکل نئی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا طرز تعمیر بہترین تھا۔ جس میں انڈین اور انگلش تعمیر کا امتزاج پایا جاتا تھا۔ حویلی کے سامنے لان میں گھاس، پودے اور درخت اپنی بہار دکھا رہے تھے، جس سے میں نے آسودگی جیسی فرحت محسوس کی۔ پورچ میں کار رکی تو باوردی ملازم نے گیٹ کھولا۔ جس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہاں جس قدر بھی ہے اہمیت ضرور ہے۔ وہ مجھے ڈرائنگ روم میں لے گیا جو جدید اور قدیم اشیاء سے سجا ہوا تھا۔ میں وہاں پہنچ کر کسی حد تک مرعوب ہوا تھا۔ شاید اس کی تاریخی حیثیت تھی یا وہاں سے اس حویلی کے مکینوں کے بارے میں اظہار ہو رہا تھا۔ میں وہاں رک گیا۔
"آیئے۔!" باوردی ملازم نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں اس کے ساتھ آگے بڑھتا گیا۔ کمرے سے باہر نکل کر دائیں ہاتھ میں سیڑھیاں تھیں، وہ ان پر چڑھتا چلا گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے دوسری منزل پر آ گیا۔ سامنے ہی ایک بڑے سارے چھجے کے نیچے کرسیاں دھری ہوئی تھیں، جن میں سے ایک کرسی پر بھاری بھر کم جثے والا ادھیڑ عمر سکھ بیٹھا ہوا تھا۔ جس نے زرد رنگ کی پگڑی، سفید کرتا اور پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ روایتی کرپان کی پٹی کا رنگ نیلا تھا۔ سفید داڑھی، گہری شربتی آنکھیں لیے وہ میری جانب ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ چند لمحے یونہی دیکھتا رہا پھر دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے فتح بلائی۔

"ست سری اکال، جی آیاں نوں، جمال آ بیٹھ۔"
اس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔
"بہت شکریہ......" یہ کہتے ہوئے میں کرسی پر بیٹھ گیا تو مجھے اپنے ساتھ لانے والا ملازم واپس پلٹ گیا۔
"مجھے رتن دیپ سنگھ کہتے ہیں۔ تم جب سے یہاں آئے ہو مجھے معلوم ہے مدن لعل اور رویندر سنگھ والا معاملہ بھی، خیر...... تم ہمارے مہمان ہو، یہاں رہو۔"
اس نے بڑے سکون اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں یوں کہا جیسے یہ واقعات اس کے لیے کچھ بھی حیثیت نہ رکھتے ہوں۔
"بہت خوشی ہوئی جی آپ سے مل کر، مہمان بنانے پر، دیکھیں مہمان نے ایک دن جانا ہوتا ہے، وہ آتا اپنی مرضی سے ہے، جاتا میزبان کی مرضی سے کب تک میں......" میں نے کہنا چاہا تو وہ قدرے مسکرا کر بولا۔
"اوئے جمال یار، تجھے آئے دو منٹ نہیں ہوئے اور جانے کی بات کر رہا ہے۔ باقی تمہاری بات ٹھیک ہے، مہمان نے جانا تو ہوتا ہے، وہ میں تمہیں بتادوں گا۔ لیکن فی الحال میری کچھ باتیں سن لو۔"
"جی فرمائیں۔" میں نے متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔
"بھارتی خفیہ کو یہ تو معلوم ہے کہ کوئی بندہ ہے جو یہاں امرتسر سے جالندھر تک کارروائیاں کر رہا ہے۔ کون ہے، اس بارے میں نہیں معلوم۔ جسپال کے بارے میں خاصی الجھن رہی، اسے پہلے ہی دن ایجنٹ سمجھ لیا گیا اور اس پر کڑی نگاہ رکھی گئی۔ جسپال کا محتاط رویہ اور رویندر سنگھ کی غلط بیانیاں، اس نے الجھن ڈال دی، خیر اب وہ بھی نہیں، جسپال بھی چلا گیا لیکن کہانی یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ جسپال نے دوبارہ آنا ہے، لہٰذا اس کی واپسی کی راہ ہموار رہنی چاہیے۔"
"کیا آپ بھی وہی سوچ رہے ہیں جو گیانی صاحب سوچ رہے تھے۔" میں نے پوچھا۔
"بہت حد تک معاملات گیانی دیکھتا ہے، لیکن اصل فیصلے کہیں اور ہوتے ہیں۔ یہ سوچ اس کی اپنی نہیں کسی اور معتبر جگہ کی ہے۔ خیر، خفیہ کو غلط راہ پر ڈالنے کے لیے ہی رات والا ڈرامہ کیا گیا اور آج جو کچھ اخبارات میں ہے، وہ بھارتی خفیہ کو غلط راہ پر ڈالنے کے لیے ہے۔"
"ایسا کیوں سردار جی؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔
"اس لیے جمال کہ انہیں اپنی اوقات کا پتہ چلتا رہے۔ میں مانتا ہوں ان کے وسائل بہت ہیں، قوت بھی زیادہ ہے لیکن لڑتے، جذبے ہیں اور کام ہمیشہ حوصلہ ہی آتا ہے۔ آگ میں چھلانگ لگانے کے لیے جرات چاہیے ہوتی ہے۔" اس نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا۔ ایسا کہتے ہوئے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔
"تو یہ بات ہے۔" میں نے اس کی بات سمجھتے ہوئے کہا۔
"مدن لعل نے را کی مدد سے لاہور میں سیٹ اپ بنایا ہے۔ وہ اس کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ کیونکہ را اور لاہور کے درمیان رابطہ کٹ گیا۔ لاہور والے لوگ ایسے ہی ہیں، جیسے کوئی مضبوط منشیات فروش جو کسی بھی شہر میں ہوتا ہے۔" اس نے سانس لیا اور میری طرف دیکھا، میں خاموش رہا تو وہ بولا۔
"جمال! میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم سچ کہو گے۔"
"آپ پوچھیں میں سچ ہی کہوں گا۔" میں نے جواباً کہا۔
"تمہاری یہ ساری بھاگ دوڑ کس لیے ہے؟ کیا مقصد ہے تمہارا؟ کس لیے تم نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھی ہوئی ہے؟" یہ کہہ کر اس نے میری آنکھوں میں

دیکھا۔ میں خاموش رہا، کیونکہ میں خود تذبذب میں پڑ گیا، پھر کچھ دیر بعد بولا۔

"رتن دیپ سنگھ جی، سچ پوچھیں تو میرا کوئی مقصد نہیں ہے، شاید میں نے زندگی کی حفاظت کے لیے موت کا سامنا کرلیا ہے۔ حالات ہی ایسے بنتے گئے ہیں اور بس میں چلتا چلا جارہا ہوں۔"

"سچ کہا تم نے کوئی دھرم کے لیے لڑ رہا ہے کوئی زمین اور وطن کے لیے اور کوئی اپنا وجود بچانے کے لیے، ہمیں دیکھو، سکھ دھرم کو ختم کرنے کی پوری پوری کوشش کی جارہی ہے اور ہندو اس میں سب سے آگے ہے۔ ہم اپنا وطن چاہتے ہیں اور ہماری لڑائی اپنا آپ بچانے کے لیے ہے۔ میں اس کے لیے دلائل کے انبار لگا سکتا ہوں لیکن صرف ایک مثال دوں گا۔ سانحہ 1984ء میری ان ساری باتوں کا جواب ہے۔"

"سبھی لڑ رہے ہیں، لیکن اپنے اپنے انداز میں۔ معاف کیجیے گا، جس طرح سکھ پنتھ کی اب حالت ہوگئی ہے اس سے یہ سارے ہدف حاصل کرنا بہت مشکل ہوگئے ہیں۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"واگورو مہر کرے گا جمال، میں مایوس نہیں ہوں۔ دراصل یہ ہندو بنیئے اپنی اوقات سے باہر ہوگئے ہیں۔ اشوکا کے بعد سے 47ء تک یہ غلامی کی زندگی گزارتے آئے ہیں۔ اب یہ آپے سے باہر ہوگئے ہیں۔ سنگھ پریوار جب چاہے قتل عام شروع کردیتا ہے، تم یقین رکھو وہ دن دور نہیں جب اسی بھارت کے کئی ٹکڑے ہوں گے۔ کیونکہ جس ملک میں دلت عوام، نچلے طبقے کے لوگ اپنا ترنگا لہرانے پر قتل کردیئے جائیں، وہ ایسی جمہوریت کے ماتھے پر کالک سے زیادہ کچھ نہیں۔"

"یہ بھارتی تو اپنی جڑیں خود کاٹتے جارہے ہیں؟" میں نے کہا۔

"بالکل، اپنے سارے کرتوت، مختلف ملکوں کی خفیہ ایجنسیوں پر ڈال دیتے ہیں۔ جیسے خالصتان تحریک کو پاکستانی آئی ایس آئی کے کھاتے میں ڈالتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں میرے سامنے میرے باپ کو زندہ جلا دیا گیا، وہ چیخیں آج بھی میرے کانوں میں گونجتی ہیں۔ میری ماں کو اس حویلی میں بے دردی سے قتل کردیا گیا۔ کیا یہ آگ آئی ایس آئی نے لگائی تھی یا ان ہندوؤں نے؟" وہ بے حد جذباتی ہوگیا تھا، پھر ایک طویل سانس لے کر بولا۔ "خیر...... یہ باتیں تو ختم ہی نہیں ہوں گی۔ تم یہاں رہو اور تھوڑے بہت کام ہیں وہ کرو، جب ہمارا یہ مہمان جائے گا تو بہت اچھا ہوگا۔" اس نے مسکراتے ہوئے اپنی بات سمیٹ دی۔ کیونکہ دو تین ملازم کھانے پینے کا سامان کافی مقدار میں لے آئے تھے۔

"کیا کام ہوں گے؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی کیا جلدی ہے۔ ابھی کھاؤ پیو اور سکون سے سو جاؤ۔ آرام کرو، بتادوں گا۔" اس نے گہری سنجیدگی سے کہا اور اپنے سامنے پڑے ہوئے سیب کو اٹھالیا۔ اس کے ساتھ ہی کھانے پینے اور باتوں کا سلسلہ دراز ہوگیا۔

وہ حویلی کے سرے پر ایک شاندار کمرہ تھا۔ وہی قدیم وجدید انداز میں سجاوٹ تھی۔ اونچی چھت والا یہ کمرہ خوشبوؤں میں بسا ہوا تھا۔ کھڑکی کے باہر مہندی کے پودے لگے ہوئے تھے۔ جن کی مہک مسحور کن تھی۔ میں نے کمرے کا لاک لگایا، پسٹل نکال کر تکیے کے نیچے رکھا اور سکون سے بیڈ پر پھیل کر لیٹ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے نیند نے آلیا۔

میری نیند ایک دم سے ٹوٹ گئی تھی۔ میں جلدی

سے اٹھا اور ادھر ادھر دیکھا۔ میں نے دیکھا، دروازے میں ایک سرو قد لڑکی کھڑی تھی۔ اس نے بلیک ٹائیٹس نما پتلون پہنی ہوئی تھی، گلابی سلیولیس شرٹ، لمبی گردن، کھلے ہوئے لانبے گیسو، تیکھے نقوش اور لمبے ناک والی میری طرف گھور کر دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا، اس سے پہلے کہ میں کوئی بات کرتا، وہ مسکرائی اور بولی۔

''لیٹے رہو، دلجیت سنگھ جی، میں کوئی غیر نہیں، تمہاری میزبان گائیڈ، دوست اور جو تم چاہو میں وہی ہوں......''

یہ کہتے ہوئے وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ہوئی میرے بیڈ کے قریب آ گئی اور بے تکلفی سے بیٹھ گئی۔ خوشبو کا ایک جھونکا آیا، اس نے کوئی دل آویز قسم کا پرفیوم لگایا ہوا تھا۔ اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور اپنا ہاتھ بڑھا کر بولی۔ ''بانیتا کور، آپ مجھے ''بتو'' کہہ سکتے ہو، میرا نک نیم......''

میں نے اس کا ہاتھ تو تھام لیا، مگر مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اسے کیسا رسپانس دوں۔ اس نے مجھے دلجیت سنگھ کے نام سے پکارا تھا جو میرا یہاں کوڈ نیم تھا۔ پھر اگلے ہی لمحے مجھے سمجھ آ گئی کہ یہی نام یہاں اسے بتایا ہوگا، ورنہ اسے کوئی خواب تھوڑی آ گیا ہے۔ میں اس کی آنکھوں میں دیکھ کر آہستگی سے مسکرا دیا، پھر اس کے بدن کو دیکھ کر بولا۔

''دیکھنے میں تم بہت خوبصورت لگ رہی ہو، اب معلوم نہیں میزبانی کر بھی پاؤ گی کہ نہیں......''

''بعض اوقات بندہ بڑے غلط اندازے لگا لیتا ہے، کہتے ہیں کہ بندہ اس وقت درست اندازے لگاتا ہے جب وہ بہت تجربے کار ہو گیا ہو۔'' اگرچہ اس نے یہ بات بڑے تحمل سے اور مسکراتے ہوئے کہی تھی لیکن مجھ پر طنز کر گئی تھی۔ جس کا مجھے قطعاً برا نہیں لگا، بلکہ ایک طرح سے فرحت محسوس ہوئی، میں ہنس دیا۔

''چلیں، اپنا اندازہ یقین میں بدل کے دیکھتے ہیں۔''

''ممکن ہے، مجھے بھی ایسا ہی کوئی یقین کرنا پڑے۔ سننے اور دیکھنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔'' اس نے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کسی حد تک ہنستے ہوئے کہا تو میں نے پوچھا۔

''دروازہ تم نے کھولا یا پھر یہاں کے لوگوں نے۔''

''یہیں کے لوگوں نے، مگر یہ حویلی میرے لیے اجنبی نہیں، سارے لوگ ہی جانتے ہیں مجھے۔'' اس نے کاندھے اچکا کر کہا تو میں سیدھے مطلب کی بات پر اتر آیا۔

''میری گائیڈ، مجھے کیا رہنمائی دے گی؟''

''یہاں سے چند کلو میٹر کے فاصلے پر امرتسر جنکشن ہے، بڑا ریلوے اسٹیشن ہے، کیا تم وہ دیکھنا پسند کرو گے۔''

''ابھی چلنا ہے یا کچھ دیر ٹھہر کر۔'' میں نے لیٹے لیٹے ہی کہا۔

''ابھی تو کچھ وقت تمہیں تیار ہونے کو لگے گا، پھر میں تجھے آم پاپڑ کھلاؤں گی، بہت مشہور سوغات ہے یہاں کی، پھر اگر دل کیا تو کوئی مووی شو وی دیکھ لیں گے یا پھر کسی ڈانس کلب میں چلتے ہیں یا کسی ریستوران میں کھانا کھا لیں گے، جو دل میں آیا۔'' اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''تیاری میں خود کروں گا یا تم کراؤ گی۔'' میں نے پوچھا تو وہ بے تکلفی سے بولی۔

''دونوں مل کر کریں گے، میں تمہارے لیے خود کپڑے خرید کر لائی ہوں۔ گاڑی میں پڑے ہیں۔ ابھی آ جاتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے نازک سے بلیک سینڈل اتارے اور بیڈ پر پھیل کر بیٹھ گئی۔ وہ میرے سامنے تھی۔ اس کا رنگ گورا نہیں تھا، مگر اس

قدر سانولا بھی نہیں تھا۔ یہی کھلتا ہوا گندمی رنگ' سیلولیس شرٹ کے اوپر والے دو بٹن کھلے ہوئے تھے۔ مجھے ایک دم خیال آیا کہ میں اس کے بدن میں اُلجھتا جا رہا ہوں۔ اس لیے میں اٹھا اور باتھ روم کی جانب بڑھ گیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد میں تیار ہو چکا تھا۔ سیاہ ڈریس پتلون' پرپل شرٹ کے ساتھ سیاہ پگڑی پہن لی تھی' پاؤں میں بلیک شوز' داڑھی کو خوب کنگھا کیا' مونچھوں کی نوکیں نکالیں اور تیار ہو گیا۔ اس دوران بانیتا کور بھی تیار ہو گئی۔ اس نے سیاہ جین اور گہرے نیلے رنگ کی بازوؤں والی ٹی شرٹ پہن لی' پاؤں میں بلیک لیدر شوز' بالوں کو کسی حد تک باندھ لیا تھا۔ میں اپنا پسٹل نکال کر جیب میں ڈالنے لگا تو بانیتا نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

''اسے رہنے دو' میرے پاس گاڑی میں پڑا ہے تمہارے لیے' خوبصورت تحفہ' فالتو میگزین بھی ہیں۔''

اس کے یوں کہنے پر میں نے پسٹل واپس رکھ دیا' اور پھر اس کے ساتھ کمرے سے نکلتا چلا گیا۔ باہر شام اتر کر رات میں بدل گئی تھی۔ میں نے کھلی فضا میں ایک سانس لیا پھر ہم بلیک ڈاٹسن میں بیٹھ کر حویلی سے نکلتے چلے گئے۔

امرتسر شہر کی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ ٹریفک بھی بڑھ گیا تھا۔ میرے ساتھ پہلو میں ڈرائیونگ کرتی بانیتا ابھی تک خاموش تھی۔ شاید وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ کیونکہ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ میں نے بھی اسے مخاطب کرنا مناسب خیال نہیں کیا۔ وہ چلتی چلی گئی، یہاں تک کہ ہم ایک شاہراہ پر ملٹی پلیکس سینما کے سامنے آن رکے۔ اس نے کار پارکنگ میں لگائی اور بولی۔

''اپنے پسٹل اور میگزین لے لو اور باہر جا کر کھڑے ہو جاؤ، میں آ رہی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے نکلی اور کار پارک کرنے کے پیسے دے کر اندر کی جانب چلی گئی۔ میں کار سے نکل کر باہر آ گیا۔ شاید شو شروع ہونے والا تھا۔ اس لیے کافی سارے لوگ تھے۔ کچھ دیر بعد وہ بھی آ گئی۔ میرے پاس آ کر ایک ٹکٹ میری طرف بڑھا کر بولی۔ ''یہ رکھ' شاید کام آ جائے؟''

میں نے ٹکٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور اپنی جیب میں رکھ لیا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔ کچھ دیر تک ہم پیدل چلتے گئے۔ پھر ایک آٹو رکشہ میں بیٹھ گئے جو کچھ دیر چلتا رہا پھر ایک جگہ اس نے رکنے کو کہا۔ رکشے کی ادائیگی کر کے وہ اتر گئی۔ میں خاموش رہا۔ ہم شاہراہ پر کھڑے تھے اور رواں ٹریفک کی روشنیاں ہم پر پڑ رہی تھیں۔ بانیتا نے میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈالا اور ایک طرف چل پڑے۔ کچھ ہی فاصلے پر ریلوے ٹریک تھا۔ ہم اس کے درمیان چلنے لگے۔ تب وہ بولی تو اس کا لہجہ انتہائی سنجیدہ اور تشویش بھرا تھا۔

''دلجیت! اس ٹریک پر آگے جا کر امرتسر اسٹیشن ہے' لیکن یہ ایک بڑا جنکشن بھی ہے تھوڑا آگے جا کر یہی ایک ٹریک' کئی ٹریک میں بدل جائے گا۔ ہمارے دائیں ہاتھ پر ریلوے کالونی ہوگی۔ وہاں ایک گودام ہے' جہاں سے اسلحہ' بارود اور منشیات پھیلائی جا رہی ہے اور وہ صرف اور صرف سکھوں کے خلاف استعمال ہوتا ہے۔ اطلاع ہے کہ ایک بڑی کھیپ یہاں اتری ہے، جو راتوں رات ٹرین اور ٹرکوں کے ذریعے یہاں سے نکلے گی۔ ہمیں اس کھیپ سے غرض نہیں' لیکن اس بندے سے غرض ہے جو یہاں اپنی نگرانی میں یہ سپلائی دے رہا ہے۔ اس سے کافی ساری باتیں کرنی ہیں اس لیے زندہ چاہیے.....''

''بانیتا میں نہیں جانتا کہ تم سکھوں کی کس تنظیم سے تعلق رکھتی ہو' لیکن یہاں آ کر میں نے محسوس کیا

ہے کہ ان تنظیموں میں لڑکیاں بہت زیادہ فعال ہیں۔ وہ زیادہ شدت سے کام کرتی ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟"
میں نے پوچھا تو وہ چند لمحے خاموش رہی، پھر ایک طویل سانس لے کر سامنے دیکھا، جہاں کئی ٹریک نزدیک آرہے تھے۔ وہ بولی۔
"تمہارا تجزیہ ٹھیک ہے، رہی زندگی تو میں تمہیں یہ تفصیل سے بتاؤں گی۔ یہ چند لفظوں میں سمجھا دینے والی بات نہیں ہے۔"
"اوکے، جیسا تم چاہو۔" میں نے کاندھے اُچکاتے ہوئے کہا۔ میری توجہ بھی ادھر ہو چکی تھی۔ کچھ دیر بعد ہم وہاں جا پہنچے جہاں سے کچھ فاصلے پر خالی بوگیاں کھڑی تھیں۔ اگرچہ وہاں روشنی تھی لیکن ایک طرف بالکل اندھیرا نہیں مگر ملگجی روشنی تھی۔ جو چھن کر آرہی تھی۔ تبھی بانیتا نے مجھے بازو سے پکڑ کر روکا اور مجھے لے کر اندھیرے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ پھر سرگوشی میں بولی۔
"وہ دیکھو وہ بوگیاں ہیں اور اس میں سامان رکھا جارہا ہے، ایک ایک آدمی آرہا ہے، وہ دیکھو، ایسا ہی مال انہوں نے مختلف شہروں کی طرف جانے والی ٹرینوں میں رکھنا ہے۔"
"بانیتا! تم نے کہا ہے کہ یہاں کے نگراں بندے کو پکڑنا ہے، ہمیں وہاں جانا ہے، یہاں سے ان کا تماشہ کیوں دکھا رہی ہو؟"
"میرا خیال ہے کہ ہم اس تک یونہی نہیں پہنچ سکتے، وہ اپنے بندوں کے درمیان وہاں موجود ہوگا اور شاید کالونی میں ہم اسے پکڑ نہ سکیں۔ وہاں سے نکلنے کے کئی راستے ہیں۔ اسے یہاں لانے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ اسے بل سے باہر لانے کے لیے یہاں کوئی نہ کوئی ہنگامہ کیا جائے۔ وہ یہاں نہ بھی ہوا تو یہاں پہنچ جائے گا۔" اس نے الجھتے ہوئے کہا۔ میں چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔
"آؤ، اب جیسے میں کہوں ویسا کرنا۔"
میں یہ کہہ کر اندھیرے میں بڑھتا چلا گیا۔ میں نے وہاں کا ہر طرح سے جائزہ لے لیا تھا۔ اگرچہ ریلوے شیڈ میں آنے کے لیے راستے مخصوص ہوتے ہیں مگر لوگ شارٹ کٹ کے لیے راستے بنا لیتے ہیں۔ کالونی سے شیڈ تک آنے میں ایک شارٹ کٹ راستہ بنا ہوا تھا جو درختوں اور پودوں کے درمیان میں سے تھا۔ چھنتی ہوئی روشنی وہاں پڑ رہی تھی۔ میں نے دیکھا ایک شخص وہاں سے سر پر پیٹی لے کر نکلتا اور تیزی سے بوگی کی طرف بڑھتا، وہ پیٹی وہاں بوگی کے دروازے پر رکھتا اور واپس پلٹ جاتا۔ اسی طرح دو تین بندے میرے سامنے سے گزر گئے تھے۔ لازمی طور پر بوگی میں لوگ موجود تھے جو سامان کو ٹھکانے لگا رہے ہوں گے۔ ان بوگیوں میں بہتیرے ایسے چور خانے ہوتے ہیں۔ میں نے اپنے طور پر فیصلہ کیا اور بانیتا سے کہا۔
"تم کور پر رہنا، اب میں دیکھتا ہوں۔"
یہ کہتے ہوئے میں نے پسٹل نکالا، سائیلنسر چیک کیا، پھر سامنے سے جاتے ہوئے بندے پر فائر کر دیا۔ ٹھک کی آواز آئی، جس کے ساتھ اس بندے کی چیخ فضا میں بلند ہوئی، جس نے سناٹے کو چیر کر رکھ دیا۔ اس وقت تک ایک بندہ پیٹی لے کر ریلوے لائنوں کے درمیان آچکا تھا، میں نے اس کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ اس کے حلق سے بھی دردناک چیخ برآمد ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی وہاں ہلچل مچ گئی۔ بوگی میں سے دو بندوں نے سر باہر نکال کر دیکھا، وہ دونوں باہر کی صورت حال کا جائزہ لے رہے تھے۔ مگر میں نے ان کے چہروں کے تاثرات جاننے کی بجائے یکے بعد دیگرے دو فائر کیے، وہ دونوں ہی

کھڑکی میں لٹک گئے۔ اچانک بوگی میں سے ایک بندہ نکل کر تیزی سے بھاگا، وہ چھپتے ہوئے شارٹ کٹ راستے کی طرف جا رہا تھا۔ بلاشبہ وہ کالونی میں موجود لوگوں کو صورت حال کے بارے میں بتانا چاہتا ہوگا۔ میں نے بانیتا کو وہاں سے نکلنے کا اشارہ کیا اور شیڈ کی طرف بڑھ گیا۔ جہاں کئی بوگیاں کھڑی تھیں۔

مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں ان بوگیوں کی طرف بڑھا تھا اور یہ بھی اپنے حواسوں میں دیکھا تھا کہ میں ریلوے ٹریک کے درمیان بھاگتا ہوا جا رہا تھا کہ اچانک میرے اردگرد کے سارے منظر ختم ہو گئے اور یوں نیا منظر ابھر آیا جیسے فلم اسکرین پر ایک منظر کی جگہ دوسرا منظر لے لیتا۔

ویسی ہی رات تھی، وہاں پر صرف بوگیاں نہیں، ایک پوری ٹرین تیار تھی۔ لوگ اس میں بھرے ہوئے تھے۔ بہت سارے چھتوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ انجن سے وسل بج رہی تھی کہ اچانک شور مچ گیا۔ پلیٹ فارم کی دوسری طرف سے سکھوں کا ایک جتھا نکلا، ان کے ہاتھوں میں کرپانیں، بلم، لاٹھیاں، توڑے دار بندوقیں، آگ لگی ہوئی مشعلیں، وہ جنونی انداز میں ریلوے لائنیں پار کرتے ہوئے ٹرین کی جانب بڑھ رہے تھے۔ گالیوں کے شور میں "جو بولے سو نہال، ست سری اکال" کے نعرے بھی گونج رہے تھے۔ پھر اچانک وحشت ناک چیخیں بلند ہونا شروع ہو گئیں۔ کراہیں، موت کا پیغام لیتی ہوئی دردناک صدائیں، بین، رونے اور کراہنے کا شور، نعرے، ایک قیامت کا منظر میرے سامنے تھا۔ وحشی سکھ درندے ان مظلوموں کو بے دردی سے کاٹ رہے تھے۔ اچانک ایک بچے کو بوگی سے باہر پھینکا گیا، جسے ایک سکھ بلوائی نے اپنی تلوار سے ہوا ہی میں دو ٹکڑے کر دیا۔ میں نے وحشت، کراہیت اور بے بسی کی انتہا پر زور سے آنکھیں بھینچ لیں۔ چند لمحوں بعد دوبارہ آنکھیں کھولیں تو وہ منظر غائب ہو چکا تھا، اب وہی منظر میرے سامنے تھا، بوگیاں، سناٹا اور سناٹے کو چیرتی ہوئی وحشی جذبات بھرا میرا دل، جلیانوالہ باغ کے بعد یہ دوسرا واقعہ میرے ساتھ ہوا تھا، اس وقت میں یہی سمجھا تھا کہ نوین کور کوئی سفلی علم جانتی ہے لیکن اب تو وہ میرے نزدیک نہیں تھی، ضرور یہ کچھ اور ہی معاملہ ہے، کیا ہے؟ میں اس پر سوچنا چاہتا تھا، لیکن اسی لمحے بانیتا نے مجھے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

"دلجیت! کیا ہوا تمہیں، تم پسینے سے شرابور کیوں ہو، وہ سامنے دیکھو؟"

میں اس کے کسی سوال کا جواب نہیں دے سکا۔ میرا دل میری کنپٹیوں میں بج رہا تھا اور سامنے دس بارہ لوگ تیزی سے بوگی کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ان سب کے ہاتھ میں اسلحہ تھا۔ "وہ درمیان والا لمبا سا سکھ، جس نے سرخ شرٹ پہنی ہوئی ہے...... وہ...... وہ چاہیے زندہ۔"

"فکر نہ کرو۔" میں نے کہا تو اس نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ شاید میرا لہجہ بدل گیا تھا، یا وہ مجھے پاگل سمجھ رہی تھی؟ "تم صرف یہاں سے نکلنے کا راستہ تلاش کرو۔"

"وہ ہے۔" اس نے تیزی سے کہا تو میں نے بوگی سے یکے بعد دیگرے فائر کرنا شروع کر دیئے، تبھی انہوں نے بوکھلا کر گرتے ہوئے لوگوں کو دیکھا اور پھر اندھا دھند فائرنگ کرنا شروع کر دی۔ میرا میگزین خالی ہو گیا تو میں نے دوسرا بدل لیا۔ انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فائر کدھر سے ہو رہا ہے۔ اس شخص کے ساتھ جتنے آئے ہوئے لوگ تھے، وہ سارے ڈھیر ہو گئے، تبھی اس بندے کا فون بج اٹھا اور میرے قریب کھڑی بانیتا نے اسے فون ملایا تھا۔

"اگر مرد کے بچے ہو تو یہیں رُک جانا' بھاگنا نہیں۔"

"اوہ ...... یہ تم ہو بانیتا۔" اس نے بھاری آواز میں یوں کہا جیسے وہ اسے اچھی طرح جانتا ہو۔

"ہاں، میں نے آخر تمہیں بل سے نکال لیا نا چوہے۔" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اور تم کسی خارش زدہ کتیا کی طرح چھپ کر بھونک رہی ہو' اپنے پیچھے کتنے کتے لگا کر لائی ہو' یا وہ سارے ہیجڑے ہیں جو چھپے بیٹھے ہیں۔"

"صرف میں ہوں ہیجڑے' تیری چنوتی پر آئی ہوں۔ میں تمہیں چند لمحے دیتی ہوں۔ بھاگ سکتے ہو تو بھاگ جاؤ اور ثابت کر دو کہ ہیجڑے تم ہو، حرامی کی اولاد ...... ورنہ میں تیرے سامنے آ رہی ہوں۔"

"او ...... آؤ ...... تیرا دیدار ضرور کروں گا' آ جاؤ ...... آج رات تیرے ساتھ ہی سہی۔" اس نے گھٹیا انداز میں کہا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا' تبھی بانیتا نے فون بند کیا اور سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔

"میں نکلتی ہوں' اگر وہ فائر کرے تو اس کا اسلحہ ...... زندہ پکڑنا ہے۔"

"او کے ......" میں نے کہا اور اسے نشانے پر رکھ لیا۔

"لو ...... جا رہی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ بوگی سے نیچے اتر گئی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی' ان کے درمیان چند فٹ کا فاصلہ رہ گیا۔ تب اس نوجوان نے اپنا پسٹل اپنی پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔ تبھی بانیتا نے بھی ویسا ہی کیا۔ دونوں آمنے سامنے آ چکے تھے۔ تبھی وہ نوجوان بڑھا اور اسے اپنے شکنجے میں لینے کے لیے لپکا۔ بانیتا نے زور سے گھونسہ اس کے منہ پر دے مارا۔ اس کے ساتھ ان میں فائٹ شروع ہو گئی۔ بلاشبہ وہ نوجوان فائٹ میں ماہر معلوم ہوتا تھا۔ بانیتا اگر بچ رہی تھی تو صرف اپنے پھرتیلے بدن کی وجہ سے۔ اس نے زور سے کھڑے ہاتھ بانیتا کے کاندھوں پر مارے' وہ بیٹھتی چلی گئی۔ تبھی بانیتا نے نوجوان کی ٹانگوں کے درمیان اپنا گھٹنا مارا' وہ دہرا ہو گیا' یہ لمحہ اس نے ضائع نہیں جانے دیا' اور دونوں ہاتھ باندھ کر اس کی گردن پر مارے' وہ ڈکراتا ہوا ٹریک کے درمیان گر گیا' تبھی اس نے پسٹل نکال کر اس کے سر پر رکھ دیا۔ اب میرا وہاں پر بیٹھنا فضول تھا۔ میں تیزی سے ان کے پاس پہنچا' میرے اندر جوش سر مار رہا تھا۔ چند لمحے پہلے دیکھا ہوا منظر میرا خون کھولا رہا تھا۔ میں نے جاتے ہی اسے کالر سے پکڑ کر اٹھایا' اور سرد لہجے میں پوچھا۔

"باقی سارا شوق کہیں دوسری جگہ جا کر پورا کریں گے۔" یہ کہہ کر میں نے پوری قوت سے اپنی کہنی اس کی کنپٹی پر دے ماری۔ وہ اگلے ہی لمحے ساکت ہو گیا۔ میں نے اسے کاندھے پر اٹھایا اور سوالیہ نگاہوں سے بانیتا کی طرف دیکھا۔ وہ ایک طرف چل پڑی' تقریباً سو گز کے فاصلے پر وہ ریلوے لائن کے ساتھ ایک طرف اتر گئی۔ وہاں کوڑا کرکٹ کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ جس سے تعفن اٹھ رہا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک فور وہیل جیپ کھڑی تھی۔ جس میں دو تین بندے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اس نوجوان کو اس جیپ میں پھینکا تو وہ چل پڑی۔ نظروں سے اوجھل ہوتے ہی بانیتا کو جیسے ہوش آ گیا' وہ تیزی سے بولی۔

"چل اب نکلیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ ریلوے ٹریک کی جانب چل دی۔ میں اس کے ساتھ تھا۔ ہم چند قدم کے فاصلے پر موجود ٹریک کے درمیان آ گئے ہی چلتے چلے گئے۔ تبھی ہمیں اپنے پیچھے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا' آٹھ دس لوگ بھاگتے ہوئے آ رہے تھے' ان سب کی نگاہیں ہم پر جمی ہوئی تھیں۔ تبھی بانیتا کی تیز

آواز سنائی دی۔

"دلجیت، بھاگو......!"

میں نے اس ایک لمحے میں ماحول کا جائزہ لے کر فیصلہ کر لیا' اور پھر بھاگتے ہوئے ریلوے ٹریک سے باہر نکل گیا۔ ریلوے ٹریک اور سڑک کے درمیان خالی جگہ تھی۔ ہم دونوں اس طرف بھاگ نکلے۔ ہمارا تعاقب کرنے والے لوگ رکے نہیں' وہ بھی ہمارے پیچھے تھے۔ مجھے یہ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ ان کے پاس اسلحہ نہیں ورنہ اب تک فائر کر چکے ہوتے۔ ڈرانے' دھمکانے یا پھر خوف زدہ کرنے کے لیے ہی سہی' میں ایک دم سے رک گیا۔ میں نے اپنی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے آنے والے لوگوں کو دیکھا۔ بانیتا آگے نکل گئی تھی۔ تبھی میں نے بے باک انداز میں زور سے کہا۔

"رک جاؤ۔!" یہ کہتے ہوئے میں نے پسٹل نکال لیا۔ پسٹل پر نگاہ پڑتے ہی وہ سارے کے سارے وہیں رک گئے۔ تبھی میں نے ان سے مخاطب ہو کر کہا۔ "پہلی بات تو یہی ہے کہ ہمیں جانے دو اور تم لوگ واپس پلٹ جاؤ۔ دوسری بات' جسے زیادہ ہی شوق ہے لڑنے کا تو وہ آگے آ جائے' میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈال لے اور اگر تم سب نے مجھ سے لڑنا ہے تو ہم ہتھیار پھینک کر اپنا زور آزما لیتے ہیں۔ بولو۔" تبھی ایک ادھیڑ عمر تنومند شخص نے اونچی آواز میں کہا۔

"اسلحے کے زور پر تو ہیجڑا بھی بکواس کر لیتا ہے' تم میں دم ہے تو آ' میرے ساتھ پنجہ لڑا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تلوار ایک دوسرے شخص کی طرف اچھال دی۔ تبھی میں نے بھی پسٹل بانیتا کی طرف اچھال دیا۔ جسے اس نے کیچ کر لیا۔

ہم دونوں ہی چند قدم آگے بڑھ کر ایک دوسرے کے سامنے آ چکے تھے۔ اس کی سرخ آنکھیں میرے چہرے پر گڑھی ہوئی تھیں۔ اچانک اس نے جھکائی دی' اور میری پسلی میں گھونسہ مار دیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے جبڑے پر ہاتھ پڑا' میں ایک دم سے گھوم گیا۔ مجھے یہ یاد ہی نہیں رہا کہ میں نے دستار باندھی ہوئی ہے' میرے سامنے ایک سکھ تھا' اس نے پورے جوش میں پکارا۔ "جو بولے سونہال" اس کے ساتھ ہی باقی لوگوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' مجھ پر پل پڑنے کے لیے بڑھے' ایک طرف جہاں میرے ذہن میں آئی کہ بانیتا بھی سکھ ہے' وہ سکھ ہی کی مدد کرے گی' لیکن میری نگاہوں کے سامنے چند لمحے پہلے کا منظر پھر گیا۔ ایک دم سے موت کی طرف لے جاتیں درد بھری کراہیں گونج گئیں۔ ٹکڑے ہوتے بچے کا خیال آیا تو پھر مجھے کچھ یاد نہیں رہا' میں نے پوری قوت سے دونوں ہاتھ باندھے اور اس کی ٹھوڑی پر مارے۔

وہ اُوخ کی آواز کے ساتھ اچھلا اور دور جا گرا۔ تب تک بانیتا نے فائر کر دیا تھا۔ باقی وہیں رک گئے۔ مجھ پر جنون سوار ہو گیا۔ اس بے غیرت نے اسے مذہبی لڑائی بنا دینا چاہا تھا۔ میں نے جاتے ہی پاؤں کی ٹھوکر اس کے منہ پر دے ماری اور اس کا ناک کچل دیا۔ وہ ڈکارتا ہوا اٹھنے کی کوشش کرنے لگا تو میں نے اسے گردن سے پکڑ لیا' پھر ایک زوردار ٹکر اس کے منہ پر ماری' وہ نیم پاگل سا ہو گیا۔ میں نے اسے ایک لمحے کا بھی موقع نہیں دیا اور تابڑ توڑ مکے اس کے منہ پر مارے۔ وہ بے ہوش ہونے لگا' شاید کسی کی چیخ بلند ہوئی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی گردن اپنی بغل میں لی اور دونوں ہاتھوں سے مروڑ دی۔ چٹاخ کی آواز آئی اور اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی' میں نے اسے چھوڑا تو وہ یوں گرا جیسے کٹا ہوا درخت گرتا ہے۔ تبھی میں نے باقیوں کو دیکھا اور انہیں اپنی

جانب آنے کا اشارہ کیا۔
اس وقت مجھ پر جنون سوار تھا۔ مجھے لگا یہ بھی سکھ بلوائی ہیں۔ وہ میرے سامنے کھڑے مجھے تذبذب سے دیکھ رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ بانیتا کے پاس اسلحہ ہے ان کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ میں انہیں زیادہ وقت بھی نہیں دینا چاہتا تھا۔ فائر ہو چکا تھا جس کی آواز سے کوئی بھی ادھر متوجہ ہو سکتا تھا۔ پھر اپنے آپ کو بچانا مشکل تھا۔ اس لیے میں نے ایک جست لگائی اور بانیتا کے پاس جا پہنچا۔ اس سے اپنا پسٹل لیا' جس پر سائیلنسر لگا ہوا تھا۔ میں نے پسٹل ان کی طرف سیدھا ہی کیا تھا کہ وہ پلٹے اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس شخص کی لاش وہیں پڑی رہ گئی جو گردن کی ہڈی ٹوٹ جانے کے باعث کچھ دیر پہلے ہی مر گیا تھا۔ میں یہی دیکھ رہا تھا کہ بانیتا نے تیز آواز میں کہا۔
''نکلو یہاں سے۔''
اس کے یوں کہنے پر میں نے ادھر ادھر دیکھا اور اس کے پیچھے تیز تیز قدموں سے چلتا چلا گیا۔ ہم دونوں ایک مصروف سڑک پر آ گئے۔ سامنے ہی آٹو رکشہ کھڑا تھا' ہم اس میں بیٹھ گئے۔ بانیتا ہی نے اسے ملٹی پلیکس سنیما کے بارے میں بتایا تو وہ چل پڑا۔
تقریباً بیس منٹ کی مسافت کے بعد ہم وہاں پہنچ گئے۔ میں باہر ہی کھڑا رہا' وہ ٹہلتی ہوئی اندر گئی اور پارکنگ سے کار نکال لائی۔ میں سکون سے بیٹھا تو وہ چل دی۔
''آج اگر میرے پاس بغیر سائیلنسر کے پسٹل نہ ہوتا تو معاملہ گڑبڑ ہو جاتا تھا' وہ لوگ بھاگنے والے نہیں تھے۔ اس فائر نے انہیں دہشت زدہ کر دیا۔''
''مان لیا کہ ایسا ہی ہوا ہوگا' مگر یہ بتاؤ کہ اس ہیرو کا کیا کرنا ہے' جسے زندہ پکڑا ہے؟'' میں نے پوچھا تو وہ پرسکون انداز میں بولی۔
''ہم ادھر ہی جا رہے ہیں' ممکن ہے رات ادھر ہی گزر جائے۔''
''او کے' اب دھیان سے ڈرائیونگ کرنا۔'' میں نے کہا اور یونہی ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ مجھے کسی تعاقب کا احساس تو نہیں تھا بس ایویں محتاط تھا۔ وہ عام سی سڑک تھی جس پر فٹ پاتھ نہیں تھا۔ اس سے ہم شاہراہ پر چڑھے ہی تھے کہ ہمارے ساتھ دو کاریں جڑ گئیں۔ چند لمحے تو مجھے احساس نہ ہوا اور جب ان کے تیور دیکھے تو سمجھ گیا۔ ''بانیتا! ہمارا تعاقب ہو رہا ہے۔''
''مجھے بھی لگا' میں رفتار بڑھا رہی ہوں اور......''
''رش میں نہ جانا۔'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ لفظ ابھی میرے منہ ہی میں تھے کہ ایک کار نے ہمیں سائیڈ مار دی' وہ سائیڈ دبا کر ہمیں روکنے کی کوشش کرنا چاہ رہا تھا۔ جبکہ یہ اس نے بہت جلدی کر دیا تھا۔ ان کی ایک کار ہمارے آگے ہوتی تو یہ گر آزمایا جا سکتا تھا۔ وہ رفتار بڑھاتی چلی جا رہی تھی۔ بانیتا ڈرائیونگ میں کافی ماہر لگ رہی تھی۔ وہ گاڑیوں کے درمیان سے زگ زیگ کرتی ہوئے نکل رہی تھی۔ یہ بہت خطرناک انداز تھا' سامنے چوراہا تھا۔ جیسے ہی وہ دائیں طرف مڑی۔ وہاں سے دو مزید گاڑیاں ہمارے پیچھے لگ گئیں۔ میں نے صورت حال کی سنگینی کا احساس کرتے ہوئے بانیتا سے کہا۔ ''انہیں ڈاج دے لوگی یا کچھ کریں۔''
''کیا کرو گے؟'' اس نے تیزی سے پوچھا۔
''کچھ بھی' لیکن تماشا لگ جائے گا۔'' میں نے ان گاڑیوں کو تیزی سے دیکھتے ہوئے کہا' وہ مسلسل ہماری سائیڈ دبا رہی تھیں' ایک گاڑی آگے آنے کی کوشش میں تھی۔
''کچھ بھی کرو' وہ ہمیں روک رہے ہیں۔'' اس نے سامنے دیکھتے ہوئے ہذیانی انداز میں کہا۔

''تم ڈرائیونگ پر دھیان رکھنا۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے پسٹل کا بلٹ مارا اور بانیتا کی طرف والی کھڑکی میں سے اس کار کے ڈرائیور کا نشانہ لے لیا جو سائیڈ دبا رہا تھا۔ ٹھک کی آواز کے ساتھ فائر ہوا تو وہ کار ایک دم سے پیچھے رہ گئی اور پھر کئی گاڑیاں لگنے کی آوازیں آئیں۔ ٹائر چرچرائے' ہارن بجے اور شور مچ گیا۔ بانیتا نے راستہ صاف دیکھ کر گاڑی دائیں طرف کی تو میں نے آگے جانے والی کار کے ٹائر کا نشانہ لیا۔ یہ رسک تھا۔ ایک دھماکا ہوا اور کار لڑکھڑاتی ہوئی سڑک کنارے ایک درخت سے جا لگی لمحوں میں وہ پیچھے رہ گئی۔

''ہمیں یہ کار چھوڑنا ہوگی۔'' بانیتا تیزی سے بولی۔

''چھوڑ دو۔'' میں نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''نئی گاڑی آنے تک ہمیں کہیں رکنا ہی نہیں چھپنا بھی ہوگا' یہ انہی کے آدمی ہیں' جسے ہم نے اغوا کیا ہے۔''

''اس کا اتنا بڑا گینگ ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''بعد میں بتاؤں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے کار سڑک کنارے کھڑی کی اور مجھے باہر نکلنے کا اشارہ کر کے ڈرائیونگ سیٹ سے باہر آ گئی۔ ہم بھاگتے ہوئے اندھیرے میں چلے گئے' جسے بہر حال اندھیرا نہیں کہا جا سکتا تھا' وہاں الیکٹرک پول کی روشنی بہت کم تھی۔ سامنے ہی دو بلڈنگوں کے درمیان ایک چھوٹی سی سڑک تھی' ہم اس میں داخل ہو گئے۔ ہم تیز قدموں سے چلتے چلے جا رہے تھے۔ کافی آگے جا کر ایک چھوٹا سا چوراہا تھا' وہاں اچھی خاصی ویرانی تھی۔ ہم اس سے بھی آگے نکل گئے۔ وہ سڑک ایک رہائشی علاقے کے بازار میں جا نکلی۔ تنگ سا وہ روایتی بازار تھا۔ کار سے نکل کر یہاں آنے تک بانیتا اپنے سیل فون سے کئی بار بات کر چکی تھی۔ جس سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہم اس بازار میں داخل ہو کر قدرے پرسکون انداز میں چلتے چلے گئے۔ وہ ایک نسبتاً بڑی سڑک پر ختم ہوئی۔ سامنے ہی ایک سیاہ کار کھڑی تھی۔ بانیتا بھاگتی ہوئی اس میں سوار ہو گئی۔ میں اس کے پہلو میں آ بیٹھا۔

ہمارے سفر کا اختتام ایک ایسے علاقے میں ہوا جو ابھی زیر تعمیر تھا۔ وہ کسی کمپنی کی ہاؤسنگ کالونی تھی۔ جس میں چھوٹے چھوٹے دو منزلہ گھر بن رہے تھے۔ وہ کافی وسیع علاقہ تھا' جس میں بڑے گھر بھی تھے۔ بلاشبہ وہاں مستقبل کے لیے شاپنگ پلازہ بنایا جا رہا تھا' اس کی کئی منزلیں تھیں اور ایسے پلازوں میں تہہ خانے ضرور ہوا کرتا ہے۔ ہم اس کار سے اترے اور میری توقع کے مطابق ایک تہہ خانے میں آ گئے' جہاں کافی روشنی تھی۔ وہ ''ہیرو'' بندھا ہوا ایک کونے میں پڑا تھا۔ بانیتا نے جاتے ہی ایک ٹھوکر اس کی پسلی میں ماری اور بڑے طنزیہ انداز میں کہا

''بول اوئے' تو نے سردار رتن سنگھ کے خلاف سوچنے کی جرات بھی کیسے کی؟''

''اور تو اس کی کتیا' اب مجھ پر بھونکے گی یا پھر مجھے کاٹے گی بھی...... ہاں...... ایسا ہی ہے نا...... آؤ مجھے کاٹو......'' یہ کہتے ہوئے اس نے انتہائی بے ہودہ انداز میں اشارہ کیا' جس سے وہ پاگل ہو گئی۔ وہ اسے مارنے کو لپکی تو میں نے اسے روک دیا۔

''نہیں' بانیتا نہیں' انرجی مت ضائع کرو۔''

میرے یوں کہنے پر وہ رک گئی اور خونخوار نگاہوں سے اسے گھورنے لگی تو وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

''کیوں سالی...... یار کے کہنے پر رک گئی' آؤ نا۔''

''یہ تیری ماں کا یار ہے اور تو۔'' اس نے انتہائی غصے میں کہا تو میں تحمل سے بولا۔

''بس' خاموش'' پھر اس ہیرو کے قریب بیٹھ

کر بولا۔ ''یہ رشتے ناتے بعد میں جوڑنا' پہلے تو یہ بتا جو بانیتا پوچھ رہی ہے۔''

''میرے یوں کہنے پر اس نے اپنی آنکھیں میچتے ہوئے میری طرف دیکھا' پھر بولا۔

''تجھے پہلی دفعہ دیکھ رہا ہوں' تو ہماری دنیا کا نہیں لگتا' کون ہے تو......؟''

''تیری بہن کا یار ہے......'' وہ چیخی' پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔ ''دلجیت' یہ ایسے نہیں مانے گا' کتے کی دم ہے یہ...... مجھے......'' اس نے بے تابی سے کہا تو میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا' پھر ہیرو کی طرف دیکھ کر بولا۔

''میں کوئی بھی ہوں' لیکن اتنا جانتا ہوں کہ بانیتا کے سوال کا جواب تمہیں دینا پڑے گا' تو چاہے مر بھی جائے نا...... تب بھی تیری لاش بولے گی۔''

''تو مجھے ایک دفعہ کھول دے' پھر دیکھتے ہیں لاش کس کی بولتی ہے۔'' اس نے نفرت سے کہا۔

''کچھ دیر پہلے میں نے تجھے دیکھ لیا تھا' ایک لڑکی کے ہاتھوں پٹتے ہوئے۔ میں نے دیکھ لی تھی تیری اوقات' اب بس بول دے۔''

''دلجیت! یہ سالا نرنکاری ہے۔ امرت دھاریوں کے خلاف سب کچھ کرنا' اس کا دھرم ہے۔ اس لیے یہ رتن سنگھ جی کے خلاف ہے۔'' بانیتا جذباتی انداز میں بولی۔

''تو پھر تمہارا سوال غلط ہے۔ تجھے تو اس سے یہ پوچھنا چاہیے تھا کہ یہ کس کا کتا ہے؟''

''ہاں' آج کل یہ کس کا کتا ہے؟'' اس نے سکون سے کہا تو میں نے طویل سانس لی' اسے میری بات کی سمجھ آ گئی تھی۔ یہ کہہ کر وہ اس کے قریب جا کر بیٹھ گئی' پھر بولی۔ ''بول' تو آج کل کس کا کتا ہے۔''

''تو جانتی ہے کہ مجھے رتن سنگھ کو ختم کرنا ہے' اپنے ہاتھوں سے مارنا ہے اسے۔ اب اگر تو نے مجھے نہیں مارا تو میں نے اسے تو مارنا ہے۔''

''زیادہ ہیرو گیری نہ کر میرے سامنے' مال کہاں جانا تھا آج؟''

''اب آئی ہے مطلب کی بات پر۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''یہی بات تجھے پتہ کرنی ہے' لیکن کیا تو نہیں جانتی' دھندے کا اصول کیا ہے۔ رتن سنگھ کیا...... اس کا باپ بھی میرے نیٹ ورک کے بارے میں نہیں جان سکتا۔''

''تو غلط سوچ رہا ہے' صبح تک سب کچھ' تیرا سب کچھ برباد ہو جائے گا' تیرا نیٹ ورک تو کیا' تیرے غیر ملکی آقا بھی ہماری نگاہ میں ہیں۔ کاش تو یہ دیکھنے کے لیے زندہ رہتا۔'' یہ کہتے ہوئے بانیتا نے اپنا پسٹل نکال لیا۔ بہت کم لوگ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال سکتے ہیں' جیسے ہی بلٹ لگنے کی آواز آئی' اس نے چونک کر دیکھا' پھر تیزی سے بولا۔

''جب تجھے سب علم ہے تو میرے ساتھ یہ ڈرامہ کیوں' مجھے وہیں شیڈ میں کیوں نہ گولی ماردی تو نے؟''

''ہاں' اب آیا ہے نا تو لائن پر۔'' بانیتا چہکی۔ ''تو بھی یہ بات جانتا ہے کہ امرتسر میں تیرے جتنے ٹھکانے ہیں' تیرا سارا نیٹ ورک میں جانتی ہوں اور مرنے سے پہلے تو یہ جان لے کہ اگلے چوبیس گھنٹوں میں وہ سب میرے ہوں گے۔ تیرا وہ اسلحہ' تیری وہ منشیات ہمارے لوگوں پر استعمال ہونے والی تھی' اب وہ تمہارے لوگوں پر ہوگی۔''

''یہ صرف تیری بکواس ہے' وہاں لوگ چوڑیاں پہن کر نہیں بیٹھے ہوئے۔'' وہ انتہائی غصے اور بے بسی کے عالم میں یوں بولا جیسے اس بات کا اسے بہت دکھ ہوا ہو۔

''چچ...... چچ...... ہائے......! کاش تم یہ دیکھنے

کے لیے زندہ ہوتے۔ خیر۔! اس پورے علاقے میں اگر راج ہوگا تو صرف سردار رتن سنگھ جی کا اور پھر تیرے جیسے نرنکاری سانپ تو میں ویسے ہی بڑے شوق سے مارتی ہوں۔ اب سن' میں نے جو پوچھنا ہے' اگر تو آرام سے بتادے گا تو پھر تجھے موت بڑے سکون کی ملے گی' بس ایک فائر اور تو پار' نہیں بتائے گا تو تیرا ریشہ ریشہ بولے گا۔ بہت اذیت دوں گی۔" یہ کہتے ہوئے بانیتا نے اس کے بال پکڑ لیے اور انہیں جھنجوڑتی ہوئے بولی۔ "بول' تیرا وہ غیر ملکی آقا کون ہے' تھائی لینڈ کے شہر پتایا میں لوبیسٹر ہوٹل کے کمرے میں' کیا ڈیل ہوئی۔" یہ سوال کرتے ہوئے غصے کی شدت سے بانیتا کی آواز پھٹ گئی تھی۔ تب وہ حیرت کی انتہا پر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"ت...... ت...... تم...... اس کے بارے میں کیا جانتی ہو؟"

"اپنی آزادی کی جنگ گھر بیٹھ کر نہیں لڑی جاتی' آنکھیں اور کان کھلے رکھنے پڑتے ہیں۔ امرتسر ایک پوترا استھان ہے' جہاں تم جیسے بے غیرت آگ اور خون کی ہولی ایک بار پھر سے کھیلنا چاہتے ہو' پہلی بار ہرمندر صاحب پر حملہ سکھوں کی بے خبری میں ہوگیا' ہمیں نہیں معلوم تھا کہ تیرے جیسے نرنکاری بے غیرت' ہندو بنیئے کے ساتھ اس قدر گھٹیا پن پر اتر آئیں گے کہ معصوم لوگوں کا قتل عام کریں گے' اب نہیں' اب ہم جاگ رہے ہیں...... بولو...... بولو ورنہ......" یہ کہتے ہوئے اس نے پوری قوت سے گھونسہ اس کے سینے پر دے مارا۔ وہ کھانسنے لگا۔ "نکال اس سینے میں جو کچھ ہے' نکال......" وہ جنونی انداز میں بولی اور دو چار گھونسے پھر مار دیئے' تبھی وہ کھانستے ہوئے بولا۔

"تو اگر اپنے لیے اتنا جذباتی ہوسکتی ہے تو پھر میں کیوں نہیں...... تو دے اذیت...... میں برداشت کرلوں گا۔" اس نے دانت بھینچتے ہوئے بانیتا کی طرف دیکھ کر کہا یہی وہ لمحہ تھا' جب میں نے آگے بڑھ کر کہا۔

"بانیتا! تم جاؤ اور جا کر اپنے آپریشن کو دیکھو' لوگ اس کے ٹھکانوں پر پہنچ چکے ہوں گے۔ اس پر وقت ضائع نہ کرو' یہ تو ساری رات باتیں کرتا رہے گا' میں دیکھتا ہوں اسے......"

میرے یوں کہنے پر بانیتا نے کہا۔

"تمہارے پاس صرف پانچ منٹ ہیں' ٹھیک کہتے ہو تم...... اسے زیادہ وقت نہیں دینا۔"

میں نے پنڈلی سے بندھا خنجر نکالا' اور اس کے سینے پر ایک لکیر کھینچ دی' خون کی دھار سے خنجر کی نوک لتھڑ گئی' وہ دردناک انداز میں چیخا۔

"مجھے مار دو...... مار دو مجھے......"

"وقت گزر گیا ہے......" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر خنجر کی نوک اس کے گال میں چبھو دی' وہ تڑپنے لگا' چند لمحے اسی طرح خنجر رہنے دیا' پھر نکال کر دوسرے گال میں پیوست کر دیا۔

"ٹکڑے کر دو اس بہن......" بانیتا نے غصے میں غلیظ گالی دی تو وہ چیخ اٹھا۔

"وہ بنکاک کا اسلحہ ڈیلر تھا' امریکہ سے آیا ہے' یہ اسلحہ...... اس میں...... را...... ملوث ہے۔"

"اتنی بڑی کھیپ کیوں آئی؟" میں نے پوچھا۔

"سکھ تنظیموں کے وہ لوگ مارنے ہیں...... جو شدت پسند ہیں۔" اس نے پوری قوت لگا کر کہا۔

"آزادی کے متوالے کہو اوئے بے غیرت۔" وہ جنونی انداز میں چیخی اور اس کی ٹانگوں پر فائر کر دیا۔ اس کی چیخیں حلق میں اٹک کر رہ گئیں۔ وہ بے ہوش ہوگیا۔ تبھی اس نے پسٹل کی نال سیدھی کی اور فائر کر دیا وہ ایک ہچکی لے کر اس جہان سے کوچ کر گیا۔

"ابھی اس سے مزید۔"

"سارا پتہ ہے۔ بس تصدیق چاہیے تھی کہ را ملوث ہے کہ نہیں۔" یہ کہہ کر اس نے وہاں موجود دونوں بندوں سے لاش غائب کر دینے کا اشارہ کیا اور تہہ خانے سے نکلتی چلی گئی۔ اب ہمارا وہاں پر کوئی کام نہیں تھا۔ سامنے گاڑی کھڑی تھی، ہم اس میں بیٹھے اور چل دیئے۔ مین سڑک پر آتے ہی بانیتا بولی۔

"تم یہ جاننا چاہتے تھے نا کہ سکھ حریت پسند تحریکوں میں لڑکیاں اتنی فعال کیوں ہیں؟ تو سنو، سن چوراسی سے چھیاسی تک سکھ قوم پر ہی نہیں، سکھ نوجوانوں پر بہت بھاری تھا، لڑکا، نوجوان اور جوان سب کو ختم کرنے کی پوری کوشش کی گئی۔ وہ لڑکیاں جو آج اٹھائیس سے تیس سال کے درمیان ہیں، انہوں نے اپنے بھائیوں کو مرتے دیکھا، ان کے لاشے دیکھے، ان پر بین کئے ہیں، اب اگر لڑکا گولی چلا سکتا ہے تو لڑکی کیوں نہیں، میں نے اپنے بھائیوں کے لاشے خود دیکھے ہیں۔ جنہیں انڈیا فورس نے مارا، ان بے غیرت بزنکاریوں کی سازش کی وجہ سے۔"

"لیکن نسل آگے بڑھانے کے لیے بچے کون پیدا کرے گا۔" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"بہت ہیں اور بہت پیدا ہو رہے ہیں۔ پہلے یہ خیال تھا کہ بنیئے کا بیٹا پیدا ہوتا ہے تو ایک نئی دکان کھل جاتی ہے اور جٹ کے گھر میں بیٹا پیدا ہوتا ہے تو زمین تقسیم ہو جاتی ہے۔ اب ایسی سوچ نہیں ہے، اپنا وطن خالصتان ہو گا تو زمین بھی اپنی ہو گی۔" اس نے بے حد جذباتی لہجے میں کہا تو میں نے پوچھا۔

"تمہیں نہیں لگتا کہ یہ تحریک سازشوں میں گھری ہوئی ہے؟"

"سازشیں کب اور کہاں نہیں ہوئیں دلجیت۔ ہماری صفوں میں بھی کئی ایسے لوگ ہوں گے، جو ہماری خبر اپنے آقاؤں کو دیتے ہوں گے، جیسے ہمارے لوگ ہمیں "را" کی خبر دے دیتے ہیں۔ تم شاید تصور نہیں کر سکتے ہو، جس قدر ہماری نسل کشی یہاں کی گئی ہے، خیر...... ہم نے تو لڑنا ہے اپنا وطن حاصل کرنے تک، لڑتے رہیں گے۔" اس نے کہا اور پوری توجہ سڑک پر لگا دی۔ حویلی پہنچنے تک ہمیں تقریباً گھنٹہ لگ گیا۔ ایک تو فاصلہ تھا، دوسرا اس وقت ٹریفک اچھی خاصی تھی جو پرانے شہر میں ہی زیادہ تھی۔ پورچ میں گاڑی رکتے ہی وہ بولی۔

"دلجیت تم چلو اپنے کمرے میں، وہیں آتی ہوں میں، فریش ہو جاؤ اس وقت تک۔" اس نے کہا اور اپنا سیل فون نکالتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

اس وقت تک میں فریش ہو کر بیڈ پر پڑا ٹی وی دیکھ رہا تھا، وہاں پر کسی قسم کی کوئی خبر نہیں تھی۔ اب تو یہ ممکن نہیں تھا کہ پولیس یا دیگر فورسز کو معلوم نہ ہو۔ ریلوے شیڈ میں اتنا بڑا ہنگامہ چھپ نہیں سکتا تھا۔ میں یہی سوچ رہا تھا جبکہ میری نگاہیں ٹی وی اسکرین پر تھیں کہ بانیتا اندر داخل ہوئی۔ اس نے سیلولیس ٹی شرٹ کے ساتھ شارٹس پہنے ہوئے تھے۔ پاؤں میں بلیک کلر کی ہلکی سی چپل تھی، یوں لگ رہا تھا کہ جیسے یہ لڑکی بیڈ پر پڑے پڑے تھک گئی ہے اور اکتاہٹ دور کرنے کے لیے اٹھ کر آ گئی ہے۔ وہ بڑی بے تکلفی سے میرے ساتھ بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔ تو میں نے اپنی سوچ کا اظہار کر دیا۔

"یہ خبر ٹی وی چینل پر کیا، کسی اخبار میں بھی نہیں آئے گی۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ جس کام میں "را" ملوث ہو اور وہ خبر نہ دینا چاہیں تو وہ عوام تک نہیں پہنچتی۔ ہم نے جو کیا وہ تو کچھ بھی نہیں، اس کے علاوہ بہت کچھ ہو چکا ہے۔"

"کیا ہو چکا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہماری ہی طرح چار گروپ اور تھے جنہوں نے اس نیٹ ورک کے اڈوں کو تباہ کیا ہے، بہت سارا اسلحہ ہاتھ لگا ہے، جواب تک امرتسر سے باہر نکل چکا ہوگا۔ ہمارے چھ بندے کام آگئے ہیں اور لگتا ہے ایک آدھ اور جائے گا، بہت زخمی ہے وہ، یہ ہم ہی خوش قسمت ہیں کہ ہمیں کچھ نہیں ہوا۔" اس نے یوں کہا جیسے وہ کسی ٹورنامنٹ کے بارے میں بات کررہی ہو، تبھی میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں جو تمہارے ساتھ تھا، اس لیے تمہیں کچھ نہیں ہوا۔"

"بے شک..... تو ساتھ تھا، تیری نشانے بازی بڑی کمال کی ہے دلجیت! رتن بابا یونہی اپنے گرد رتن نہیں رکھتا، اس میں کچھ ہوتا ہے تو ہی قریب آنے دیتا ہے۔ میں نے جان لیا ہے کہ تم میں بہت کچھ ہے۔" اس نے خمار آلود نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا، آخری لفظوں میں اس کے چہرے پر اچھی خاصی سرخی آگئی تھی۔

"اتنا بڑا ہنگامہ ایک رات ہی میں۔" میں نے اس کا دھیان کسی دوسری طرف لگاتے ہوئے کہا۔

"ہوں..... ایک ہی رات میں..... "دراصل ان کی فیلڈنگ تو قریباً تین ماہ سے جاری ہے۔ شری جرنیل سنگھ بھنڈرانوالہ کے مشن کو زندگی دینے کے لیے بہت کام ہورہا ہے۔ اسے بہت زیادہ خفیہ نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ آخر عوام میں بات لانی تھی۔ اب اس بار "را" کو معلوم ہونا ہی تھا۔ انہوں نے بھی اپنی پیش بندی کی ہے اور یہ فقط اسلحہ اکٹھا کرنے کی حد تک نہیں ہے۔ ہر کوئی اپنی اپنی جگہ کام کررہا ہے۔ غیر ملکی لوگ اس میں ملوث ہیں۔ انہوں نے تو اپنا اسلحہ فروخت کرنا ہے۔ صرف پیپسی کوکا کولا کی اجازت مانگنے کے لیے بھارت کو انہوں نے بہت کچھ دیا، تو پھر اسلحے کی بڑی مارکیٹ ہے، خیر..... ایسے میں تمہاری آمد کے بارے میں معلوم ہوا تو ایک دم سے پلان آسان ہوگیا۔ ہمیں ماہر نشانہ باز چاہیے تھا، وہ مل گیا اور وہ مشکل ترین ٹارگٹ آسانی سے مل گیا اور..... " یہ کہتے کہتے وہ رکی پھر بدلے ہوئے لہجے میں بولی۔

"اور اب تم میرے پاس ہو۔"

"وہ تو ہوں اب تیرے پاس، لیکن یہ پلان کیسے کیا؟" میں نے یونہی بات بڑھائی۔

"اصل میں ریلوے شیڈ والا مرکز تھا، وہی سب سے اہم تھا، ہم صرف دونوں وہاں پر نہیں تھے۔ ہمارے ارد گرد لوگ تھے۔ جیسے ہی ہم "ہیرو" کو اغوا کیا، انہوں نے اس جگہ پر دھاوا بول دیا۔ ان کے سارے بندے ہماری طرف متوجہ ہوگئے تھے۔ تم خود سوچو، اگر وہاں ماہر نشانے باز نہ ہوتا تو صورت حال کیا ہوتی۔ بہت زیادہ فائرنگ ہونا تھی اور بندے بہت ضائع ہونا تھے اور پھر جب ان کی گاڑیاں ہم پر چڑھ گئی تھیں..... " اس نے سوچتے ہوئے کہا تو میں نے پوچھا۔

"اور کس طرح کام ہورہا ہے؟"

"مثلاً فلموں کے ذریعے، پنجابی کلچر بلکہ سکھ ثقافت کو سامنے لایا جارہا ہے۔ شاید اس طرف دھیان نہ جاتا، لیکن ان نرنکاریوں نے اپنی فلموں کے ذریعے سکھ عوام کا ذہن بدلنے کی بھرپور کوشش کی ہے اور کررہے ہیں۔ اب امرت دھاریوں کو بھی اس کے مقابلے پر آنا پڑا۔ دراصل نرنکاری یہ چاہتے ہیں کہ سکھوں میں اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے جو لڑنے مرنے کی طاقت ہے جو جذبہ ہے، وہ ختم ہوجائے۔" وہ کہہ رہی تھی اور میں سمجھ رہا تھا کہ جس طرح مرزائیوں کا طبقہ اسی مقصد کے لیے تخلیق کیا گیا کہ وہ جذبہ جہاد کو ختم کرنے کی ایک کوشش تھی۔

انگریزوں کے وفادار مرزائی یہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنے اندر سے جہاد ختم کر دیں۔ اب بھلا یہ ممکن تھا؟
''اب تم دیکھنا' صرف بھارتی پنجاب میں ہی نہیں' پاکستانی پنجاب کے علاوہ پوری دنیا کی مارکیٹ میں ان فلموں کی نمائش ہوگی' اس طرح لٹریچر پر' صحافت میں اور بہت جگہوں پر کام ہو رہا ہے۔''
''اوکے' اب میرا خیال ہے کہ میں بہت تھک گیا ہوں' سونا چاہتا ہوں' تم بھی سو جاؤ۔''
''یار تو واقعی ایسا ہے' یا میرے ساتھ کر رہا ہے۔ تجھے عورت سے دلچسپی نہیں' شراب تم نہیں پیتے' تمہارا کھانا پینا بھی اتنا زیادہ نہیں ہے' جیتے کیسے ہو؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔
''سمجھ لو کہ ان کے استعمال سے پاکیزگی نہیں رہتی' ان کے قریب نہ جانا ہی دراصل میری قوت ہے' آج میں ان کا استعمال شروع کر دوں' کل ایک چوہے کی طرح' مسل دیا جاؤں گا۔'' میں نے یوں سنجیدگی سے کہا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں' پھر بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔
''مطلب' کوئی آتما شکتی کا معاملہ لگتا ہے۔ چل ٹھیک ہے' سو جا' پر مجھے جاگنا ہے۔ جب تک یہ سب معاملہ ختم نہیں ہو جاتا۔''
''اوکے' میری ضرورت ہو تو فوراً جگا لینا۔'' میں نے کہا اور لیٹ گیا۔ وہ اٹھ کر چل دی۔ میں نے بھی لائٹ آف کی اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔
اچانک ہی میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا کمرے کے ملگجے اندھیرے میں کوئی مجھ سے ذرا فاصلے پر کرسی پہ بیٹھا ہوا ہے۔ میں چند لمحے یونہی پڑا رہا' پھر سائیڈ ٹیبل پر پڑا لیمپ روشن کر دیا۔ کمرے میں روشنی ہوگئی۔ سامنے بانیتا بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

''تم سوئی نہیں ہو؟''
''نیند ہی نہیں آئی' ویسے بھی اب صبح ہونے والی ہے اور......'' یہ کہہ کر وہ ڈرامائی انداز میں رکی' میں خاموش رہا تھا تو وہ بولی۔ ''کچھ لوگ آ رہے ہیں رتن سنگھ بابا سے ملنے کے لیے۔ ممکن ہے وہ گھر کی تلاشی بھی لیں۔ اس لیے تمہیں تھوڑی دیر کے لیے' گارڈ یا کوئی اور...... مثلاً ملازم بننا ہوگا' جس نے خاموش رہنا ہے' ہم یہاں سے نکل بھی نہیں سکتے' کیونکہ وہ رات سے حویلی کی نگرانی کر رہے ہیں۔''
''ارے تمہارے لیے تو میں ملازم کیا' ملنگ بن کر بھی گلیوں میں گھوم سکتا ہوں' مجنوں صحرا کی خاک چھان سکتا ہے' رانجھا جوگی بن سکتا ہے' فرہاد......'' میں نے خوشگوار لہجے میں کہا تو وہ ہنستے ہوئے حیرت سے بولی۔
''او خیر تو ہے...... تم ٹھیک تو ہو' نا میں نے تو رات ہی سمجھ لیا تھا کہ تم جوگی ہو' اب کیا ہو گیا۔''
''میں نے خواب میں دیکھا' تم دریا میں غوطے پر غوطے کھا رہی ہو اور ڈوب......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ ہنستے ہوئے بولی۔
''بس کرو...... اور اب اٹھ جاؤ......'' یہ کہہ کر وہ اٹھی اور باہر نکلتی چلی گئی۔
میں پوری طرح تیار ہو گیا تھا۔ میرے ہاتھ میں گن تھی اور میں ڈرائنگ روم کے باہر دروازے پر کھڑا تھا۔ پورچ میں یکے بعد دیگرے کئی گاڑیاں رکیں اور ان میں چند لوگ اندر آ گئے۔ دروازے پر کھڑے گارڈز نے انہیں روک لیا' جہاں ان کی تلاشی لی گئی۔ پھر انہیں آگے آنے دیا گیا۔ وہ میرے قریب سے گزرتے ہوئے اندر چلے گئے۔ تبھی دوسری طرف سے رتن دیپ سنگھ بھی آ گیا۔ ان کے بیٹھتے ہی ایک سفاری سوٹ والے ادھیڑ عمر نے کہا۔

"رتن دیپ سنگھ جی! جب ہمارے درمیان یہ معاہدہ ہو چکا تھا کہ کسی بھی قسم کی کوئی کارروائی سے پہلے ہم دونوں ایک دوسرے کو مطلع کریں گے تو میں اسے کیا سمجھوں۔"

"سمجھنا کیا ہے' معاہدے کی خلاف ورزی تمہاری طرف سے ہوئی ہے۔ اسلحے کی اتنی بڑی کھیپ آئے اور ہماری ناک کے نیچے سے نکل بھی جائے، ایسا کیسے ممکن ہے۔" رتن دیپ سنگھ نے سکون سے کہا۔

"دیکھیں ہم نے کاروبار تو کرنا ہے' اس میں آپ کے کسی بندے کو نقصان نہیں پہنچا' آپ کا کوئی مالی نقصان نہیں ہوا' آپ کاروبار کرتے ہیں' ہم تو کوئی مداخلت نہیں کرتے۔"

"یہ اسلحہ تم نے کن لوگوں کو فروخت کیا ہے؟ اسی سے تمہاری نیت کا اندازہ ہوتا ہے' کن کے خلاف استعمال ہونا ہے' تم اس سے بھی بخوبی واقف ہو۔" رتن دیپ سنگھ نے پرسکون لہجے میں کہا۔ تبھی ایک دوسرے شخص نے کہا۔

"سردار جی! اس کھیپ کی ڈیل تو یہ کررہے تھے، لیکن اس میں ملک کا مفاد ہے۔"

"سیدھا کیوں نہیں کہتے کہ اس میں را بھی ملوث ہے۔ تو یہ را کس کو مارنا چاہ رہی ہے۔ عوام کے ہاتھ میں اسلحہ دے کر آپ کیا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ سیدھے سیدھے فورسز انہیں کیوں نہیں مار دیتی' جیسے پہلے چوراسی میں مارا تھا اور پھر آپ میرے پاس کیوں آگئے ہیں۔ یہ سب سننا......" اس بار وہ سخت لہجے میں بولا تھا تو ایک تیسرے شخص نے رعب دار آواز میں انتہائی بے رخی سے کہا۔

"بانیتا! اور اس کے ساتھ ایک نوجوان' وہ ہمیں یہاں لے کر آئے ہیں۔ انہوں نے قتل کیا' وہ یہیں حویلی میں ہیں' ہم انہیں گرفتار کرنے آئے ہیں۔ ہمارے پاس سرچ وارنٹ ہیں اور......"

"لگتا ہے تم پولیس میں نئے آئے ہو یا تمہارا تبادلہ حال ہی میں یہاں ہوا ہے۔ اگر بانیتا نہ ملی' اور وہ نوجوان' جس کا تم ذکر کررہے ہو' یہاں نہ ملے تو پھر؟" رتن دیپ نے اس قدر اعتماد سے کہا کہ وہ ایک لمحہ کو تذبذب کا شکار ہو گیا۔ تبھی پہلے والا شخص بولا۔

"رتن سنگھ جی' آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہو رہے ہیں۔ شہر میں اتنا بڑا ہنگامہ ہو گیا ہے' ہمیں اوپر جواب دینا ہے' کیا کہیں گے انہیں؟ آپ انہیں ہمارے حوالے کر دیں۔"

"میں یہ کہہ رہا ہوں میرے بھائی کہ میں اس معاملے کو سرے سے نہیں جانتا' کون ہے' کس نے کیا ہے یہ سب؟ آپ بانیتا کے بارے میں کیوں کہہ رہے ہیں۔ وہ دو دن سے یہاں نہیں ہے۔ آپ چاہیں تو حویلی کی تلاشی لے لیں' پھر اس کے بعد کیا ہوگا' یہ تم لوگ جانتے ہو۔ آپ لوگوں نے اوپر کیا جواب دینا ہے' میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اب آپ بتائیں کہ ناشتہ کیا کریں گے۔ انگریزی والا یا......" یہ کہہ کر اس نے سب کی طرف دیکھا تو پولیس آفیسر کے ساتھ بیٹھے ایک شخص نے کہا۔

"دیکھیں سردار جی! ہم رکن اسمبلی ہیں۔ ہم نے سیاست کرنی ہے' اگر ملکی مفاد اس میں شامل نہ ہوتا تو شاید میں ان لوگوں کی بات بھی نہ سنتا' اگر یہ کسی گروپ کی لڑائی ہوتی تو بھی مجھے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ آپ بانیتا اور اس نوجوان کو ہمارے حوالے کر دیں۔ اس نوجوان کے بارے میں شبہ ہے کہ وہ غیر ملکی ایجنٹ ہے' بات اگر بڑھی......"

"تو بڑھنے دیں بات رام دیال بابو! آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں۔ میں نے مانا کہ ہم نے سیاست کرنی ہے' لیکن لاشوں پر یا خون کی ہولی کھیل کر نہیں

کرنی گندی سیاست۔ بانیتا کے بارے میں کہہ چکا ہوں کہ وہ یہاں نہیں ہے تو نہیں ہے' اور میں کسی نوجوان کے بارے میں نہیں جانتا۔" رتن دیپ نے کہا تو وہ سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے' پھر ان میں سے ایک نے کہا۔

"وہ نوجوان غیر ملکی ایجنٹ ہے' اس کے شواہد مل چکے ہیں' وہ یہاں ہی نہیں' مدن لعل کیس میں بھی ملوث ہے' آپ بانیتا کو بچانا چاہتے ہیں تو بچالیں مگر وہ نوجوان ہمیں دے دیں' کچھ تو فائلوں کا پیٹ بھرے گا۔"

"میں نے کہا نا آپ ناشتہ کیا کریں گے۔" رتن دیپ نے بے رخی سے کہا۔

"ٹھیک ہے سردار جی' پھر ہم سے کوئی گلہ مت کیجیے گا۔ آپ نے بھی تو یہیں کاروبار کرنا ہے۔" اس پہلے والے شخص نے اٹھتے ہوئے کہا' جس پر سردار رتن دیپ سنگھ نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ اٹھا بھی نہیں اور نہ ہی انہیں الوداعی کلمات کہے' بس انہیں جاتا ہوا دیکھتا رہا' وہ سارے لوگ میرے قریب سے ہو کر باہر نکلتے چلے گئے۔ کچھ دیر بعد پورچ سے گاڑیاں اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور پھر فضا خاموش ہوگئی۔ میری پوری توجہ ان کی طرف تھی۔ اس لیے مجھے احساس ہی نہیں ہوسکا کہ رتن دیپ سنگھ کب میرے پاس آ کر کھڑا ہوگیا ہے۔ اس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور مسکراتے ہوئے کہا۔

"فکر نہ کرنا' میں جب تک ہوں کچھ نہیں ہوگا۔" اس نے کہا تو میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ مسکراتا ہوا اندر کی جانب چلا گیا۔

⌘ ...... ❀ ...... ⌘

میوزک کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ بانیتا کور انتہائی مختصر لباس میں آگے آگے جارہی تھی۔ اپرلیس شرٹ جو گھٹنوں سے ذرا اوپر تک تھی' سیاہ مگر چمکتی ہوئی' برہنہ پنڈلیاں، سیاہ سینڈل' بال کھلے اور تیز میک اپ کے ساتھ سیاہ چرمی بیگ' وہ امرتسر کا مہنگا بار تھا' جہاں امیر ترین گھروں کے لڑکے لڑکیاں تفریح طبع کے لیے آتے تھے۔ اس وقت بھی وہ بار روم بھرا ہوا تھا۔ نشے میں مدہوش زیادہ تر نوجوان میوزک پر ناچ رہے تھے۔ کچھ لوگ میزوں کے اردگرد بیٹھے ہوئے تھے۔ زیادہ تر جام ہی لنڈھا رہے تھے۔ ہم دونوں ایک خالی میز کے اردگرد بیٹھے ہی تھے کہ انتہائی مختصر لباس والی ویٹرس آن ٹپکی۔ بانیتا نے آرڈر دے دیا۔ یہاں آنے سے پہلے ہم میں یہ طے ہوگیا تھا کہ میں شراب نہیں پیئوں گا اور نہ ہی وہاں پر گوشت سے بنی کوئی شے کھاؤں گا۔ اس کا حل مجھے بانیتا نے یہی بتایا کہ وہ پیتی رہے گی تم صرف سوڈا پینا اور نشے کی اداکاری کرنا' آگے وہ سنبھال لے گی۔ مختلف رنگوں کی روشنیاں تیزی سے حرکت کررہی تھیں۔ بانیتا محتاط نگاہوں سے ہر طرف کا جائزہ لے رہی تھی جبکہ میں کسی تھرڈ کلاس عاشق کی طرح اس کے چہرے پر دیکھ رہا تھا۔ جس وقت ہم کار میں بیٹھ کر حویلی سے نکلے تھے' اس وقت میری نگاہیں اس کے بدن میں الجھ گئی تھیں مگر اگلے ہی چند لمحوں میں خود پر قابو پاتے ہوئے اس سے پوچھ لیا کہ ہم کس مقصد سے باہر جارہے ہیں' جہاں اتنا رسک ہے' ابھی صبح ہی وہ لوگ دھمکیاں دے کر گئے ہیں۔

"یہی تو معلوم کرنا ہے کہ وہ ہم پر ہاتھ ڈالتے ہیں یا آج ہونے والے معاہدے کی پاسداری کرتے ہیں۔"

"معاہدہ......؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"ہاں' رتن بابا اور یہاں کے کرائم کنگ کے درمیان' اس نے را کو ضمانت دی ہے۔ معاہدہ یہ طے پایا ہے کہ وہ عوام میں اسلحہ نہیں پھیلائیں گے اور نہ ہی

کوئی ایسی اشتعال انگیز مہم چلائیں گے جس سے سنگھ شدت پسند بھڑک اٹھیں۔ جبکہ رتن بابا نے انہیں کھلی چھوٹ دے دی ہے کہ اگر وہ چاہیں تو جس شدت پسند کو گرفتار کرلیں لیکن اس ثبوت کے ساتھ کہ وہ بھارت کے خلاف کچھ کررہے ہیں۔"

"مطلب رتن دیپ سنگھ سیاسی اثرورسوخ بھی رکھتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں اسی لیے تو فوراً اس پر ہاتھ نہیں ڈالا گیا۔ اگر ایسا نہ ہوتو اب تک یہ ہندو بنیئے رکے رہیں۔"

"بس اس مقصد کے لیے باہر نکلنا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں! اک پریمی جوڑے کو دیکھنا ہے وہ کیسا ہے ہوسکا تو کچھ دیر ان کے ساتھ گزار لیں گے۔" بانیتا نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

اس وقت وہ اس پریمی جوڑے کو تلاش کررہی تھی۔ ویٹرس ہمارے سامنے کافی کچھ رکھ گئی تھی۔ بانیتا نے اپنے لیے جام بنایا اور مجھے صرف سوڈا ڈال کے دے دیا۔ میرے سامنے سلاد تھا میں وہ کھانے لگا۔ اچانک اس کا چہرہ ساکت ہوگیا اور وہ یک ٹک دیکھنے لگی۔ چند لمحے یونہی دیکھتے رہنے کے بعد بولی۔

"مل گئے وہ جو سرخ اسکرٹ والی لڑکی ہے جس نے بلیک لانگ شوز پہنے ہوئے ہیں شولڈر کٹ بال اور اس کے ساتھ والا لڑکا دونوں ناچ رہے ہیں۔"

"ہاں دیکھ رہا ہوں۔" میں نے ان کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"انہیں اپنا مہمان بنانا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے دوسرا پیگ بھی اپنے گلے میں انڈیل لیا۔ وہ کچھ دیر تک انہیں دیکھتی رہی۔ وہ یہی دیکھنا چاہتی تھی کہ ان کے ساتھ کوئی دوسرا بھی ہے یا نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کھانے پینے کی طرف بھی متوجہ رہی اچانک وہ اٹھی میرا ہاتھ پکڑا اور ان ناچنے والے جوڑے کے درمیان جا پہنچی۔ اس نے مجھے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا تھا۔ یہ دوسرا موقع تھا جب میں نے اس کے بدن پر لگے پرفیوم کی تعریف کی تھی۔ وہ نشے میں تھی اور رومانٹک موڈ کی بھرپور اداکاری کررہی تھی۔ وہ ناچتے ہوئے بالکل ان کے قریب چلی گئی اور ایک دم ان سے ٹکرا گئی جس سے وہ دونوں لڑکھڑا کررک گئے تبھی بانیتا نشے میں لڑکھڑاتی ہوئی بولی۔

"سوری...... سوری...... ویری سوری......" یہ کہتے ہوئے وہ انہیں اٹھانے لگی۔

"کوئی بات نہیں۔" اس لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تب تک میں لڑکے کو اپنا ہاتھ دے چکا تھا وہ میرا سہارا لے کر اٹھ گیا۔ تو بانیتا بولی۔

"نہیں غلطی میری تھی۔"

"اوکے میں نے کہا نا کوئی بات نہیں۔" وہ لڑکی کافی حد تک حیرانگی سے بولی تو بانیتا نے اس کی گردن میں اپنی بانہیں حمائل کرتے ہوئے کہا۔

"تم بہت اچھی ہو مگر میں اس وقت تک مطمئن نہیں ہوں گی جب تک تم میرے ساتھ ایک پیگ نہیں لو گی۔ تم اور تمہارا فرینڈ میرے ساتھ ایک ایک پیگ۔"

"اوکے۔" لڑکی نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا وہ سمجھ گئی تھی کہ سامنے والی نشے میں دھت ہے۔ یونہی نہیں جان چھوڑے گی۔ وہ تینوں بار کی جانب بڑھ گئے اور میں میز پر آ کر بیٹھ گیا۔ میری نگاہیں انہی کی طرف تھیں۔ انہوں نے وہاں سے بوتل لی اور ایک طرف لگے صوفوں پر جا بیٹھے۔ وہ مجھے یوں بھول گئے تھے جیسے میں ان کے ساتھ ہوں ہی نہیں۔ دفعتاً ایک لڑکی میری جانب بڑھی اور بڑے خمار آلود لہجے میں بولی۔

"میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟"

''کیوں نہیں بیٹھو'' میں نے کہا تب تک ویٹرس ہمارے قریب آ گئی۔ اس نے بل رکھا' جسے میں نے ادا کردیا۔ وہ وہاں سے سب کچھ سمیٹ کر لے گئی۔

''کچھ پینے کی آفر نہیں کرو گے؟'' اس نے کمال ادا سے کہا' جس سے بڑے بڑے لڑھک جائیں۔ وہ آدھے سے زیادہ بدن سے برہنہ تھی۔ میں فوری طور پر نہیں سمجھ پایا تھا کہ وہ کون ہوسکتی ہے' پہلا خیال یہی تھا کہ وہ کوئی کال گرل تھی' جو اپنے گاہکوں کی تلاش میں ادھر آ بھٹکی تھی۔ میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم جو کچھ بھی لینا چاہو' لے سکتی ہو' بل میں دے دوں گا۔''

میرے یوں کہنے پر وہ چونک کر میری جانب دیکھنے لگی' جیسے میں نے اس کی توقع کے برعکس کچھ کہہ دیا ہو۔ چند لمحے یونہی بیٹھی رہی' پھر بولی۔

''کیا تمہیں مجھ میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوئی؟''

''نہیں کیونکہ جو شے میری نہیں' میں اس پر نگاہ نہیں رکھتا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بولی۔

''تم دلجیت سنگھ ہو یا جو بھی ہو' بھاگنے کی کوشش مت کرنا' تم نے آج ہی حویلی سے نکل کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ بھاگنا چاہو گے بھی تو بھاگ نہیں پاؤ گے۔ بہت سارے لوگ تیرے انتظار میں اردگرد کھڑے ہیں۔'' اس کے لہجے میں طنز آمیز نفرت تھی۔ تب میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے' نہیں بھاگوں گا' لیکن کیا تم مجھے اپنا تعارف کرانا پسند کرو گی؟''

''ہم اندھیروں کے راہی ہیں مسٹر دلجیت سنگھ' ہمیں خود معلوم نہیں ہوتا کہ ہمارا تعارف کیا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے بالوں کو سمیٹنے کے انداز میں اشارہ کیا۔ میں نے بڑے سکون سے کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

''پھر میری بھی ایک شرط ہے' جب تک تم اپنا تعارف نہیں کراؤ گی' مجھے اپنے ساتھ نہیں لے جا پاؤ گی۔''

''واؤ...... اتنا اعتماد ہے تمہیں خود پر...... اٹھو اور چلو میرے ساتھ ورنہ میرے ایک اشارے پر تیری کھوپڑی میں سوراخ ہوجائے گا۔'' اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''تو لے جاؤ مجھے' اگر تم میں ہمت ہے تو' تعارف کے بغیر تو میں جانے والا نہیں'' میں نے بھی اس کا مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا۔ میرے لبوں پر مسکراہٹ تھی' جو اسے غصہ دلانے کے لیے کافی تھی۔ بلاشبہ اس نے اشارہ کیا تھا' اس لیے دو لمبے تڑنگے نوجوان ہمارے قریب آ کر کھڑے ہوگئے۔ ان میں سے ایک نے میرا بازو پکڑ کر مجھے اٹھانا چاہا' اس نے میرے بدن کو ہاتھ ہی لگایا تھا کہ میں نے اس کی کلائی پکڑ کر زور سے جھٹک دی۔ وہ میز پر گرا' میں نے پوری قوت سے اس کی گردن پر گھونسہ دے مارا۔ تب تک دوسرے نے کھڑی ہتھیلی میرے سر پر ماری جس سے میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے۔ دوسری بار اس نے میرے منہ پر گھونسہ مارنا چاہا تو میں نے بازو سے پکڑ کر اسے بھی میز پر گرا دیا۔ تبھی دونوں ہاتھ باندھے اور اس کی گردن پر دے مارے' وہ اوخ کی آواز کے ساتھ وہیں لڑھک گیا۔ اچانک سامنے سے تین نوجوان تیزی سے بھاگتے ہوئے آئے اور آتے ہی مجھ پر پل پڑے۔ میں نے کرسی چھوڑ دی تھی۔ پھر کرسی کو گھمایا وہ ذرا سا پیچھے ہٹ گئے تو میں نے ایک کو گردن سے پکڑا' جبڑے پر گھونسہ مارا' تب تک میری پسلیوں پر ٹھوکر پڑ چکی تھی۔ ایک نے

مجھے پیچھے سے قابو کیا۔ میں نے اپنا سارا وزن اس پر ڈالا اور اپنی لات گھما کر سامنے والے کو ماری' وہ چھ تھے' چھٹی لڑکی تھی' جو چیخ چیخ کر انہیں ہدایت دے رہی تھی۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا' بار میں ہمارے لڑنے کا شور مچ چکا تھا۔ سیکیورٹی گارڈ ہماری طرف بھاگتے ہوئے آ رہے تھے۔ بلاشبہ انہوں نے یا تو ہمیں اٹھا کر باہر پھینک دینا تھا یا پھر پولیس کے حوالے کرنا تھا۔ میں پولیس کے ہتھے نہیں چڑھنا چاہتا تھا۔ سیکیورٹی گارڈ نے ہمیں الگ الگ کیا اور ہانک کر باہر لے جانے لگے۔ ان کے ہاتھوں میں اسلحہ تھا' جیسے ہی ہم باہر آئے' انہوں نے بغیر کچھ کہے ہمیں سڑک پر دھکیل دیا۔ اب وہ میرے سامنے تھے اور میں اکیلا۔ مجھے بانیتا کی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اب تک کیا کر رہی ہے؟ کیا وہ اب تک نشے میں دھت ہو کر حواس کھو بیٹھی ہے؟ وہ چھ کے چھ میرے سامنے تھے۔ پانچ مرد اور ایک لڑکی' بانیتا اندر ہی کہیں مصروف تھی۔ میری نگاہیں ان حملہ آوروں پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ مجھے گھیرے میں لینے کے لیے دائرہ بنا رہے تھے۔ میں نے لمحے میں سوچا اور الٹے قدموں پیچھے ہٹتے ہوئے دوڑ لگا دی۔ تبھی وہ میرے پیچھے بھاگے۔ میں ایک دم ٹرن لے کر سڑک کے درمیان میں چلا گیا۔ ان میں سے دو میرے برابر چڑھ آئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر وار کرتے' میں آگے بڑھا اور پوری قوت سے گھونسہ ایک کے چہرے پر دے مارا' وہ لڑکھڑایا تب تک دوسرے نے پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھائے تھے' میں نے انہیں پکڑا' اور جھٹک دیئے' وہ منہ کے بل سڑک پر گرا' میں نے پوری قوت سے اس کی گردن پر پاؤں مارا' وہ سڑک سے چپک گیا۔ سامنے والا میری طرف لپکا' میں نے اس کی ٹانگوں کے درمیان پیر مارا' وہ دہرا ہو گیا۔ میں نے اس کی گردن اپنی بغل میں لی اور جھٹکا دیا' ہلکی سی آواز کے ساتھ وہ بے دم ہو گیا۔ میں نے اسے پھینکا ہی تھا کہ وہ چاروں میرے مقابل آ گئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ شاید وہ گاڑی میں سے ریوالور لایا تھا' یا پہلے ہی اس کے پاس تھا۔ اس نے کڑک کر کہا۔

''رک جاؤ' ذرا سی حرکت کی تو گولی مار دوں گا۔''

میں ایک دم سے ٹھٹک گیا۔ اب میرے لیے جائے فرار نہیں تھی لیکن سامنے والے کے ہاتھ میں کھلونا دیکھ کر مجھے ذرا سا اطمینان ہوا تھا۔ میں نے خود پر قابو پایا اور اسی کے لہجے میں بولا۔

''تم کون ہو اور ایسے کیوں بدمعاشی کر رہے ہو؟''

''بہت ہو چکا دلجیت! تم نے بانیتا کے ساتھ بہت موج کر لی' اب ذرا ہمارے مہمان بنو۔'' ان میں سے ایک نے کہا تو میں نے پورے اعتماد سے پوچھا۔

''میں پوچھتا ہوں کون ہو تم؟''

''چور کے چور...... اور سپاہی کے سپاہی...... تمہیں کیا چاہیے؟'' ان میں سے ایک نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میں بتاتی ہوں کہ تم کون ہو؟'' ان کے پیچھے سے بانیتا کی آواز آئی تو انہوں نے چونک کر دیکھا' وہ پسٹل لیے کھڑی تھی' یہی ایک لمحہ تھا میں نے چھلانگ لگائی اور ریوالور والے پر جا پڑا' اس کا ریوالور چھینا تو ہم دونوں سڑک پر جا گرے۔ میں نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی۔ ورنہ ہمیشہ کے لیے وہیں پڑا رہ جاتا' میں نے انہیں کور کر لیا تھا۔ ''دلجیت! انہیں باندھو یا پھر گولی مار دو۔''

بانیتا کے اس ''حکم'' میں یہی تھا کہ انہیں محض ڈرانا ہے' باندھنے یا گولی مارنے کی منطق عجیب سی تھی۔ میں نے ریوالور میں گولیاں چیک کیں' پھر ان کی طرف سیدھا ہی کیا تھا کہ انہوں نے ہاتھ اٹھا دیئے۔

''تمہارے آقا ہمیں ہمارے گھر میں آ کر دھمکیاں دیں اور تم لوگ ہمیں بیچ سڑک پر گھیرو...... اور پھر ہم جانے دیں۔ ارے میں رتن بابا کو کیا جواب دوں گی' یہ کہتے ہوئے اس نے فائر کرنا شروع کر دیا۔ وہ نچلے دھڑ میں گولیاں مار رہی تھی۔ میں نے بھی سڑک پر پڑے دونوں کی رانوں میں گولیاں اتاریں اور بھاگ کھڑا ہوا۔ کچھ فاصلے پر ہماری گاڑی کھڑی تھی' میں نے پچھلا دروازہ کھولنا چاہا تو بانیتا تیزی سے بولی۔ ''آگے...... دلجیت آگے بیٹھو۔''

میں نے دیکھا' پچھلی سیٹ پر وہ جوڑا بے ہوش پڑا تھا۔ جیسے ہی گاڑی چلی تو میں نے پوچھا۔

''یہ کیا ہے؟ کیسے کیا تم نے......؟''

''بس ایک ذرا سی نشیلے پاؤڈر کی چٹکی اور یہ غٹرغوں...... یہ سارے اس کے سیکیورٹی گارڈ تھے۔ میں تو کب کا انہیں لے کر یہاں گاڑی میں ان کے بے ہوش ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔'' یہ کہہ کر وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''یہ سب اس وقت ہوا' جب سیکیورٹی والوں نے تم لوگوں کو دھکے دے کر بار سے باہر پھینکا۔''

''یہ تم نے پلان کیا تھا؟'' میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''جی...... میں نے اور اگر میں تجھے بتا دیتی تو پھر نہ تم ایسے لڑتے اور نہ ہی اس میں فطری پن ہوتا' اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اب ان لوگوں کو پتہ ہی نہیں ہوگا کہ ان پرندوں کو اغوا کس نے کیا ہے؟'' اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تو میں نے مسکراتے ہوئے داد دینے والے انداز میں کہا۔

''واقعی بانیتا! تمہاری کھوپڑی میں شیطان کا دماغ ہے۔''

''لیکن تم ہو کہ میری صلاحیتوں کا فائدہ ہی نہیں اٹھا رہے ہو ظالم۔'' اس نے آنکھ مارتے ہوئے خمار آلود لہجے میں کہا تو میں نے سامنے سڑک پر دیکھتے ہوئے صلاح دی۔

''دھیان سے گاڑی چلاؤ۔''

چونکہ مجھے امرتسر کی سڑکوں کے بارے میں اتنا معلوم نہیں تھا اس لیے خاموشی سے دیکھتا رہا کہ وہ کدھر جاتی ہے' کچھ دیر بعد جب وہ اندرون شہر جانے کی بجائے شہر کے باہر والے راستے پر ہولی تو میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''بانیتا! کدھر کدھر جا رہی ہو' کیا ارادے ہیں؟''

''بابا کے ایک دوست ہیں' ہم ان کے فارم ہاؤس پر جا رہے ہیں اکثر وہیں جاتے ہیں۔ اب پتہ نہیں ان پرندوں کے لیے کتنے دن لگ جائیں۔ سو ہم ادھر رہیں گے۔ انہیں ہم نے اغوا کیا ہے اور اس کے عوض بہت کچھ ان سے لینا ہے۔''

''بہت کچھ...... کتنی رقم......'' میں نے پوچھا تو وہ بولی۔

''اونہیں' بابا! رقم نہیں لینا' کچھ دوسری ڈیل کرنا ہے۔'' اس نے کہا تو میں خاموش رہا۔

تقریباً ایک گھنٹہ مسلسل ڈرائیونگ کے بعد ہم امرتسر شہر سے باہر ویرانے میں آ گئے۔ میرے خیال میں وہ ترن تارن کی طرف جانے والا راستہ تھا' جس سے اتر کر ہم ذیلی سڑک پر آئے تھے' پھر اس کے بعد کافی دیر ڈرائیونگ کے بعد ہم ایک فارم ہاؤس میں جا پہنچے۔ وہ ہمارے انتظار میں تھے۔ پھاٹک کھلا تو وہ پورچ میں نہیں رکی بلکہ آگے چلتی چلی گئی۔ کھیتوں کے درمیان کچے راستے [illegible] جاتے ہوئے اچانک سرکنڈے آ گئے۔ ویران سی [illegible] جنگل ہوا اس کے درمیان درخت اور تین جھونپڑیاں تھیں' وہاں جا کر یہی لگتا تھا کہ جیسے ہم کسی فارم ہاؤس کے درمیان میں نہیں بلکہ کسی جنگل میں آ گئے ہیں۔ ان تینوں

جھونپڑیوں کے پاس اس نے گاڑی جا روکی' پھر ایک طویل سانس لے کر بولی۔

"دلجیت! ان پرندوں کو اتارنے میں مدد کرو۔"

"او کے۔" میں نے کہا اور پہلے لڑکے کو اٹھایا اور اسے جھونپڑی میں ڈالا' پھر لڑکی کو لانے کے لیے مڑا تو اسے بانیتا اٹھا کر لے آئی۔ اس نے آتے ہی جھونپڑی میں موجود لالٹین جلائی' پھر تھیلے سے لائٹ نکال کر بولی۔

"اب ان کا ذرا دھیان رکھنا' میں یہاں قریب ہی گاڑی کھڑی کر کے آئی۔" یہ کہہ کر میری سنے بغیر وہ پلٹ گئی۔ گھاس پھوس اور دھان کی "پرالی" کا ڈھیر تھا' جس پر ان دونوں کو لٹایا ہوا تھا۔ میں ان کے پاس بیٹھ گیا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ ان دونوں کو کیوں اغوا کیا گیا ہے جو مقصد بھی ہوگا سامنے آجائے گا' لیکن ان لوگوں کو چھپانے کے لیے جو جگہ منتخب کی گئی تھی' وہ بہت لاجواب تھی۔ بالکل ہی جنگل کا ماحول لگتا تھا۔ میں اس بندے کی سوچ کو داد دے رہا تھا جس کے ذہن میں ایسا خیال آیا تھا۔ انسان کیسا ہے' چند فٹ کے فاصلے پر یا پھر اگلے لمحے کے بارے میں نہیں جانتا' ایسی ہی اوٹ پٹانگ سوچیں میرے دماغ میں پھر رہی تھیں کہ بانیتا واپس آ گئی۔ اس نے لائٹ کا رخ ان دونوں کی طرف کر دیا۔

"ارے' ان دونوں کو ہوش میں نہیں لائے' تھیلے میں پانی تھا یار۔"

میں نے تھیلا کھولا' اس میں سے پانی کی بوتل نکالی اور پھر ان دونوں کے منہ پر چھینٹے مارے۔ وہ کسمساتے ہوئے اٹھ گئے۔ تبھی لڑکی نے حیرت سے پوچھا۔

"ہم کہاں ہیں؟"

"ہم جنگل میں ہیں اور تم دونوں کو ہم نے اغواء کر لیا ہے۔ چیخنے' چلانے' شور مچانے سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا' بھاگنا چاہو گے تو اردگرد بہت سارے درندے ہیں چیر پھاڑ کر کھا جائیں گے۔ سو' تم وہی کرو گے جو ہم کہیں گے۔ لہٰذا سکون سے سو جاؤ۔" بانیتا نے اسے کہا تو حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ تبھی لڑکے نے پوچھا۔

"کون لوگ ہو تم' اور کیوں کیا ہے ہمیں اغواء؟"

"بچے تمہارا سوال فضول نہیں ہے' تمہیں یہ پوچھنے کا پورا پورا حق ہے لیکن تمہارے ان دونوں سوالوں کا جواب تمہارے باپ کو دینا ہے' بلکہ انہیں بتانا ہے کہ ہم کون ہیں اور تم دونوں کو کیوں اغوا کر لیا گیا ہے۔ اس لیے کوئی سوال مت کرو' سکون سے سو جاؤ۔ نہیں نیند آتی تو اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ وقت گزارو اور اگر دماغ میں کسی قسم کا کیڑا آیا تو میں وہ ریوالور کی گولی سے نکال دوں گی' سمجھے۔" بانیتا نے بظاہر ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا تھا مگر لہجے میں سفاک پن پوری طرح موجود تھا۔ اس نے تھیلے میں سے ٹن پیک سوڈا نکالا اور اس کی طرف پھینک دیا' پھر لڑکی کی طرف اور ایک مجھے دے کر اپنا ٹن کھول لیا۔ تبھی لڑکے نے ٹن واپس پھینکتے ہوئے کہا۔

"اتنا تو میں جانتا ہوں کہ تم لوگ پاپا کو بلیک میل کرو گے' لیکن یہ نہیں جانتے کہ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میں مر گیا' تب تمہاری کوئی......" لفظ ابھی اس کے منہ ہی میں تھے کہ بانیتا نے اپنا ٹن کھینچ کر اس کے منہ پر مارا' جو اس کے ماتھے پر لگا' اس کے ساتھ خون نکل آیا۔

"ارے بھڑوے کی اولاد، تو نے کیا مرنا ہے' میں تجھے خود مار دوں گی' چل اٹھ۔" یہ کہہ کر وہ اٹھی' ریوالور سیدھا کیا تو لڑکی چیخ پڑی۔

''بھگوان کے لیے ایسا مت کرنا دیدی' میں سمجھالوں گی اسے...... آپ پلیز......''

''دیکھ تیری گرل فرینڈ تیرے ساتھ کتنی محبت کرتی ہے' چل سو جا اب، صبح بات کریں گے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے نیا ٹن نکالا اور پینے لگی۔

ہم دونوں جھونپڑی سے باہر نکل آئے۔ ذرا دور اندھیرے میں ایک درخت کے تنے پر بیٹھتے ہوئے میں نے پوچھا۔

''یہ کیا ڈرامہ ہے بانیتا! لگتا ہے لمبی پلاننگ کی ہوئی ہے تم نے؟''

''شاید تمہارے ذہن میں ہو' جس نے صبح بتایا تھا کہ وہ ''را'' ہے' وہ اس لڑکے کا باپ ہے۔ اس بے غیرت نے کچھ جگہوں پر چھاپے مارے ہیں اور اسلحہ سمیت بندے پکڑ لیے ہیں۔ اس کا رتن بابا سے مطالبہ ہے کہ مجھے اور تجھے اس کے حوالے کردے۔ اب سمجھو' سیدھا سیدھا ''را'' کے ساتھ معاملہ ہو گیا ہے۔''

''وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی اور اس کے وسائل ...... رتن دیپ سنگھ' وہ کیا کرپائے گا؟'' میں نے تشویش سے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں' اس نے تو کچھ بھی نہیں کرنا' بس اب مختلف تنظیمیں حرکت میں آئیں گی' اگر ''را'' واقعتاً ان کے ساتھ لڑنا چاہتی ہے تو ٹھیک ہے' ہم تو پہلے ہی حالت جنگ میں ہیں اب ''را'' جو مرضی کرے' وہ جو چنگاریاں اب شعلہ بننے جا رہی ہیں' انہیں آگ لگانے سے کوئی نہیں روک پائے گا۔ اب ہماری منزل صرف اور صرف خالصتان ہے اور بس......'' بانیتا نے یوں کہا جیسے وہ اپنا سب کچھ وار چکی ہے۔

''ان کے ساتھ ڈیل کیسے ہوگی' فون کے ذریعے وہ ہماری لوکیشن کا اندازہ۔'' میں نے کہا تو وہ تحمل سے بولی۔

''ڈیل کہیں اور ہو رہی ہے' ہمیں بس اتنا حکم ملنا ہے' مار دو یا چھوڑ دو' بس......'' یہ کہہ کر وہ تنے پر لیٹ گئی۔ اس کا سر میری ران پر تھا۔ میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ وہ میرے لیے ایک لڑکی نہیں' حریت پسند تھی' آزادی چاہنے والا کوئی بھی ہو' میں اس کی دل سے قدر کرتا تھا۔

''اگر تمہیں نیند آرہی ہے تو تم سو جاؤ' میں جاگ رہا ہوں اور ان کا......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی۔

''مجھے نیند نہیں آتی دلجیت' نجانے کتنے سال ہو گئے ہیں' نیند کو ترس گئی ہوں۔ تیرے سامنے شراب بھی پی ہے' بس خمار سا آتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے۔''

''کیوں ہے ایسا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں جب بھی سوتی ہوں تو میرے خواب میں میرے ویر' میری ماں اور میرا باپو' ان سب کی لاشیں صحن میں پڑی ہوئی دکھائی دیتی ہیں' اور میں ان کے پاس بین کر رہی ہوتی ہوں......'' وہ جذباتی لہجے میں بولی' پھر ایک دم چونکتے ہوئے بولی۔ ''دیکھو وہ (غلیظ گالی دیتے ہوئے) باہر نکلنے کی کوشش کر رہا ہے۔''

میں نے فوراً اس طرف دیکھا تو وہ لڑکا جھونپڑی سے باہر کھڑا محتاط نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا' اسے یہ خیال ہی نہیں تھا کہ لالٹین کی چھنتی ہوئی روشنی اس پر پڑ رہی ہے۔ میں بے آواز قدموں سے بڑھا' وہ لڑکا تیز قدموں سے چل پڑا تھا۔ میں نے پیچھے سے جا کر پکڑ لیا۔ تبھی اس نے ایک زور دار گھونسہ میرے جبڑے پر مارا' بلاشبہ وہ لڑنے کے فن سے آشنا تھا اور پھر اس وقت وہ اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے میری پسلی میں گھونسہ مار دیا۔ میں ایک قدم لڑکھڑا گیا۔ وہ پورے جوش سے میری طرف بڑھا۔ اس نے جھکائی دی اور کھڑا ہاتھ

میرے کاندھے پر مارا۔اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کر سکا۔میں نے اس کی گردن دبوچ لی،پھر یونہی اوپر اٹھا کر زور سے زمین پر دے مارا۔تین چار ٹھوکروں ہی سے وہ ساکت ہو کر رہ گیا۔میں اسے گھسیٹتا ہوا جھونپڑی میں لے آیا۔میں نے تھیلے میں سے رسی نکالی اور اسے باندھ دیا۔لڑکی یہ سب دیکھتے ہوئے تھر تھر کانپ رہی تھی۔میں نے اسے بھی باندھا اور ان کے پاس بیٹھ گیا۔تبھی بانیتا نے اندر آ کر کہا۔

"دلجیت تم سو جاؤ،میں جاگ رہی ہوں۔"

میں وہیں گھاس پھوس پر سیدھا ہوا،پھر کچھ دیر بعد پتہ ہی نہیں چلا کہ میں کہاں ہوں۔

⌘ ❀ ⌘

وہ رات اور اگلا دن گزر گیا۔اس جوڑے کا دم خم نکل چکا تھا۔لڑکی تو پہلے ہی سہمی ہوئی تھی۔لڑکے نے دوپہر کے بعد بانیتا سے مار کھائی تو تب سے پر سکون تھا۔تھیلے میں پڑی خشک خوراک اور بسکٹ کھاتے ہوئے وہ دن گزر رہا تھا۔اس وقت مغرب ہونے کو تھی،اندھیرا آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا۔جب بانیتا کا فون بول اٹھا۔اس نے اسکرین پر نمبر دیکھے،پھر اسپیکر آن کر کے بولی۔

"ہوں،بولو کیا بات ہے؟"

"ان دونوں کو چھوڑ کر تم لوگ آ جاؤ،لیکن حویلی میں نہیں۔" کسی مرد نے بھاری آواز میں کہا۔

"خیریت تو ہے نا......ڈیل......؟" اس نے پوچھا۔

"ہو گئی ہے،سب بندے آ گئے ہیں،پر اسلحہ نہیں،وہ سب رتن بابا کے پاس بیٹھے ہیں۔ظاہر ہے انہوں نے حویلی کے باہر کیا،پورے شہر میں فیلڈنگ کرنی ہے۔اس لیے تم لوگ نکلو،ان پرندوں کو دوسرے لوگ ترن تارن میں چھوڑ دیں گے۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"او کے،بندے بھیجو۔" بانیتا نے کہا اور فون بند کر دیا۔پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔"لے بھئی دلجیت ہمارا یہ آپریشن کامیاب رہا،لیکن اس سے بڑھ کر ہمارا حویلی جانا کسی مشن سے کم نہیں ہے۔"

"مگر وہ تو کہہ رہا ہے کہ حویلی نہیں......" میں نے پوچھا تو وہ ہنس دی۔

"تم دیکھنا ہم حویلی ہی جائیں گے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھی اور کچھ دور پڑے ان دونوں کے پاس چلی گئی۔کچھ دیر ان سے باتیں کرتی رہی،تبھی دو،نوجوان آتے ہوئے دکھائی دیئے۔بانیتا نے مجھے چلنے کا اشارہ کیا۔ہم وہاں سے پیدل چلتے چلے گئے۔یہاں تک کہ ایک شیڈ کے تلے کھڑی گاڑی تک جا پہنچے۔یہ وہ نہیں تھی جس پر ہم آئے تھے بلکہ دوسری تھی،جس پر امرتسر شہر کے مضافات میں پہنچتے ہوئے ہمیں کافی رات ہو گئی۔

ہم بڑے سکون سے باتیں کرتے ہوئے آئے تھے۔جس میں ایک بات جو میرے ذہن میں کھٹک رہی تھی،وہ یہ تھی کہ جب "را" کو معلوم ہو گیا ہے کہ یہ ساری کارروائی کے پیچھے رتن بابا ہے تو پھر اب تک وہ اس پر ہاتھ کیوں نہیں ڈال رہے تھے،یہی بات جب میں نے بانیتا سے پوچھی تو وہ بولی۔

"را کو تو بہت دیر سے معلوم ہے اور میری فائل تیار ہے،لیکن وہ اس لیے ہاتھ نہیں ڈال رہے کہ رتن بابا کوئی ایک خاص تنظیم سے تعلق نہیں رکھتا۔اس کے پیچھے بہت ساری تنظیمیں ہیں،رتن بابا کو وہ چھیڑیں گے انہیں ختم کر دیں گے یا جیل بھیج دیں گے تو اس کی جگہ کوئی دوسرا رتن بابا آ جائے گا۔کام تو چلے گا،لیکن اس دوران ان کا کتنا نقصان ہو گا،وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔" اس نے بڑے جذباتی انداز میں کہا

تو میں خاموش ہوگیا۔ ہر بندہ کوئی نہ کوئی ذاتی مفاد رکھتا ہے کون کیا ہے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

ہماری منزل ایک دومنزلہ پرانا سا گھر تھا' جس کو اچھی طرح سجایا سنوارا ہوا تھا۔ بانیتا نے کار باہر ہی کھڑی رہنے دی اور ہم اندر چلے گئے۔ اس گھر میں کافی سارے لوگ تھے۔ پورا خاندان آباد تھا۔ ہم کچھ دیر ان کے پاس رہے' پھر ایک کمرے میں چلے گئے جو قدرے ہٹ کر آخری سرے پر تھا۔ وہ کمرہ پرانی چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔ بانیتا نے کچھ چیزیں ادھر ادھر کیں' پھر فرش کو دبا کر ریلنگ والا ڈھکنا اندر کی طرف کر دیا۔ وہاں ایک خلا بن گیا۔ مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے وہ نیچے اتر گئی۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر زیرو پاور کے بلب روشن تھے۔ ہم سیڑھیاں اتر کر سرنگ میں چلتے چلے گئے۔ تقریباً فرلانگ بھر چلے ہوں گے کہ ہمیں سیڑھیاں دکھائی دیں' اس پر چڑھے اور ایک کمرے میں نکل آئے۔ وہ حویلی ہی کا ایک کمرہ تھا۔

''مطلب...... وہ گھر حویلی کے پچھواڑے تھا؟''

میں نے تصدیق چاہی تو بانیتا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں اپنے کمرے میں گیا' فریش ہوا اور لمبی تان کر سو گیا۔

اس صبح میں معمول کے مطابق جلدی اٹھ گیا۔ میں خوب جی بھر کے فریش ہوا' سفید کرتا اور پاجامہ پہنا۔ میں صوفے پر بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ حویلی کے ملازمین میں سے ایک نے آ کر مجھے بتایا کہ اوپر چھت پر رتن دیپ سنگھ میرا انتظار کر رہا ہے۔ میں فوراً ہی اٹھ گیا۔ میں جب وہاں پہنچا تو رتن دیپ سنگھ کے ساتھ ایک اور بوڑھا سکھ بیٹھا ہوا تھا جو مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ سامنے میز مختلف کھانوں سے بھری پڑی تھی۔ میں ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ تب رتن دیپ سنگھ نے پرشوق نگاہوں سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''دلجیت سنگھ جی' یہ ہمارے بہت ہی محترم گیانی پرونت سنگھ جی ہیں۔ یہاں بڑی مدت بعد تشریف لائے ہیں' جب میں نے تمہارے بارے میں بتایا تو بڑے شوق سے ملاقات کرنا چاہی۔''

''آپ کے لیے محترم ہیں تو میرے لئے بھی سر آنکھوں پر' میں حاضر ہوں جی۔'' میں نے ادب سے کہا تو اس نے اپنا ہاتھ اٹھا کر مجھے دعائیں دیں' پھر بولے۔

''انسان' گیان' دھیان' بھگوان اور نروان...... یہ سب ایک مالا میں سمجھو موتی' جس کے آخری سرے پر پہلا سرا آن ملتا ہے۔ پہلا اور آخری سرا ملتا ہے تو سمجھی ایک ہو جاتا ہے۔ بندہ رب رب کرتا ہے' جبکہ رب اس کے پاس ہوتا ہے۔ رب کو پانے کے لیے اپنی تلاش کرنا پڑتی ہے' واہ گورو کی مہر ہے تم پر' تیرے مقدر کا ستارہ بڑے عروج پر ہے۔ تو بھی کسی گیانی سے کم نہیں۔''

''باباجی! مجھے تو ان باتوں کی سمجھ ہی نہیں ہے' کہاں میں اور کہاں گیان' شاید وقت نے مجھے انسان بننے کی بھی مہلت نہیں دی۔ ورنہ یوں درندوں کی طرح دنیا کے اس جنگل میں نہ بھٹکتا۔'' میں نے اپنی طرف سے بڑی عاجزی سے کہا۔

''جو چیز جتنی نایاب ہوتی ہے' اتنی ہی مشکل سے ملتی ہے' بڑی شے چھوٹے برتن میں تو نہیں سما سکتی نا۔ تم نہ سمجھو' لیکن سمجھانے والے تو تجھے سمجھا رہے ہیں۔ تیرا وقت شروع ہو گیا ہے۔ اب دیکھتے ہیں کب تو نچاتے نچاتے خود ناچنے لگتا ہے۔'' گیانی نے یہ لفظ کہے تو مجھے روہی کے بابا یاد آ گئے جنہوں نے مجھے قلندر ہونے کے بارے میں کہا تھا۔ میں چونک گیا'

کچھ کہنا چاہا تو گیانی مسکرا کر بولے۔ ”ارے بیٹا! ابھی تجھے نچانا نہیں آیا' ابھی تو خود ناچنا سیکھ رہے ہو' پھر کہیں جا کر نچاؤ گے' اور پھر تیرا رقص شروع ہو گا اور رقص بھی ایسا کہ تیرا اپنا لہو گواہی دے گا' اس زمین پر اپنا نشان ثبت کرے گا۔ کیونکہ شہید کا لہو جب تک زمین پر نہیں گرتا' گواہی مکمل نہیں ہوتی۔“ گیانی نے انتہائی جذب میں کہا تو میں پھر بات نہیں کر سکا۔ وہ شاید مستقبل کی پیشگوئی کر رہا تھا' یا پھر کوئی اور ہی اشارے دے رہا تھا۔ میں خاموش رہا تو وہ بولا۔

”چلو، میں تمہیں ایک دوسری بات سمجھاتا ہوں' ہرمندر صاحب' واہ گورو کی مرضی ہے' اس کا پوتر استھان ہے' لیکن لاہور سے بلایا گیا، حضرت میاں میر بالا پیر کو، انہوں نے سنگ بنیاد رکھا' اینٹ جان بوجھ کر الٹی رکھی۔ پتہ ہے تمہیں اس واقعے کا؟“

”جی معلوم ہے۔“ میں نے ادب سے کہا۔

”ہوا یوں کہ مستری نے جلدی سے وہ اینٹ اکھاڑ کر سیدھی کر دی۔ جس پر گرو ارجن نے بہت افسوس کیا کہ اب یہ ہرمندر بنتا ہی رہے گا، اب اس کے جتنے بھی معنی نکلیں' میری سمجھ میں ایک بات آتی ہے' اس خطے میں' سکھ اور مسلمان ہی وہ قومیں ہیں جو ایک رب کو مانتی ہیں۔ مسلمان کہتا ہے اللہ واحد' اس کا کوئی شریک نہیں' سکھ کہتا ہے' اک اونکار بس رب ہی ہے۔ گرو کو تب پتہ تھا کہ آنے والے وقت میں سکھوں کو مسلمانوں کی مدد کی ضرورت رہے گی۔ ان کے بغیر نہیں چل سکتے۔ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو انہی سکھوں کی وجہ سے ہو گی۔ اور وقت نے ثابت کیا۔ تقسیم مسلمان نہیں ہم ہوئے ہیں۔ جنم استھان پاکستان میں تو ہرمندر صاحب' بھارت میں۔ اس میں سراسر بے وقوفی اس دور کے سکھ لیڈروں کی تھی۔ جب تک سکھ، مسلمان کے ساتھ مخلص نہیں ہو گا' تب تک اس پر یونہی عتاب نازل ہوتا رہے گا۔ یہ واہ گرو کی مرضی ہے۔ یہاں بھارت میں سکھوں نے قتل عام کیا' کسی نے پوچھا تک نہیں' پاکستان میں کسی سکھ کو کوئی نقصان نہیں ہوا' حالانکہ مہاجرین کے ساتھ جو سلوک سکھوں نے کیا' اس کی نفرت تیسری نسل تک منتقل ہو چکی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحے خاموش رہا' پھر رتن دیپ سنگھ کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”بابا' یہ تیرا مہمان ہے' سیوا کر اس کی۔ اور جو تیرا دل کرتا ہے کر یہاں' تیری طرف کوئی ٹیڑھی آنکھ سے دیکھے گا بھی نہیں۔“

”میں نے کیا کرنا ہے جی' گرو جو حکم دیں گے۔“ رتن دیپ نے احترام سے کہا تو وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔

”جمال پتر! کوئی بات پوچھنی ہے تو پوچھ لے مجھ سے۔“ گیانی نے گہری سنجیدگی سے کہا تو میں ایک لمحے کے لیے چونک گیا۔ کیا رتن دیپ نے اسے میرا نام بتا دیا تھا۔ میں نے رتن دیپ سنگھ کی طرف دیکھا تو اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ تبھی ان لمحات میں مجھے خیال آیا کہ میں ان سے جلیانوالہ باغ اور امرتسر جنکشن پر ہونے والی کیفیت کے بارے میں پوچھ لوں' لیکن نجانے کیوں لفظ منہ پر آتے ہی رک گئے۔ میں باوجود کوشش کے اس سے پوچھ ہی نہیں سکا۔ اتنے میں بانیتا آ گئی۔ اس نے ہلکے کاسنی رنگ کی شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی' آنچل گلے میں تھا' اسی رنگ کا جوتا' کھلے بال اور حسب معمول میک اپ سے بے نیاز چہرہ۔ اس نے آتے ہی فتح بلائی اور بڑی بے تکلفی سے میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی تو رتن دیپ نے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ کھانے کے بعد جب برتن اٹھا دیئے گئے تو پھر سے گپ شپ ہونے لگی۔ رتن دیپ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہاں بھارت میں پنڈت اور پروہت جو

طاقت رکھتے ہیں، شاید ہی کوئی ان جیسی طاقت رکھتا ہو۔ بڑے سے بڑا سیاست دان، بزنس مین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ، ان کی آشیرواد کے بغیر کچھ نہیں کرتے۔ ان میں سے بہت سارے جرم کی دنیا کے ڈان ہیں۔ جیسے ممبئی میں بال ٹھاکرے ہے اور اس جیسے ہر شہر میں موجود ہیں جنہیں میں ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ بھارتی خفیہ ایجنسی ''را'' ہو یا کوئی دوسری خصوصی فورس ہو، کسی بھی شعبہ کی خفیہ ہو، ان میں تین طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں، ایک وہ جو خود جرائم پیشہ ہیں اور انہی ڈان کے آلہ کار ہیں، دوسرے وہ جو صرف پیسہ اور طاقت کی زبان سمجھتے ہیں اور تیسری قسم محب وطن لوگوں کی ہے جو اپنے پیشے سے مخلص ہیں۔ یہ تیسری قسم بہت کم ہے، ایودھیا کا واقعہ ہو یا گجرات کا۔ یہ پہلی اور دوسری قسم کے لوگوں کی وجہ سے ہوا۔ یہ ساری تمہید میں نے اس لیے باندھی ہے کہ تمہیں بتا سکوں کہ یہاں رہتے ہوئے تم نے جو کچھ کیا ان میں محب وطن کم اور ڈان لوگ زیادہ شامل ہیں۔ جرم کی یہ دنیا فقط اس ملک تک نہیں، پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ خیر، ایسا ہی ایک آشرم اس شہر میں بھی موجود ہے۔ جس کا سربراہ ایک پنڈت ہے، یوگی مشہور ہے، اس کا گروہ، پنجاب میں پھیلا ہوا ہے، منشیات سے لے کر اسلحہ پھیلانے تک اور لڑکیوں کی اسمگلنگ میں ان کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔''

''کیا کرنا ہے اس کے ساتھ۔'' میں نے اتنی طویل تمہید سے اکتاتے ہوئے پوچھا۔

''اس کے سارے نیٹ ورک کی تفصیل بانیتا کے کمپیوٹر پر ہے، وہ وہاں سے سمجھ لینا۔ اس پنڈت کے خفیہ رازوں تک پہنچ کر اس کا راز فاش کرنا ہے اور اس کی اصل طاقت دو لوگ ہیں، انہیں ختم کرنا ہے، وہ ویسے ہی ختم ہو جائے گا۔'' رتن دیپ سنگھ نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے پوچھا۔

''کیا وہ سکھوں کے خلاف ہی کام کر رہے ہیں یا؟''

''یہی، ہمارے لیے یہی اہم نکتہ ہے۔ وہ جرم کی دنیا میں بہت کچھ کرتے چلے جا رہے تھے، لیکن ہم نے انہیں کچھ نہیں کہا لیکن اب پورے پلان کے ساتھ، جس میں ''را'' کی پوری آشیرواد شامل ہے۔ وہ سکھوں کے خلاف کام کر رہے ہیں۔ مختلف جگہوں پر چھوٹے چھوٹے اڈے بنا کر انہیں جنسی ماحول فراہم کیا جاتا ہے اور وہیں سے سکھ لڑکیوں کو ورغلایا جاتا ہے۔ ان میں نرنکاری سکھ پوری طرح ملوث ہیں۔'' اس نے تفصیل بتا دی تو میں نے بانیتا کی طرف دیکھ کر کہا۔

''چلو دکھاؤ تفصیل کیا ہے، پھر پلان کرتے ہیں۔''

''پلان تو میں نے کر لیا ہے، مزید تم بتا دینا، آؤ، میں تمہیں دکھاتی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گئی۔ تو میں بھی اس کے ساتھ اٹھ گیا۔

میں پہلی بار اس کے کمرے میں گیا تھا۔ کمرے کی ترتیب اور سجاوٹ دیکھ کر میں اس کی نفاست کا قائل ہو گیا۔ وہ لیپ ٹاپ کھول کر بیڈ پر بیٹھ چکی تھی اور میں اس کے ساتھ بیٹھ کر اسکرین پر نگاہیں گاڑے ہوئے تھا۔ آشرم کی پوری تفصیل بتانے کے بعد اس نے ایک تصویر دکھائی۔ جس میں ایک بوڑھا سفید ریش، مونچھیں اور لمبے بالوں اور سرخ چہرے والا دکھائی دیا۔ اس کے گلے میں مالائیں اور پیلے رنگ کی چادر اوڑھے ہوئے تھا۔

''یہ پنڈت دیا رام ہے، اس آشرم کو چلانے والا اور مالک۔'' یہ کہہ کر اس نے دوسری تصویر دکھائی۔ ''یہ پرکاش بادل عرف بجوا ہے۔'' تیسری تصویر دکھاتے ہوئے بولی۔ ''یہ دپیکا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے لیپ ٹاپ ایک طرف رکھا اور بولی۔ ''یہی تکون ہے، جس پر یہ

آشرم چل رہا ہے۔ یہ تینوں بہت سفاک ہیں اور.....''
''پلان کیا ہے تمہارا؟'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔
''پرکاش اور دیپکا کو اڑا دیا جائے۔ یہ دونوں آشرم سے باہر ہوتے ہیں زیادہ تر' اندر کا انتظام دیپکا کے ذمے ہے اور باہر کا پرکاش دیکھتا ہے۔'' وہ پوری سنجیدگی سے بولی۔
''اب تک کیوں نہیں اڑا سکے انہیں۔''
''یہ ہتھے ہی نہیں چڑھتے' صاف بات یہ ہے' تینوں اکٹھے نہیں ہوتے' فون پر رابطہ ہے' ایک کو ماریں گے تو باقی الرٹ ہو جائیں گے۔ پھر ابھی تک براہ راست تو ٹکراؤ نہیں تھا۔ اب پتہ چلا کہ اسلحے کی اس ساری گیم کے پیچھے ان لوگوں کا ہاتھ ہے۔ وہ رتن بابا کو ٹریپ کرنا چاہ رہے تھے۔ اب تو انہیں مارنے کا حق بنتا ہے۔'' اس نے کہا تو میں چند لمحے سوچتا رہا پھر مسکراتے ہوئے بولا۔
''تم ایسے کرو' جاؤ کچن میں اور چائے بنا کر لاؤ اپنے ہاتھوں سے' اٹھو۔''
''تمہیں چائے چاہیے نا' وہ ابھی آ جاتی ہے۔'' اس نے حیرت سے کہا۔
''میں تمہارے ہاتھ کی پینا چاہتا ہوں' لیکن خدارا ابھی اس میں زہر مت ملانا' میں ابھی تمہارے بہت کام آنے والا ہوں۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ زیر لب گالی بکتی ہوئی اٹھ کر چلی گئی۔ میں نے لیپ ٹاپ اٹھایا اور دوبارہ آشرم سے متعلق جو فلمیں تھیں وہ دیکھیں' ایک نقشہ تھا' اسے سمجھا اور پھر نیٹ کھول کر اپنا ای میل باکس دیکھا۔ روہی کی طرف سے کچھ نہیں تھا۔ میں نے اسے بند کیا تو وہ چائے لے کر آ گئی۔
''یہ لو' اس چائے میں خلوص بھی شامل ہے' ہمارے رسوئیے کا۔''
''مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ تم سے ڈھنگ کا کوئی کام نہیں ہوگا۔ اب یہ چائے تم پیئو۔'' میں نے کہا اور اٹھتے ہوئے بولا۔ ''تیار ہو کر میرے کمرے میں آ جانا' دیارام کے آشرم چلیں۔''
''ابھی۔'' اس نے حیرت سے پوچھا۔
''ہاں' ابھی۔'' میں نے کہا اور باہر نکلتا چلا گیا۔
دوپہر ڈھل رہی تھی جب ہم جالندھر روڈ پر موجود آشرم جانے والی سڑک پر مڑے۔ حویلی سے چلتے وقت میں نے بانیتا کو پلان بتا دیا اور جو ضروری مدد چاہیے تھی اس کا اظہار بھی کر دیا۔ سو دو گھنٹے کے اندر اندر سارا انتظام ہو گیا تھا۔ پکی سڑک آشرم کے بڑے گیٹ پر ختم ہوئی جہاں سے دائیں اور بائیں سڑکیں نکلی تھیں۔ سفید رنگ کے گیٹ پر کوئی دروازہ نہیں تھا۔ اس کے اوپر ہندی میں بڑا سا ''اوم'' لکھا ہوا تھا۔ گیٹ کے باہر پارکنگ تھی' جس پر ایک بندہ موجود تھا۔ بانیتا نے گاڑی پارکنگ میں لگائی اور پھر اتر کر اندر کی طرف بڑھ گئے۔ وہ خاصی بڑی عمارت تھی' جس کے کئی حصے تھے۔ تھوڑا چلنے کے بعد ایک چھوٹا سا فوارا تھا' جس کے گرد سڑک گھومتی تھی اور وہیں سے چاروں طرف چھوٹی سڑکیں جاتی تھیں۔ ایک طرف یتیم خانہ تھا' ہاسٹل تھا لڑکیوں کا' چھوٹا سا اسپتال تھا' رہائشی حصہ اور پھر دیارام کی اصل عمارت تھی۔
ہال نما کمرے میں کافی سارے لوگ موجود تھے۔ جن میں نوجوان لڑکیاں سیوا کے لیے پھر رہی تھیں۔ دراصل وہ وہاں کی سیکیورٹی گارڈ تھیں۔ دروازے کے ساتھ ہی ایک کاؤنٹر تھا جس پر دیارام سے ملنے کی وجہ لکھوائی جاتی تھی اور نمبر الاٹ ہوتا تھا۔ طریقہ یہی تھا کہ لوگ یہاں سے آڈیٹوریم میں جاتے' جہاں دیارام کا لیکچر ہوتا تھا اس دوران جن

لوگوں کو ملنے کی اجازت ہوتی' انہیں چٹ دے دی جاتی' وہ وہاں رک جاتے' اور اپنی باری پر دیارام سے ملتے۔ آشرم میں صرف ایک جگہ پر سیکیورٹی گارڈ چیک کرتے تھے۔ وہ بھی اس ہال کے باہر' باقی ہر جگہ سی سی کیمرے لگے ہوئے تھے۔ آشرم میں ہونے والی ذرا سی ہلچل بھی کہیں نہ کہیں مانیٹر ہو رہی تھی۔ ہم نے سارا جائزہ لے لیا تو بانیتا اطمینان سے بولی۔

"کیا خیال ہے آپریشن ہو جائے گا؟"

"کیوں نہیں ہوگا' بس تمہارا رابطہ باہر سے ہونا چاہیے' نکلنے کا راستہ ہموار ہو۔" میں نے تیزی سے کہا تو وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

"اس کی فکر نہ کرو' وہ ہو جائے گا' سب تیار ہے۔"

"تو بس' میرے باہر آنے کا انتظار کرنا' نہ آ سکا تو خاموشی سے واپس چلے جانا۔" میں نے کہا تو وہ ایک دم سے فکر مند ہو گئی۔ پھر لرزتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو دلجیت' تم آؤ گے اور ضرور آؤ گے......"

"زندگی اور موت کوئی بھی لکھوا کر نہیں لایا میری جان' میری موت اگر یہاں لکھی ہے تو کوئی نہیں ٹال سکتا' اور اگر نہیں لکھی تو کوئی مار نہیں سکتا۔ میں اگر مر گیا تو خود کو مصیبت میں مت ڈالنا۔" میں نے آہستگی سے کہا اور ارد گرد لوگوں کو تکنے لگا۔

"اگر چٹ تمہارے نام نہ نکلی تو پھر میں' یا اگر دونوں کے نام نہ نکلی تو......"

"تو اس میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں' میں سنبھال لوں گا' بس تم باہر کا خیال رکھنا۔" لفظ میرے منہ ہی میں تھے کہ آڈیٹوریم میں جانے کا اعلان ہونے لگا۔ ملحقہ آڈیٹوریم میں سکون سے بیٹھنے کے بعد ماحول کا جائزہ لیا۔ کافی سارے لوگ تھے۔ سامنے اسٹیج پر بیٹھنے کی جگہ تھی۔ ریکارڈنگ کے

لیے جدید آلات کا استعمال تھا، کچھ دیر بعد دیارام چند لڑکیوں اور لڑکوں کے جلو میں اسٹیج پر نمودار ہوا۔ اس نے سفید رنگ کی دو چادریں اوڑھی ہوئی تھیں ایک دھوتی کی صورت میں اور دوسری کاندھوں پر پھیلائی ہوئی تھی۔ سفید بالوں میں آدھے سے زیادہ چہرہ چھپا ہوا تھا، وہ دونوں ہاتھ جوڑے ہوئے چند لمحے کھڑا رہا، پھر بیٹھ کر بھاشن دینے لگا۔ تقریباً بیس منٹ بعد وہ بھاشن ختم ہو گیا۔ دیارام اٹھ کر اندر چلا گیا۔ ہم دونوں کو ملاقات کی پرچیاں مل گئیں۔ ہمیں آدھے گھنٹے سے زیادہ انتظار کرنا پڑا، میری باری آئی تو دروازے پر موجود سیکیورٹی گارڈ نے مجھے ڈی ڈیکٹر لگا کر چیک کیا اور پھر میں اندر چلا گیا۔ وہ سامنے ایک گدے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے آس پاس سفید، سبز اور نارنجی پھولوں کے گلدستے پڑے ہوئے تھے۔ اندر کا ماحول خنک تھا، خوشگوار مہک تھی اور روشنی کافی حد تک دھیمی تھی۔ میں اس کے سامنے جا کر بیٹھا تو اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا سمسیا ہے بالک......؟''

''دیارام جی، کیا آپ نے راجیو گاندھی کے قتل کے بارے میں سنا ہے وہ کیسے ہوا تھا؟'' میرے یوں کہنے پر اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ایک دم سے اس کی آنکھوں میں قہر اتر آیا، لال بھبوکا چہرے کے ساتھ اس نے مجھے دیکھا اور پھر غصے میں لرزتی ہوئی آواز کے ساتھ بولا۔

''کیا مجاق کرتے ہو......''

''میں مذاق نہیں کر رہا دیارام جی، شاید آپ کو نہیں معلوم، مگر میں بتا دیتا ہوں اسے بم سے اڑایا گیا تھا۔ وہ ایسا بم تھا، جسے سیکیورٹی والے بھی نہیں پکڑ سکے تھے اور نہ اس بم کو کوئی آلہ پکڑ سکا تھا، بالکل ایسے بم تھے وہ۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی جیکٹ دونوں ہاتھوں سے کھول دی۔ اس نے اضطراری حالت میں دیکھا اور پھر خوف سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ایک دم سے اس کا چہرہ پسینے میں بھیگ گیا۔ وہ خوف زدہ دکھائی دینے لگا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی کو مدد کے لیے بلائے۔'' دیارام جی، اگر آپ نے ذرا سی بھی بے وقوفی کی نا، میں نے تو مر ہی جانا ہے آپ بھی نہیں رہیں گے۔''

''کیا چاہت ہو تم......؟'' اس نے خوف سے لرزتی آواز میں پوچھا۔

''میں آپ کو ساتھ لے کر جانے کے لیے یہاں آیا ہوں، صرف اتنے وقت کے لیے جب تک ہمارے ساتھ کی گئی بے ایمانی والا معاملہ صاف نہیں ہو جاتا۔''

''بے ایمانی والا معاملہ، میں سمجھا نہیں؟'' اس نے حیرت سے کہا۔

''آپ اسی وقت سمجھیں گے نا، جب ہم سمجھائیں گے، کیونکہ آپ نے اپنے بندوں کو یہ نہیں سمجھایا کہ ہمارے بے ایمانی والے کام میں ایمان داری پہلی شرط ہوتی ہے۔'' میں نے تیزی سے کہتے ہوئے اس کے ہاتھ پکڑ لیے تو وہ لرز کر رہ گیا، پھر دھیمی آواز میں بولا۔

''تم اپنی سمسیا مجھے بتاؤ، میں یہیں اپائے کر دیتا ہوں۔''

''نہیں دیارام جی، آپ کو میرے ساتھ تو جانا ہو گا، ورنہ بات نہیں بنے گی۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ آپ کو کچھ نہیں ہو گا، کیونکہ آپ اس میں قصوروار نہیں ہیں۔''

''تو پھر قصوروار کون ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہمارے پاس وقت کم ہے دیارام جی، ان بموں کا ریموٹ کنٹرول باہر بھی ہے، مجھے زیادہ وقت ہو گیا تو یہ......'' میں نے اپنی آواز کو سرد بناتے ہوئے کہا تو وہ پھر سے لرز گیا۔ اس دوران میں نے اس کے دونوں ہاتھوں کو مزید مضبوطی سے پکڑ لیا۔

''ٹھیک ہے' میں چلتا ہوں۔'' اس نے کہا تو میں نے اسے سہارا دے کر اٹھالیا' وہ ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنی گردن پر رکھا اور اپنا ہاتھ اس کی بغل میں دے کر چل پڑا' دروازے پر سیکیورٹی والے حیران تھے کہ دیارام کو کیا ہو گیا ہے۔ انہوں نے آگے بڑھنا چاہا تو اس نے دور ہی سے منع کر دیا۔ وہ آہستہ آہستہ میرے ساتھ چلتا چلا گیا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ خلاف معمول کارروائی سے وہاں ہلچل نہ مچے۔ آشرم میں ایک دم سے تیزی آ گئی۔ بانیتا نے مجھے دیکھ لیا تھا' اور وہ فون کے علاوہ اشاروں سے اپنے بندوں کو ہدایات دے رہی تھی۔ ہم کمرے سے نکل کر ہال میں آئے اور وہاں سے برآمدے میں' تب تک ایک فور وہیل جیپ ہمارے سامنے آ کر رک گئی۔ دروازہ کھلا اور میں دیارام کے ساتھ اس میں بیٹھ گیا۔ اسٹیئرنگ پر بھاری مونچھوں والا ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی اس نے گاڑی بڑھا دی۔ آشرم میں بہت سارے لوگ ہمارے پیچھے بھاگے تھے۔ جب تک ہم فوارے کے راؤنڈ اباؤٹ تک آئے' اس وقت تک کئی گاڑیاں ہمارے تعاقب میں چل پڑی تھیں۔ بلاشبہ ان میں کچھ ہمارے لوگ تھے اور کچھ آشرم والوں کے' جیسے ہی ہم گیٹ سے نکل کر مین روڈ پر آئے تو بانیتا نے فون پر کسی کو ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

''اپنے لوگوں سے کہو' گاڑیاں پیچھے لے جائیں۔''

اس کے چند منٹوں کے بعد کئی گاڑیاں پیچھے رہ گئیں۔ تین یا چار گاڑیاں تھیں جو ہمارے تعاقب میں بڑھتی ہی چلی آ رہی تھیں۔ بانیتا نے سن روف کھولا اور گن باہر نکال کر فائرنگ کرنا شروع کر دی۔ اچانک ہی وہ گاڑیاں ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے سڑک پر الٹ گئیں۔ کچھ ہی دیر بعد وہ کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں نے دیارام کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ امرتسر سے باہر ہی سے ہم ترن تارن روڈ پر نکل گئے۔

ہمارے سفر کا اختتام پھر اسی فارم ہاؤس پر ہوا' جہاں گزشتہ سے پیوستہ رات ہم رہے تھے۔ وہی جنگل کا ماحول' جھونپڑیاں' ایک چھوٹی سی ندی' درخت اور ہو کا عالم تھا۔ بانیتا اور میں دیارام کو لے کر ایک جھونپڑی میں آ گئے۔ میں نے اپنی جیکٹ جیپ ہی میں چھوڑ دی تھی' اس لیے جب آنکھوں سے پٹی اتارنے پر اس نے مجھے بغیر جیکٹ دیکھا تو اس نے سکون کا سانس لیا۔

''ادھر بیٹھیں دیارام جی' ادھر۔'' میں نے گھاس پھونس پر ایک چادر بچھاتے ہوئے کہا' جو میں اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ وہ بیٹھ گیا تو میں نے اس کے حیرت زدہ سوالیہ چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ پریشان نہ ہوں' آپ نے ہماری بات مانی' ہم آپ کو کوئی زحمت نہیں دیں گے۔''

''بات کیا ہے۔'' اس نے کافی حد تک اعتماد سے کہا تو میں بولا۔

''بات یہ ہے دیارام جی' آپ کے پرکاش اور دیپکا نے ہمارے ساتھ بے ایمانی کی' وہ بھی دو کروڑ کی' تیسرا کروڑ ابھی ہم نے دینا تھا۔''

''ایسا کیا کیا انہوں نے......'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''میرے باس کی ان سے ڈیل ہوئی تھی کہ دس پنجابی لڑکیاں دوبئی پہنچانی ہیں۔ اس نے ہامی بھرلی' ایک کروڑ اس نے لے لیا' دوسرا اس نے اس وقت لیا جب لڑکیاں' امرتسر میں لے آیا اور ہمارے بندوں کے حوالے کرنے کو کہا۔ طے یہ تھا کہ وہ دوبئی پہنچائے گا۔ تیسرا کروڑ اسے وہاں ملے گا۔ اس پر نہ صرف وہ

لڑکیاں واپس لے گئے بلکہ دو کروڑ بھی ہضم کر گئے۔"

"کیا وہ یہ کام بھی کرتے ہیں؟" دیارام جی نے حیرت سے پوچھا تو بانیتا نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"ایسے نہ کہو سوامی جی سب کچھ آپ کی آشیرواد سے ہوتا ہے ہم نے اگر آپ سے اچھا سلوک کیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم ہمیں بے وقوف بناؤ سیدھے رہو گے تو ہم بھی سیدھے رہیں گے۔"

یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی اور دیارام سہم گیا۔ میں اس کے رویے پر خود حیران تھا وہ اداکاری کر رہا تھا یا واقعتاً خوف زدہ تھا۔ ورنہ اس کے بارے میں یہی معلومات تھیں کہ وہ ہپناٹائز کا ماہر ہے جوگ سنیاس اور یوگا تو وہ جانتا ہی تھا میں نے کئی بار اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالی تھیں مگر مجھے تو کچھ بھی محسوس نہیں ہوا تھا۔ میں نے بھی اسے اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

"دیارام جی آپ تو ہپناٹزم کے ماہر ہیں ٹرانس میں لیں مجھے اور......" میں نے جان بوجھ کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ تب وہ چند لمحے میری طرف دیکھتے رہنے کے بعد بولا۔

"اب نہیں ہوتا یار شراب اور عورت نے یہ ساری صلاحیتیں چھین لی ہیں۔ میں نے تو اپنے اردگرد بڑا حصار بنایا تھا لیکن تم مجھے وہاں سے نکال لائے۔"

"سیدھے لائن پر آؤ دیارام......" بانیتا نے تلخی سے کہا تو وہ نرم لہجے میں بولا۔

"کیا چاہت ہو اب تم؟"

"ظاہر ہے دو کروڑ واپس اور جرمانے میں وہی دس لڑکیاں اور بس" میں نے سکون سے کہا۔

"اسے وقت بھی بتا دو صرف دو گھنٹے کے اندر اندر......" بانیتا تیز لہجے میں بولی پھر اپنا فون نکال کر اس پر نمبر ملائے اور صرف اتنا کہا۔

"پرکاش یا دیپکا سے بات کراؤ دھیان رکھنا وہ ہمارا فون نہ ٹریس کر لیں۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ اصل میں یہ صرف دیارام کو بتایا گیا تھا ورنہ یہ طے تھا کہ پرکاش کو فون لندن سے آنا تھا جس کے کانفرنس پر بانیتا نے بات کرنا تھی۔ اس طرح پکڑے جانے کا امکان نہیں تھا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ بانیتا کا فون بج اٹھا۔ اس نے آواز سنی اور فون مجھے دے دیا۔

"پرکاش بات کر رہا ہوں، کون ہو تم......؟"

"کیا تم دیارام جی سے بات کرنا چاہو گے؟" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا اور اسپیکر آن کر دیا۔

"اوہ، تو کیا یہ تم ہو۔ اگر انہیں کچھ ہو گیا تو میں"

"کتے کی طرح بھونکنا بند کرو اور صرف میری سنو۔" میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا اور فون دیارام کی جانب بڑھا کر اسے اشارہ کیا۔ تبھی وہ بولا۔

"پرکاش! یہ میں کیا سن رہا ہوں تم نے باہر ہی باہر سے ان کے دو کروڑ کھا لیے۔"

"ایسا کچھ نہیں ہے باپو! میری کوئی ڈیل نہیں ہوئی کسی سے یہ سب جھوٹ بول رہے ہیں؟"

"تمہیں کیسے پتہ کہ یہ کسی ڈیل کے دو کروڑ تھے؟" دیارام نے اچانک کہا۔

"باپو آخر کسی ڈیل ہی کے دو کروڑ ملنے تھے کوئی مفت میں تھوڑی دینے لگا ہے بس تم مجھے یہ بتاؤ انہوں نے کوئی بدتمیزی تو نہیں کی میں پورے امرتسر میں آگ لگا دوں گا اگر......"

"میں نے کہا نا کتے کی طرح مت بھونک۔" میں نے سرد لہجے میں کہا تو وہ ایک دم سے خاموش ہو گیا۔ دیارام نے کہا۔

"انہوں نے مجھے بڑے احترام سے رکھا ہے۔ اب تم سنو ان کے دو کروڑ روپے اور دس لڑکیاں پنجابی

والی وہ ان کے حوالے کرو صرف دو گھنٹوں میں۔"
"باپو یہ آپ کیا کہہ رہے ہو۔ میں لڑکیاں کہاں سے لاؤں؟" اس نے کہا تو میں بولا۔
"سن پرکاش! دیا رام جی سے اگر تم دوبارہ ملنا چاہتے ہو تو جیسا ہم کہتے ہیں' ویسا کرو' صرف دو گھنٹے۔" میرے یوں کہنے پر وہ چند لمحے خاموش رہا پھر ہنستے ہوئے بولا۔
"تو پھر تم مار ہی دو اس بڈھے کو اب یہ ہمارے کسی کام کا نہیں رہا' کیا کرنی ہے دولت اس نے' میرے خیال میں اب تمہیں اسے مار ہی دینا چاہیے۔ اچھا ہوا' تم لوگ اسے لے گئے ہو۔ اب دوبارہ مجھے فون نہیں کرنا' کچھ نہیں ملنے والا یہاں سے۔"
"پرکاش! یہ تم کہہ رہے ہو' میرے بارے میں۔" دیا رام نے چونکتے ہوئے اس طرح حیرت سے کہا جیسے اسے بہت دکھ ہوا ہو۔
"ہاں' ہاں تمہارے بارے میں کہہ رہا ہوں بڈھے' میرے خیال میں تو نے بہت عیاشیاں کر لی ہیں۔ اب تمہیں مر جانا چاہیے' بھگوان تمہیں سورگ دے۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔
"لو جی دیا رام جی' آپ کا تو انتم سنسکار کر دیا اسی نے' اب بولو' ہم کیا کریں۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا تو وہ بولا۔
"دھیرج رکھو اور مجھے وچار کرنے دو۔" دیا رام نے کہا تو بانیتا نے ہنستے ہوئے کہا۔
"میں نے وچار کر لیا ہے' اب یہ دونوں ڈرامہ کریں گے لیکن انہیں یہ نہیں معلوم کہ وہ آشرم جوان کی سلطنت بنا ہوا تھا' اس میں پولیس اور خفیہ کے لوگ بھی جا سکتے ہیں' ہاسٹل میں موجود لڑکیاں' جن کی تازہ کھیپ "مالیر کوٹلہ" سے آئی ہے' وہ ابھی تک وہیں موجود ہے' دو گھنٹوں میں سے پانچ منٹ گزر چکے ہیں مہاراج۔"
"دپیکا کو فون ہو سکتا ہے؟" دیا رام نے پوچھا' اس بار اس کے لہجے میں گہری سنجیدگی تھی۔
"وہ بھی ڈرامہ کرے گی' میں جانتی ہوں۔"
"تم بات تو کراؤ۔" اس نے بضد ہو کر کہا تو بانیتا نے نمبر ملائے پھر کچھ دیر بعد کال آ گئی۔
"باپو! تم ٹھیک تو ہو نا۔" دپیکا کی آواز ابھری۔
"یہ پرکاش کیا پاگل پن کر رہا ہے' میرے مرنے کے بارے میں۔"
"تو ٹھیک ہی کہا ہے نہ باپو' اب تم نے کتنا جینا ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا تو بانیتا نے غصے میں کہا۔
"ارے بندریا' زیادہ ڈرامے نہ کر ایک گھنٹہ چالیس منٹ ہیں تم لوگوں کے پاس' اس کے بعد اسی بڈھے کی ویڈیو چینل کو دے دوں گی' جس میں یہ تم دونوں کے بارے میں وہ ساری بکواس کرے گا' جو ہم اسے کرنے کے لیے کہیں گے' مرکزی خیال یہی ہو گا کہ تم لوگوں کے جرائم سے تنگ آ کر اس نے روپوشی اختیار کی' ایک گھنٹہ اڑتیس منٹ۔" یہ کہتے ہوئے اس نے فون بند کر دیا پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔
"دلجیت! اب زیادہ وقت نہیں دینا ان لوگوں کو' بیان ریکارڈ کرو اس کا اور ہر چینل کو بھیج دو۔"
اس کے یوں کہنے پر دیا رام نے سر یوں جھکا لیا جیسے وہ ہار گیا ہو۔ پھر جب وہ بولا تو اس کا لہجہ بھی اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔
"تم لوگ اسے ڈرامہ مت سمجھو' میں اتنی آسانی سے تم لوگوں کے ساتھ آ ہی اس لیے گیا ہوں کہ ان دونوں کو سامنے لا سکوں' تم لوگوں نے جو کچھ بھی کرنا ہے' جو بھی مجھ سے کہلوانا ہے' وہ میں کہنے کو تیار ہوں۔ اب ان لوگوں سے مجھے اپنا آشرم شدھ چاہیے۔"
"وہ تو ہم نے کرنا ہی ہے دیا رام جی' اب آرام

کرو' تھوڑی دیر بعد تمہیں تکلیف دیتے ہیں۔" بانیتا نے کہا اور اپنا سیل فون لے کر باہر نکل گئی۔ جاتے جاتے وہ مجھے بھی باہر آنے کا اشارہ کر گئی۔ میں نے چند لمحے یونہی انتظار کیا اور اس کے پیچھے جھونپڑی سے باہر آ گیا۔ وہ مجھے دیکھتے ہوئے سرگوشی میں بولی۔

"کیا خیال ہے' ڈرامہ ہے یا حقیقت۔ کیا وہ لوگ اس دیارام سے جان چھڑانا چاہتے ہیں؟"

"کچھ بھی ہے' مقصد تو پرکاش اور دیپکا کو ختم کرنا ہے' تو وہ کر دیتے ہیں۔" میں نے تحمل سے کہا۔

"وہ کیسے؟" بانیتا پریشانی میں بولی۔

"دیکھو' اپنے کسی بندے سے کہو' کہ وہ پولیس افسران اور مختلف چینل میں دیارام کی روپوشی کی اطلاع دے دیں' آشرم میں ہلچل تو پہلے ہی مچی ہوئی ہوگی' وہ کسی کو نکلنے نہیں دیں گے' وہ دونوں باہر ہی ہوں گے ان میں شک کا زہر تو آ گیا۔ دیارام انہیں کیسے واپس آشرم میں آنے دے گا۔ پھر ہم انہیں تلاش کر لیں گے۔" میں نے کہا تو وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔

"نہیں' وہ تو ہاتھ نہ آئے' اپنے' انہیں' ان کے بلوں سے نکالنا ہے۔"

"پھر اسی باپ سے ان کے ٹھکانے کا پوچھ نکال لیتے ہیں انہیں۔" میں نے کہا تو وہ بولی۔

"چلو' ابھی کچھ دیر انتظار کرو۔"

اس نے کہا اور جیپ سے تھیلا اٹھا کر لائی تھی' اس میں سے ٹین پیک سوڈا نکالا' ایک مجھے دیا' ایک خود لے کر تیسرا نکال کر جھونپڑی میں چل دی۔ دیارام ایک طرف ٹکٹکی لگائے سوچ رہا تھا' ہماری آہٹ پا کر وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"دیارام...... یار کیا کھویا' کیا پایا تم نے یار" میں نے اس کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"سب کھو دیا میں نے' سب' اس وقت میرے کچھ بھی کام نہیں آ رہا ہے' لیکن ایک کوشش اب بھی کی جا سکتی ہے۔"

"وہ کیا؟" بانیتا نے پوچھا۔

"اگر ایک بندے کو فون ہو جائے تو وہ ان دونوں کو منٹوں میں قابو کر سکتا ہے' اسے ان دونوں کے بارے میں سب علم ہے۔" دیارام نے کافی حد تک اعتماد سے کہا۔

"کون ہے وہ' اس کا نمبر بتاؤ۔" بانیتا نے تیزی سے پوچھا۔

"ایک نمبر ہی تو میرے پاس نہیں ہے' اگر تم کسی طرح آشرم کے مہیلا ہاسٹل کا نمبر لے لو تو بات بن سکتی ہے۔" دیارام نے کہا۔

"وہ ہے نمبر میرے پاس۔"

"تو پھر ملاؤ' میں بات کروں گا۔" اس نے کہا تو بانیتا نے نمبر ملانے کی بجائے لندن ہی ملایا۔ میرے ذہن میں تھا کہ ممکن ہے وہ کسی بے شعوری میں غلطی کر جائے' ایسا نہیں ہوا' کچھ دیر بعد مہیلا ہاسٹل میں رابطہ ہو گیا' تو ایک عورت نے گھبرائے ہوئے پوچھا۔

"باپو آپ کہاں ہے' آپ ٹھیک تو ہیں۔"

"میں ٹھیک ہوں' میری بات غور سے سنو' کسی بھی مہیلا کو ہاسٹل سے باہر نہ جانے دینا' چاہے کچھ بھی ہو جائے اور میری ایک مدد کرو' مجھے اپارہ سنگھ باجوہ کا نمبر دو فوراً۔"

"ابھی دیتی ہوں پر باپو! آپ کہاں ہیں اور کس کے ساتھ ہیں؟ ہم نے تو یہی سنا ہے کہ آپ کو اغواء کیا گیا ہے۔" اس عورت نے الجھتے ہوئے کہا۔

"نہیں' میں اغواء نہیں ہوا۔ پرکاش اور دیپکا سے چھپا ہوں' وہ مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں۔ تم یہ بات خود بھی اپارہ سنگھ باجوہ کو بتا دو۔"

''لکھو باپو نمبر'' اس عورت نے کہا اور نمبر لکھوا دیا' اس کے ساتھ ہی بانیتا نے نمبر بند کر دیا' کچھ دیر بعد اپارہ سنگھ باجوہ کا نمبر مل گیا' کچھ دیر تمہیدی باتوں کے بعد دیارام نے کہا۔

''وہ دونوں مجھے چاہئیں' ورنہ میرا قتل ہو جائے گا۔''

''آپ فکر نہ کرو' آپ آدھے گھنٹے بعد رابطہ کرنا۔'' اس کے بعد فون خاموش ہو گئے۔

عجیب کھچڑی سی پک گئی تھی۔ ہم نے سوچا کچھ اور تھا' لیکن اندر سے معاملہ ہی کچھ اور نکلا تھا۔ ہم دونوں کھلی فضا میں آ کر بیٹھ گئے اور اس معاملے کے مختلف پہلوؤں پر بات کرتے رہے۔ بانیتا نے ساری صورت حال حویلی بتا دی۔

ایک گھنٹہ گزرنے کے بعد ہم جھونپڑی میں گئے۔ دیارام بہت افسردہ بیٹھا ہوا تھا۔ بانیتا نے باجوہ کو فون ملایا۔ تب دوسری طرف سے پرجوش انداز میں کہا گیا۔

''دیارام جی! وہ دونوں میرے پاس ہیں' کیا حکم ہے ان دونوں کے لیے۔''

''مجھے یقین تھا کہ ایک تمہی ہو جو انہیں قابو کر سکتے ہو۔ ورنہ ان حالات میں وہ کسی پر بھروسہ نہیں کرنے والے۔'' دیارام نے نفرت سے کہا۔

''نہیں' میں ابھی ان کی تلاش کرنے والا تھا کہ انہوں نے خود رابطہ کر لیا ہے۔ اصل میں آپ کو صورت حال کا نہیں اندازہ' آشرم کو پولیس نے اپنے گھیرے میں لے لیا ہے اور تلاشی لینے کے لیے بات چیت کر رہے ہیں۔ اسی خوف سے یہ دونوں میرے پاس آ گئے ہیں۔''

''انہیں قابو میں رکھو' میں کچھ بندے بھجواتا ہوں' انہیں ان کے حوالے کر دینا۔ اس کے بعد ہی میں آشرم میں آ کر سب سنبھال لوں گا۔'' دیارام نے تیزی سے کہا' پھر کچھ کوڈ ورڈ طے ہوئے اور فون بند ہو گیا۔

بانیتا ایک دم ہی سے پرجوش ہو گئی تھی۔ دیارام نے باجوہ کا پورا اتہ پتہ بتایا' اس کے بعد بانیتا نے اپنے چند بندوں کو اس کام پر لگا دیا۔ وہ بڑے صبر آزما لمحات تھے۔ یا تو بانیتا کے بھیجے ہوئے بندے غائب ہو جانے تھے یا پھر اتنی محنت کرنے کے بعد کامیابی مل جانے والی تھی۔ میں اس کی اضطراری کیفیت دیکھ رہا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد اس کا فون بج اٹھا۔ اس کے لوگ تھے' اپارہ سنگھ ان سے تصدیق چاہ رہا تھا' فوراً ہی دیارام کی بات کروا دی گئی' کچھ ہی دیر بعد پرکاش اور دیپیکا کو ان بندوں کے حوالے کر دیا گیا لیکن اپارہ سنگھ باجوہ نے یہ شرط رکھی تھی کہ ان دونوں کو کچھ نہیں کہا جائے گا' اور دیارام انہیں معاف کر دے گا' بانیتا کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اس نے دیارام کو لیا اور جھونپڑی سے باہر آ گئی۔ ڈرائیور گاڑی لے آیا تھا۔ دیارام کی آنکھوں پر ویسے ہی پٹی باندھ دی گئی اور ہم وہاں سے نکل پڑے۔ ترن تارن سے امرتسر روڈ پر آئے تو ہم نے جیپ چھوڑ دی۔ ڈرائیور دیارام کو لے کر چلا گیا۔ ایک دوسری کار ہمارے انتظار میں تھی۔ ہم اس پر نکل پڑے۔ ہمارے سفر کا اختتام شہر سے باہر ایک فیکٹری میں ہوا۔ یہ رتن دیپ سنگھ ہی کی فیکٹری تھی اور یہاں کچھ فوڈ پراڈکٹ تیار ہوتے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد ہم فیکٹری کی پچھلی جانب ایک بڑے سارے اسٹور میں جا رکے۔ اس وقت اندھیرا پھیل چکا تھا اور روشنیاں جگمگا اٹھی تھیں۔

اسٹور کے ایک کونے میں بڑی میز کے اردگرد کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ دو کرسیوں پر وہ دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ بانیتا اور میں ان کے سامنے جا کر بیٹھ گئے۔ تب پرکاش نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

''میرا نہیں خیال کہ ہمارے درمیان کوئی دشمنی ہے' میں نے کوئی ایسی ڈیل نہیں کی جس میں......'' اس

نے کہنا چاہا تو بانیتا نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''فضول باتیں مت کرو پرکاش، تم اچھی طرح جانتے ہو کہ سکھ قوم کے خلاف کیا کچھ کرتے رہے ہو اور اب بھی کر رہے ہو۔ میں مانتی ہوں کہ تمہارے پیچھے ہندو تنظیمیں ہیں لیکن تم وہ (نازیبا گالی بکتے ہوئے) ہو جو اپنی ہی ہم وطن بہنوں کو غیروں کے ہاتھ فروخت کر رہے ہو، کیا سکھ عورتیں بھیڑ بکریاں ہیں یا مویشی؟'' آخری لفظ کہتے ہوئے اس کی آواز پھٹ گئی تھی۔

''میں ایسا کچھ سوچ کر نہیں......'' اس نے پھر کہنا چاہا تو بانیتا نے پوری قوت سے تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیا۔

''بکواس کرتا ہے سالا۔'' یہ کہہ کر وہ دیپکا کو دیکھ کر بولی۔ ''اور یہ کتیا ابھی تو بھونکے گی۔'' تبھی اس کا فون بجا تو وہ سننے لگی پھر چند لمحوں بعد ہی اس نے کچھ فاصلے پر کھڑے ایک گارڈ سے کہا۔ ''اے! ٹی وی لا ادھر، جلدی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ خاموش ہو گئی۔ کچھ ہی دیر بعد ایک ٹی وی لایا گیا، اس کا کنکشن لگایا تو کئی چینل آنے لگے۔ وہ ایک پر رک گئی جہاں دیارام پریس کو اپنا بیان دے رہا تھا۔

''وہ لوگ...... میرے سیوک تھے، پرنتو معالم نہیں تھا کہ وہ آشرم میں، اندر ہی اندر...... بھیانک کام میں ملوث تھے۔ مجھے معالم ہوا تو میں نے انہیں روکا۔ وہ میری جان کو آ گئے، مجھے مارنے کی دھمکیاں دینے لگے، انہوں نے مجھے یہاں یرغمال بنا لیا تھا، پھر میں نے کچھ لوگوں سے مدد لی، اب وہ فرار ہو چکے ہیں۔ پولیس سے بنتی ہے کہ وہ انہیں جلد از جلد گرفتار کرے۔ پنجاب کے مختلف علاقوں کی مہیلائیں یہاں قید تھیں، وہ ابھی پولیس کے حوالے کی ہیں، ابھی ان کے جرم سامنے آ رہے ہیں۔''

''تم لوگوں کا کام تو کر دیا دیارام جی نے۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا تو وہ دونوں حیرت سے ٹی وی کو دیکھنے لگے جیسے کچھ انہونی ہو گئی ہو پھر دیپکا غراتے ہوئے بولی۔

''یہ دیارام...... اس نے...... یہ خود بڑا مجرم ہے سالا اور...... ہمیں مجرم کہہ رہا ہے۔''

''دیکھو! اگر تم لوگ زندہ رہنا چاہتے ہو، اپنا پورا نیٹ ورک تفصیل سے بتا دو...... کون کون اس کے پیچھے ہے، یہ تم دونوں کو بتانا ہوگا...... آرام سے بتا دو تو ٹھیک ورنہ۔'' بانیتا نے کہا تو پرکاش نے ایک دم غصے سے کہا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم لوگ ہمیں زندہ چھوڑنے والے نہیں ہو اور نہ ہی ہمیں پولیس کے حوالے کرو گے تو پھر دوسروں کو بتانے کا فائدہ...... مار دو......'' اس نے کہا ہی تھا کہ میں نے اسے کالر سے پکڑ کر اٹھایا اور پوری قوت سے گھونسہ اس کے منہ پر دے مارا۔ اس نے مجھے پکڑ لیا اور میرے ساتھ گتھم گتھا ہو گیا۔ وہ بہترین فائٹر تھا اور میرے ساتھ زور آزمائی پر اتر آیا تھا۔ اس نے اپنا گھٹنا میرے پیٹ میں مارا، جس سے درد کی شدید لہر میرے اندر اتر گئی۔ اس وقت میں نے اسے ذرا سی ڈھیل دے دی کہ وہ کرنا کیا چاہتا ہے، چند لمحوں ہی میں وہ میرے پیچھے تھا، اس کا بازو میری گردن میں تھا، دوسرے ہاتھ سے اس نے میری کلائی پکڑی ہوئی تھی، بانیتا حیرت سے میری طرف دیکھ رہی تھی، تبھی پرکاش بولا۔

''ہلنا مت...... ورنہ ایک جھٹکے سے تیری گردن ٹوٹ جائے گی۔''

اس لمحے دیپکا اٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے میرے پیٹ میں گھونسہ مارتے ہوئے نفرت سے کہا۔

''نیٹ ورک کے بارے میں پوچھتا ہے، چل...... ہمیں باہر لے کر چل......'' پھر گھوم کر سب کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اپنی جگہ نہیں چھوڑنی...... ورنہ یہ تو

جان سے جائے گا۔"

میں حیران تھا کہ انہوں نے گرگٹ کی طرح کیسے رنگ بدلا ہے۔ میں نے چند لمحے مزید انہیں دیکھا' پھر مڑنے کی اداکاری کرتے ہوئے اچانک اس کا ہاتھ اپنی گردن سے نکالا اور اس کی دونوں کلائیاں اپنے ہاتھ میں لے کر اس طرح جھٹک دیں کہ اس کے منہ سے اذیت ناک کراہ نکلی' پھر تیز چیخ کے ساتھ اس کے دونوں ہاتھ لٹک گئے۔ میں نے دونوں کھڑے ہاتھ اس کی گردن پر مارے تو وہ چکرا کر زمین پر گر گیا۔ تب میں نے دیپکا کی طرف دیکھا تو وہ ششدر تھی' میری طرف یوں دیکھ رہی تھی جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو' میں اس کی طرف بڑھا تو بانیتا نے تیزی سے کہا۔

"نہیں دلجیت! اسے میں دیکھتی ہوں' تم اسے ہوش میں لا کر مزید دھلائی کرو۔"

میں نے پرکاش کے پہلو میں ٹھوکر ماری۔ وہ ہوش میں آ گیا لیکن اسے سدھ بدھ نہیں تھی۔ میں نے قریب کھڑے سکھ سیکیورٹی گارڈ کی کرپان نکالی اور اس کی ران میں پیوست کر دی' پھر دوسری ران میں ماری وہ ذبح کئے ہوئے جانور کی طرح بلبلانے لگا' تبھی چٹاخ کی آواز کے ساتھ ماحول گونج اٹھا' بانیتا نے دیپکا کو اپنے آگے رکھ لیا تھا' کچھ ہی دیر بعد وہ چیختے ہوئے کہنے لگی۔

"میں بتاتی...... ہوں...... بتاتی ہوں......"

میں نے تب تک پرکاش کے دونوں ہاتھ کاٹ کر دیپکا کے سامنے پھینک دیئے' وہ خوف اور حیرت سے پیلی پڑ گئی۔

رات گئے تک ساری معلومات لے لینے کے بعد ان دونوں کو ایک شاہراہ پر پھینک دینے کے لیے بانیتا نے انہیں وہیں چھوڑ دیا۔ پرکاش تقریباً مر چکا تھا اور دیپکا کو مار دینے کا حکم دے دیا گیا تھا۔

وہاں سے نکل کر اس گھر میں گئے اور پھر تہہ خانے کی سرنگ کے ذریعے حویلی میں جا پہنچے۔ رات کے اس پہر رتن دیپ سنگھ ہمارے انتظار میں تھا۔ اس نے ہم دونوں کو اپنے گلے لگایا' دیر تک اپنے سے چمٹائے رکھا' پھر جب اس نے ہمیں الگ کیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بہت ساری بیٹیوں کو بچا لیا ہے تم نے' کئی گھروں کی عزت' سکھوں کی شان تو بیٹیوں سے ہے' میں احسان مند ہوں' تم دونوں کا' مانگ جمال کیا مانگتا ہے تو مجھ سے۔" یہ کہہ کر اس نے ہم دونوں کو خود سے الگ کر دیا' اور میرے چہرے پر دیکھنے لگا تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ کا پیار۔"

میرے یوں کہنے پر اس نے مجھے دوبارہ اپنے سینے سے لگا لیا' پھر روتے ہوئے بولا۔

"تو مجرم نہیں ہے...... نہ ہی ہو سکتا ہے...... تیرا اندر پاک صاف ہے پتر...... میں تیرا احسان نہیں دے سکتا۔ پوری سکھ قوم نہیں دے سکتی۔"

وہ بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔

کچھ دیر تک وہ اسی حوالے سے بات کرتا رہا' پھر ہمیں آرام کرنے کا کہہ کر وہ اندر کی جانب چلا گیا۔

میں فریش ہو کر بیڈ پر پھیل کر لیٹا ہوا تھا۔ مجھ پر اچھی خاصی تھکن سوار تھی' ایسے میں بانیتا شارٹس پہنے اور ہاتھوں میں ٹرے اٹھائے نمودار ہوئی۔ اس نے ٹرے میرے سامنے رکھی اور بولی۔

"دلجیت جی کچھ کھا پی لو یہ چکن تکہ ہے' اور سوڈا...... کھا لو اور پھر سوتے ہیں۔"

میں کھانے لگا' اس وقت آدھی سے زیادہ رات

گزر چکی تھی۔ جب میں لیٹا' مجھے معلوم تھا کہ بانیتا کو نیند نہیں آتی' وہ یونہی بیٹھی رہے گی' اس لیے میں پھیل کر سو گیا۔

☆☆☆......

اس صبح رتن دیپ سنگھ نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ اتنے دن میں ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ مجھے رات کا جذباتی پن یاد آنے لگا تھا۔ شاید اس حوالے سے بات کرنے کے لیے اس نے مجھے بلایا تھا۔ میں ملازمہ کے ساتھ مختلف راہداریاں پار کرتا ہوا اس کے کمرے میں جا پہنچا تو وہ ایک بڑے سارے کمرے میں قالین پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے تکیے سے ٹیک لگائی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ دو نوجوان' ایک ادھیڑ عمر خاتون اور بانیتا بیٹھی ہوئی تھیں۔

''آؤ جمال! بیٹھو۔'' رتن دیپ نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ میں نے ایک جانب خالی جگہ دیکھی اور بیٹھ گیا۔ تبھی اس نے کہا۔ ''یہ میرا پریوار ہے۔ یہ میری پتنی ہے۔'' اس نے ادھیڑ عمر عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ نوجوان میرا بیٹا گروپال سنگھ اور چھوٹا گرومیت سنگھ! دونوں بزنس کرتے ہیں۔ اور یہ بانیتا! میری سگی بیٹی۔''

''اوہ......!'' میرے منہ سے نکلا تو دونوں بیٹے ہنس دیئے' پھر گرومیت بولا۔

''اس کے بارے میں ایسے ہی حیرت ہوتی ہے' جو کام لڑکوں کو کرنا چاہیے وہ یہ کرتی ہے باپو کے لیے۔''

''خیر باتیں تو ہوتی رہیں گی' ناشتہ لگواؤ۔''

''وہ تو لگ گیا ہے جی' آپ چلیں ڈائننگ ٹیبل پر۔'' رتن دیپ کی بیوی نے کہا تو ہم سب اٹھ کر ٹیبل پر آ گئے۔ بانیتا کے بارے میں میری حیرت کم نہیں ہوئی تھی۔ ناشتے کے دوران رتن دیپ نے کہا۔

''جمال! تم جتنے دن بھی یہاں رہے ہو' میرا دل جیت لیا ہے تم نے' میں چاہوں گا کہ تم دوبارہ بھی یہاں آؤ' مجھے خوشی ہو گی۔''

''مطلب؟ میں کہیں جا رہا ہوں۔'' میں نے چونک کر پوچھتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔

''ہاں' پاکستان۔ تم آج پاکستان جا رہے ہو' تم دلجیت سنگھ کے نام ہی سے پاکستان جاؤ گے۔ سب کاغذ تیار ہیں۔ ٹکٹ بھی' ہمارے گیانی کے ساتھ ایک جتھہ جا رہا ہے' بہت سارے پریوار ہیں ان کے ساتھ' تم بھی ایک پریوار کا حصہ بن کر جاؤ گے۔ اگرچہ پوری کوشش کی ہے کہ تم پہچانے نہ جاؤ' لیکن تمہاری تلاش ''را'' کر رہی ہے۔ رب سے بنتی ہے کہ تم خیریت سے پہنچ جاؤ۔'' آخری لفظ کہتے ہوئے رتن دیپ کے لہجے میں یاس اتر آئی۔ آواز بھرا گئی۔ ماحول بوجھل ہو گیا۔ اس کے بعد ہمارے درمیان کوئی بات نہ ہوئی' جبکہ میرے من میں عجیب سی اتھل پتھل ہونے لگی۔

دس بجے کے بعد میں حویلی سے رخصت ہوا۔ سب نے ڈرائنگ روم سے مجھے رخصت کیا' جبکہ بانیتا میرے ساتھ سرنگ میں چلتی چلی گئی۔ جس وقت ہم سرنگ سے نکل کر کمرے میں آئے جو اسٹور ٹائپ تھا' اس نے میرے سینے پر اپنی ہتھیلی رکھی اور زور سے دباتے ہوئے مجھے دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

''دلجیت! تم نجانے کس مٹی کے بنے ہوئے ہو' ورنہ میرے قرب کے لیے کتنا خون بہا ہے' یہ میں ہی جانتی ہوں۔ میں قلوپطرہ نہیں لیکن میں نے لوگوں کو اپنے لیے لڑتے دیکھا ہے۔ نجانے کتنے لوگ اب بھی میری چاہت کے طلب گار ہیں۔ میں تمہارے اتنے قریب رہی' مگر تم نے اپنی نیت خراب نہیں کی۔ اسے میں اپنی ہتک خیال کر سکتی ہوں کہ تم نے مجھے اس قابل نہیں سمجھا' یہ میرے عورت پن کی تذلیل بھی

ہو سکتی ہے لیکن جی نہیں چاہتا کہ تمہارے رویے کو منفی خیال کروں، پوچھ سکتی ہوں ایسا کیوں ہے؟''

''میں بتا بھی دوں تو تجھے سمجھ نہیں آئے گی۔'' میں نے پرسکون لہجے میں کہا تو وہ میری جانب دیکھتی رہی پھر بولی۔

''لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ تو نے میرا دل جیت لیا ہے، تم فاتح کی حیثیت سے اپنے دیس جا رہے ہو۔ یاد رکھنا، میں تمہارا انتظار کروں گی۔''

''مگر میں کوئی وعدہ نہیں کرتا۔'' میں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا اور نرمی سے اس کا ہاتھ اپنے سینے سے ہٹانا چاہا، وہ بے حد جذباتی ہو گئی تھی، اپنا چہرہ میرے قریب لے آئی، اتنا قریب کہ اس کی سانسیں میں اپنے چہرے پر محسوس کرنے لگا۔ اس کے تھرتھراتے ہوئے ہونٹ میری آنکھوں کے سامنے تھے۔ شاید وہ ان کی گرمی کا لمس میرے ہونٹوں میں اتار دینا چاہتی تھی۔ میں ساکت رہا، وہ چند لمحے مجھ پر جھکی رہی، پھر اپنے ہونٹوں کی گرماہٹ سمیٹ کر تشنہ لبی سے ہی میرے سامنے سے ہٹ گئی۔

''گڈ بائے دلجیت!'' یہ کہتے ہوئے وہ پلٹی اور سرنگ میں واپس چلی گئی۔ میں چند لمحے یونہی کھڑا رہا پھر ایک طویل سانس لے کر اس کمرے سے نکلتا چلا گیا۔ اس گھر میں مجھے کسی نے نہیں روکا جیسے ہی میں مین دروازے سے باہر آیا، ایک نیلی پگڑی والا نوجوان بائیک لیے کھڑا تھا۔ میں اسے پہلے بھی حویلی میں دیکھ چکا تھا، اس نے مجھے بیٹھنے کا خفیف سا اشارہ کیا، میں اس کے پیچھے بیٹھا تو وہ چل دیا۔ پورے راستے میں وہ ایک لفظ بھی نہیں بولا، بلکہ گلیوں اور بازاروں میں سے گھومتا ہوا ایک پوش گھر کے سامنے آن رکا۔ بائیک بند کر کے وہ مجھے اپنے ساتھ اندر لے گیا۔ ڈرائنگ روم میں پانچ افراد موجود تھے۔ دو بوڑھے میاں بیوی، دو جوان، جن میں سے ایک شادی شدہ تھا، اس کی بیوی،

''آپ ان سے اچھی طرح تعارف کر لیں۔ آپ ان کے بیٹے ہو، چھوٹے''

نیلی پگڑی والے نے کہا تو میں نے فتح بلائی اور ان کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ نوجوان چلا گیا اور ہم باتیں کرنے لگے۔ بابا سنگھ بہت جی دار قسم کا بندہ تھا، جبکہ بی بی اس سے کہیں بہادر۔ ضرورت مجھے ان کی فقط یہی تھی کہ اگر کوئی مسئلہ بن جائے اور مجھے اپنا خاندان ظاہر کرنا پڑے تو میں کر دوں۔ ورنہ واپسی پر ان سے پوچھ تاچھ ہوتی ہے یا نہیں، میں یہ نہیں جانتا تھا۔

بارہ بجے کے قریب ہم اٹاری اسٹیشن پہنچ گئے۔ ٹرین وہیں سے نکلنی تھی اور کاغذات کی جانچ پڑتال وہیں پر ہونی تھی۔ جتھے داروں کی بس آئی تھی اور ہمیں لے کر اسٹیشن پہنچی تھی۔

اٹاری اسٹیشن پر لوہے کا طویل جنگلا تھا۔ مسافروں کے کاغذات کے لیے کافی کیبن بنے ہوئے تھے۔ جن میں لوگ قطار بنا کر اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ جیسے پان کھانے والے کو دور ہی سے پنواڑی کی دکان کے بارے میں معلوم ہو جاتا ہے، بالکل ایسے ہی سیکیورٹی کے لوگوں کے بارے میں مجھے معلوم ہونے لگا۔ بے تحاشا سیکیورٹی تھی، نجانے کس کس ادارے کے لوگ وہاں پر ہوں گے۔ ایک کیبن کی لائن میں ہم لگ گئے۔ یہ بہت صبر آزما اور رسک والا مرحلہ تھا۔ اگر میرے کاغذات پر شک بھی ہو جاتا کہ وہ جعلی ہیں تو مجھے وہاں یوں دبوچ لیا جانا تھا جیسے بلی کسی چوہے کو اپنے پنجے میں لے لیتی ہے۔ یہ ایسا موقع تھا جب میں اپنے ساتھ کوئی ہتھیار نہیں رکھ پایا تھا۔

گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ میں قطار میں

کھڑا رہا اور پھر وقفے وقفے سے آگے سرکتا رہا۔ بابا سنگھ، بھائی سنگھ مجھ سے آگے تھے۔ بی بی کور اور بھابی کور ایک دوسرے کیبن کی قطار میں لگی کھڑی تھیں۔ ہمارے اردگرد صرف پولیس والے وردی میں تھے۔ باقی خفیہ والے سادہ لباس میں پھر رہے تھے۔ میں نے سنا تھا کہ وہ ٹرین کا ذرا ذرا سا حصہ بھی دیکھتے ہیں، ہر ڈبے میں کتوں کو پھراتے ہیں اور بڑی تسلی کے بعد کہیں ٹرین کی بوگیوں کی کلیئرنس دیتے ہیں۔ مجھ سے آگے چند لوگ ہی رہ گئے تھے۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ اس وقت مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے گدھ کسی کے مرجانے کا انتظار کررہے ہوں۔ خفیہ والے گدھوں کی طرح میرے اردگرد پھر رہے تھے۔ ہلکا سا شک مجھے جیل کی تاریک کوٹھڑی میں پھینک سکتا تھا۔ بابا سنگھ کے کاغذات جب کلیئر ہوگئے تو ایک دم میرے اندر سنسنی دوڑ گئی۔ بھائی سنگھ اپنے کاغذات دکھا رہا تھا۔ میرے ساتھ ان کا پورا خاندان بھی ڈوب سکتا تھا۔ یہ سوچ آتے ہی میں نے خود پر قابو پایا اور پھر نارمل ہوتا چلا گیا۔

بھائی سنگھ کے کاغذات اوکے ہوگئے تو میں نے اپنے کاغذات اس کے سامنے رکھ دیئے۔ میرے سامنے سکھ نوجوان تھا۔ اس نے کاغذات کو دیکھا، انہیں پڑھا، پھر کچھ دیر تک دیکھتے رہنے کے بعد پہلا سوال یہی کیا کہ مجھ سے پہلے میرا باپ اور بھائی گیا ہے، میں نے اثبات میں جواب دیا تو اس نے کاغذات اوکے کردیئے۔ جس کسی نے بھی میرے بارے میں سوچا تھا، بہت خوب سوچا تھا، اس نے انسانی نفسیات کا فائدہ اٹھایا تھا۔ ایک ہی خاندان کے اگر دو بندوں کے کاغذات درست ہوسکتے ہیں تو تیسرے کے کیوں نہیں۔ میں اپنی دستاویزات سمیٹ کر قطار سے باہر نکل آیا۔ اس وقت میرے حلق سے اطمینان کی طویل سانس برآمد ہوئی تھی کہ مجھے اپنا سانس سینے ہی میں دبانا پڑا۔ میرے بدن میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے بڑی خاموشی کے ساتھ مجھے گھیرا جانے والا ہو۔ اٹاری اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر بہت سارے لوگوں کا ایک جتھہ چلا آرہا تھا۔ ان میں پولیس والے بھی تھے اور خفیہ والے بھی تیزی سے چلتے چلے آرہے تھے۔ میری نگاہ ان بندوں پر ٹک گئی جو بالکل ان کے درمیان میں بڑھتے چلے آرہے تھے یہ وہی تھے جو امرتسر جنکشن سے نکل آنے کے بعد میرے اور بانیتا کے تعاقب میں آئے تھے۔ ان میں سے ایک بندے کو میں نے بغل میں لے کر گردن کی ہڈی توڑ کے ماردیا تھا۔ یہ انہی کے ساتھی تھے۔ میں اگر انہیں اتنی دور سے پہچان سکتا تھا تو کیا وہ مجھے نہیں پہچان سکتے تھے؟ میرے دماغ میں اس وقت یہی تھا کہ میں یہاں سے فرار لے لوں، کیونکہ مجھے یہاں انہی میں سے کسی نے دیکھ لیا ہوگا، اور فورسز کو اطلاع کردی ہوگی؟ وہ تو پہلے ہی کتوں کی طرح میری راہ پر تھے۔ وہ ایسا موقع قطعاً اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دے سکتے تھے۔ میں اگر سرحد پار چلا گیا تو یہ ان کی مات تھی۔ وہ تیزی سے بڑھتے چلے آرہے تھے اور میں بابا سنگھ کو بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ افتاد پڑگئی ہے۔

(باقی آئندہ ماہ)

تاج محل

ریاض بٹ

عشق جب حد سے سوا ہو جائے تو عاشق فرزانگی سے دیوانگی کی گلیوں میں کھو جاتا ہے۔ ان گلیوں میں طنز اور تشنوں کے کانٹے چلنے والوں کے صرف پاؤں ہی نہیں روح کو بھی زخمی کر دیتے ہیں۔

ایک عاشق نامراد کا قضیہ محبوب کی گلیوں میں موت کی دیوی جہاں زلفیں بکھیرے اس کی منتظر تھی۔

قارئین نئے افق کے لیے ایک خوبصورت تفتیشی کہانی۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہمارے تھانے کی حدود میں واقع ایک سینما میں لگی پنجابی فلم نے دھوم مچائی ہوئی تھی۔ ہر شو فل جا رہا تھا' اس فلم کی کاسٹ میں یوسف خان' فردوس' نبیلہ اور الیاس کشمیری نمایاں تھے۔ قارئین خاطر جمع رکھیں میں آپ کو فلم کی کہانی نہیں سناؤں گا بلکہ وہی تفتیشی کہانی سناؤں گا جس کے آپ منتظر رہتے ہیں۔

دن کے بارہ بجے کا وقت ہو گا وہ غالباً دسمبر کا آغاز تھا' جاڑہ شروع ہو چکا تھا۔ ہمیں اطلاع ملی کہ فلاں سینما کے بکس میں ایک لاش پڑی ہے یہ وہی سینما تھا جس کا ذکر آ چکا ہے۔

اطلاع سینما کا ایک ملازم لے کر آیا تھا یہ ایک جوان لڑکا تھا' رنگ صاف اور عمر بیس سال کے اریب قریب رہی ہوگی۔ اس نے میلے سے کپڑے پہنے ہوئے تھے اس کے ذمہ سینما کی صفائی وغیرہ کا کام تھا' وہ گیارہ بجے سینما میں جاتا تھا اور کرسیوں وغیرہ اور فرش کی صفائی کرتا تھا۔ اتوار کے علاوہ پہلا شو تین بجے شروع ہوتا تھا اور فلم بین یہ بھی جانتے ہوں گے کہ بکس علیحدہ ہوتے ہیں اور ان سے لوگ بک کروا لیتے تھے' عموماً جوڑے یہ بکس بک کرواتے تھے۔ اتوار کو یہ نوجوان صبح نو بجے سینما میں جاتا تھا کیونکہ پہلا شو تقریباً بارہ بجے شروع ہوتا تھا بہرحال نوجوان (جس کا نام لیاقت تھا) وہ حسب معمول صفائی کر رہا تھا کہ ایک بکس میں اسے لاش ملی۔ وہ جھاڑو وغیرہ وہیں چھوڑ کر سینما کے دفتر میں آیا۔ وہاں سینما کا مالک ابھی نہیں آیا تھا لیکن وہ سینما کے ساتھ ہی واقع ایک کوٹھی میں رہتا تھا وہ بھاگم بھاگ وہاں پہنچا اور مالک کو صورت حال سے آگاہ کیا اس نے لیاقت کو تھانے کی طرف دوڑا دیا اور خود سینما کی طرف چلا گیا۔

ظاہر ہے یہ سب باتیں ہمیں جوان نے بتائی تھیں میں نے کانسٹیبل وقار اور سپاہی ممتاز ستی کو ضروری تیاری کا کہہ کر اس دوران لیاقت سے چھوٹا سا انٹرویو کر لیا تھا۔

بہرحال ایک گھنٹے بعد ہم سینما کے بکس میں لاش کا معائنہ کر رہے تھے' لاش اوندھی پڑی تھی' سپاہی نے لاش کو سیدھا کیا تو لاش کے سوجے ہوئے گلے نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ اسے گلا گھونٹ کر مارا گیا ہے' لاش فرش پر پڑی تھی۔

یہ تیس بتیس سال کا ایک خوبرو آدمی تھا' کلین شیو تھا' رنگ گندمی تھا' آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں' ہونٹ نیلے اور بال اس کے گھنگھریالے تھے۔ اس نے پینٹ قمیص کے اوپر ایک خوب صورت سوئٹر پہنا ہوا تھا' ضروری کارروائی کے بعد میں نے لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی۔ لاش کی جیب سے شناختی کارڈ برآمد ہوا تھا جو اسے یہاں سے پچاس

میل دور کا باشندہ ظاہر کرتا تھا۔ لاش کی جیب سے ایک بٹوہ بھی برآمد ہوا تھا جس میں اس زمانے کے لحاظ سے ایک بڑی رقم پڑی ہوئی تھی ایک اور چیز بھی برآمد ہوئی تھی یہ ایک سونے کا بنا ہوا چھوٹا سا تاج محل تھا اور غالباً کھری چاندی سے اس کے اوپر درج ذیل شعر بالکل باریک سا لکھا ہوا تھا' اس زمانے میں میری نظر ماشاء اللہ بہت تیز تھی اور میں بقول شخصے اڑتی چڑیا کے پَر گن سکتا تھا بہر حال میں نے شعر پڑھ لیا۔

ایک شہنشاہ نے بنا کے تاج محل

ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

یہ کوئی دل جلا عاشق تھا کیونکہ ابھی تک ہمیں صرف اس کا نام ہی معلوم ہوا تھا' آپ کو بتادوں کہ اس کا نام بھی عاشق ہی تھا' جی ہاں کبھی کبھی ایسا اتفاق بھی ہوتا ہے۔

میں اس سارے گورکھ دھندے میں یہ بات بتانا تو بھول ہی گیا کہ ہمارے ساتھ سینما کا مالک نور حسین اور ٹکٹ کلرک ندیم بھی تھا۔

عام ہال میں تو عموماً لوہے کی کرسیاں تھیں لیکن بکس میں صوفے رکھے ہوئے تھے اس بکس میں تین صوفے تھے ایک صوفے کے نیچے مجھے ماچس کی ایک ڈبیہ نظر آئی میں نے ڈبیا کو کھول کر دیکھا تو اس میں جلی ہوئی کچھ تیلیاں بھی تھیں۔ میں نے ماچس سب کی نظر سے بچا کر جیب میں ڈال لی اس کے علاوہ وہاں کوئی اور چیز یا یا سراغ نہ ملا۔

ہم سینما کے دفتر میں آکر بیٹھ گئے' مالک نور حسین اور کلرک ندیم کے علاوہ میں نے صفائی کرنے والے نوجوان کو بھی ساتھ بٹھالیا۔ کانسٹیبل اور سپاہی لاش کے ساتھ چلے گئے تھے' میں نے انہیں کہا تھا کہ گھنٹے کے اندر اندر گاڑی بھیج دینا۔

اب تک میں کسی سراغ کی تلاش میں مصروف رہا تھا' ادھر اُدھر دیکھنے کی فرصت نہیں ملی تھی' اب جب میں نے غور سے سینما کے مالک نور حسین کے چہرے کی طرف دیکھا تو مجھے وہاں ہوائیاں اڑتی نظر آئیں' اس کے علاوہ جسم کے مختلف حصوں سے اضطراب جھلک رہا تھا۔

ظاہر ہے اس کی یہ کیفیت تو ہونی ہی تھی' سینما کی رپورٹیشن خراب ہوگئی تھی لیکن مجھے تو اپنا کام کرنا تھا وہ میں نے شروع کر دیا۔

''نور حسین صاحب! یہ آپ کے لیے ایک بہت بڑا دھچکہ ہے لیکن جو کچھ ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ میں اپنے فرض سے مجبور ہوں اس لیے......''

میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''تھانیدار صاحب! میں آپ کا مدعا اور مطلب سمجھ رہا ہوں' آپ نے جو کچھ پوچھنا ہے پوچھیں۔''

اس نے مضمحل سی آواز میں کہا۔

''آپ کے پاس کتنے گیٹ کیپر ہیں؟''

''جناب چار ہیں' تین نیچے اور ایک اوپر۔ اوپر والا گیلری اور بکس کے لیے ہے۔''

''ان کو آپ نے بلایا ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''بالکل جناب! میں نے بندہ دوڑا دیا ہے' وہ آتے ہی ہوں گے۔'' مالک نے سگریٹ سلگانے سے پہلے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو......؟''

''بالکل جناب! آپ سگریٹ سلگائیں' آپ چین اسموکنگ کر سکتے ہیں۔'' اس نے سگریٹ کو دیا سلائی دکھائی اور ایک گہرا کش لے کر دھواں اوپر کی طرف چھوڑتے ہوئے میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹاتے

ہوئے ٹکٹ کلرک ندیم سے سوال کر دیا۔
''ندیم صاحب! کل آخری شو (نو بجے سے بارہ بجے) کی ٹکٹیں آپ نے ہی دی تھیں۔''
''جی ہاں جناب!'' اس نے جواب دیا۔
''جس بکس میں واردات ہوئی ہے اس کے ٹکٹ بھی ظاہر ہے آپ کے دیئے ہوں گے۔''
''نہیں جناب جیسا کہ آپ کے علم میں ہے آج کل ہمارے سینما میں فلم چل رہی ہے یہ ماشاء اللہ بہت رش لے رہی ہے' اس لیے پچھلے تین دن سے سارے بکس ریزرو ہیں یعنی ایڈوانس بکنگ ہو چکی ہے بلکہ دس کے دس بکس اس پورے ہفتے کے لیے ریزرو ہیں' ان کے ٹکٹ وغیرہ بک چکے ہیں۔''
یہاں اس بات کی وضاحت کر دوں کہ جس بکس میں واردات ہوئی تھی اس کا نمبر دس تھا اور یہ بالکل آخر میں تھا' الگ تھلگ۔
''کیا مطلب؟'' میں نے ٹکٹ کلرک ندیم کو گھورا۔ ''پہلے آپ نے تین دن کہا پھر پورے ہفتے پر چلے گئے۔''
''جناب! اس میں ایسی ویسی بات کوئی نہیں دراصل پہلے میرے ذہن میں نہیں رہا تھا اگر آپ ریکارڈ چیک کرنا چاہیں تو حاضر ہیں۔'' میں نے ریکارڈ چیک کیا اس کی بات بالکل صحیح تھی۔
ریکارڈ کے مطابق اس بکس کے دو دن پہلے ٹکٹ لیے گئے تھے اور یہ تین ٹکٹ تھے لیکن میرا مسئلہ جوں کا توں تھا' ریکارڈ میں کوئی نام پتا لکھا نہیں تھا وہاں مکمل اندھیرا تھا۔ میں نے نور حسین سے پوچھا۔
''آپ کے سینما میں کینٹین تو ہوگی۔''
''اوہ جناب! میں اس پریشانی میں بھول ہی گیا تھا' ٹھہریئے میں ابھی چائے وغیرہ منگواتا ہوں۔''
اس نے صفائی کرنے والے لڑکے کی طرف دیکھا اور بولا۔
''لیاقت...... دوڑ کر جاؤ......''
''آپ میرا مطلب نہیں سمجھے مجھے چائے وغیرہ کی کوئی حاجت نہیں ہے' میں تو صرف ان لڑکوں سے سوال جواب کرنا چاہتا ہوں جو آف ٹائم میں چائے وغیرہ دیتے ہیں۔''
اس وقت کے علم بینوں کے علم میں یہ بات ہوگی کہ زیادہ فلم بین آف ٹائم میں کینٹین کا رخ کرتے تھے لیکن ایک معقول تعداد ایسے فلم بینوں کی بھی ہوتی تھی جو اپنی جگہ پر بیٹھے رہتے تھے اور کینٹین کے لڑکے بالے ہال' گیلری اور بکس میں چائے انڈے گرم اور خستہ مونگ پھلی کی آوازیں لگاتے تھے' خاص کر گیلری اور بکس کے فلم بین جن کے ساتھ فیملی وغیرہ ہوتی تھی اپنی جگہوں یعنی سیٹوں پر بیٹھے رہتے تھے۔
کچھ دیر کے بعد میرے سامنے پانچ لڑکے کھڑے تھے ان کی عمریں پندرہ اور بیس سال کے درمیان ہوں گی' ان سے سوال و جواب کر کے صرف ایک کام کی بات معلوم ہوئی کہ ایک لڑکے نے جس کا رنگ سانولا اور نین نقش موٹے موٹے تھے بتایا کہ بکس نمبر دس میں دو بندے تھے ایک تو مقتول تھا' دوسرا تقریباً اس کا ہم عمر لگتا تھا اس نے مفلر سے اپنا چہرہ چھپایا ہوا تھا اور شوں شوں کر رہا تھا جیسے اسے نزلہ ہوا ہو۔ اس نے دو اُبلے ہوئے انڈوں اور ایک ہاف سیٹ چائے کا آرڈر دیا تھا۔
اس سے ایک بات یہ بھی پتا چلی کہ ہاف ٹائم یعنی تقریباً پونے گیارہ بجے مقتول زندہ تھا۔
بکس میں تین صوفے تھے اور ٹکٹ بھی تین ہی لیے گئے تھے' کچھ سوال میرے ذہن میں گردش

کر رہے تھے جو میں گیٹ کیپروں سے کرنا چاہتا تھا' خاص کر گیلری اور بکس والے گیٹ کیپر سے۔ اچانک تین بندے اندر داخل ہوئے جن کے کپڑوں سے ان کی غربت ظاہر ہو رہی تھی وہ سلام کر کے ایک طرف کھڑے ہو گئے' مجھے بتایا گیا کہ یہ تینوں نیچے والے گیٹ کیپر ہیں۔ گیلری اور بکس والا گیٹ کیپر گھر میں نہیں ملا تھا' وہ نوجوان سب کو بلانے گیا تھا۔ وہ اس کے گھر کہہ آیا تھا کہ جونہی وہ آئے اسے سینما میں بھیج دیا جائے۔ بہر حال مجھے یہاں دال میں کچھ کالا نظر آیا۔

باقی تینوں سے سوال جواب کر کے یہ بات سامنے آئی کہ آخری شو کے بعد وہ تینوں ہال کا ایک چکر لگاتے تھے اور پھر دروازے بند کرتے تھے۔

اب اگر گیلری اور بکس والا بندہ سامنے ہوتا تو میں اس سے پوچھتا بھائی تمہاری کیا روٹین ہے؟

بہر حال اب میرا وہاں کام ختم ہو چکا تھا۔ گاڑی بھی آ چکی تھی' میں سینما کے مالک کو یہ تاکید کر کے کہ جونہی غیر حاضر گیٹ کیپر آئے اسے تھانے بھیج دیا جائے۔

خود تھانے میں واپس آ گیا۔ ابھی میں نے اپنی سیٹ سنبھالی ہی تھی کہ اے ایس آئی ابرار کمرے میں داخل ہوا اور سلام کر کے میرے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا میں نے مختصراً اسے حالات سے آگاہ کر دیا۔

"سر! بظاہر تو قاتل وہی لگتا ہے جو مقتول کے ساتھ فلم دیکھ رہا تھا۔"

"حالات تو اسی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں لیکن سینما میں واردات عجیب سا لگتا ہے۔"

"سر! میں نے یہ فلم دیکھی ہے اس میں کافی شور شرابہ ہے' خاص کر الیاس کشمیری صاحب کے ڈائیلاگ۔"

"لیکن مقتول ایک ہٹا کٹا جوان تھا' اتنی آسانی سے تو نہ مرا ہوگا پھر سب سے بڑی بات وجہ......؟"

"سر! ایک بات میں آپ کو بتا دوں کہ بکس اس طرح بنے ہوتے ہیں کہ ایک بکس کی آواز دوسرے بکس تک نہیں پہنچتی علاوہ ازیں فلم کے شور میں تو یہ کافی حد تک مشکل ہے لیکن پھر بھی آپ کی بات دل کو لگتی ہے کہ وہ آسانی سے تو نہیں مرا ہوگا۔"

"خیر جو کچھ ہے جلد سامنے آ ہی جائے گا' تم کھانا منگواؤ بڑی زور کی بھوک لگی ہے۔"

"سر! کھانا آیا ہی چاہتا ہے......"

دو منٹ بعد ہی کھانا آ گیا اور ہم محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً اس پر ٹوٹ پڑے پھر چائے کا دور چلا اور اس دوران میں نے اسے حکم دیا کہ وہ آج ہی کسی سپاہی کو ساتھ لے کر مقتول کے شہر چلا جائے اور تفتیش کر آئے اور انہیں اطلاع بھی دے آئے تاکہ کل جب لاش پوسٹ مارٹم کے بعد آئے تو اسے لے جائیں۔ وہ چلا گیا' میں نے اسے تاج محل بھی دکھا دیا تھا پھر اسے اپنی میز کی دراز میں رکھ کر تالا لگا دیا تھا۔

شام تک اس کیس کے سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی' غیر حاضر گیٹ کیپر بھی نہیں آیا بلکہ سینما سے یہ اطلاع آئی کہ وہ گھر آیا تھا اسے جونہی ساری بات بتا کر سینما جانے کو کہا گیا وہ گھر سے نکل گیا تھا لیکن نہ وہ سینما پہنچا تھا اور نہ ہی تھانے میں آیا۔

صورت حال کافی گمبھیر ہوئی جا رہی تھی' تھانے میں اور بھی کام ہوتے ہیں انہیں نمٹاتے نمٹاتے شام بلکہ تھوڑی رات ہو گئی ویسے بھی دن چھوٹے اور راتیں

بڑی ہوگئی تھیں۔

میں آرام کرنے اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔ مجھے امید تو یہی تھی کہ میرے آنے کے بعد اے ایس آئی ابرار آجائے گا اور وہ تھانے کا انتظام و انصرام سنبھال لے گا' آج کل وہ رات کو ڈیوٹی دیتا تھا اور آرام کرنے صبح سات بجے سے تین بج تک جاتا تھا۔ اگلی صبح جب میں تھانے پہنچا تو اسے اپنے کمرے میں منتظر پایا اس نے بتایا کہ وہ رات تقریباً دس بجے واپس آ گیا تھا' ہمارے تھانے سے مقتول کے شہر تک کا فاصلہ صرف پچاس میل تھا۔

اس سے یہ بھی پتا چلا کہ مقتول کا باپ اور ایک دور پار کا رشتہ دار بھی ساتھ ہی آ گیا تھا۔ میں نے مقتول کا شناختی کارڈ اے ایس آئی ابرار کو دے دیا تھا' اس لیے سارا کام آسانی سے ہو گیا تھا وہ یعنی مقتول کے لواحقین کسی قریبی ہوٹل میں ٹھہر گئے تھے اور اب ان کی آمد متوقع تھی۔

میں نے اے ایس آئی ابرار کو آج شام تک آرام کرنے کی اجازت دے دی' تقریباً نو سوا نو بجے مجھے اطلاع دی گئی کہ مقتول کے لواحقین آ گئے ہیں میں نے انہیں فوراً بلا لیا۔ دونوں شکل سے پریشان و مضطرب لگتے تھے جو کہ ظاہر ہے ایک فطری ردعمل تھا' ان کا جوان بیٹا اور رشتہ دار قتل ہو گیا تھا۔

اے ایس آئی ابرار نے مجھے اپنی تفتیش سے آگاہ کر دیا تھا' قارئین ابھی سوال و جواب سے ساری صورت حال آپ کے سامنے آیا ہی چاہتی ہے۔

مقتول کے باپ کی عمر پچاس سے تجاوز کر چکی تھی' رنگ کھلتا گورا اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں جب کہ دوسرا بندہ جو رشتے میں مقتول کا کزن تھا۔ اس کی عمر تیس سال کے قریب تھی رنگ سانولا اور نین

نقش واجبی سے تھے۔ انہوں نے موسم کے لحاظ سے گرم کپڑے زیب تن کیے ہوئے تھے اور کچھ صاحب حیثیت لگتے تھے۔

میں نے انہیں اپنے سامنے پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھنے کے لیے کہا' وہ بیٹھ گئے اور پریشان اور افسردہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگے پھر ان سے سوال و جواب کے سلسلے میں جو کہانی سامنے آئی وہ میں آپ کی خدمت میں پیش کر دیتا ہوں۔

عاشق دو بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا' گھر میں نہ بہت زیادہ پیسہ تھا اور نہ بہت کم۔ زندگی کے لوازمات بہت اچھے طریقے سے پورے ہو رہے تھے بلکہ یہ گھرانہ اگر تھوڑا سا امیر گھرانہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا' بقول اس کے باپ کے عاشق نے بی اے کیا تھا اور اس کی جاب بھی لگنے والی تھی لیکن اچانک اس نے یہ کہہ کر سب کو حیران کر دیا کہ وہ باہر جائے گا۔ اسے پیسے دیئے جائیں' باپ نے لاکھ سمجھایا کہ بیٹا اپنے ملک میں کیا نہیں ہے لیکن اس نے ایک نہ مانی اور آخر اپنی بات منوا کر ہی دم لیا۔

وہ چلا گیا باپ نے ایک ملک کا نام بتایا تھا جو نہ میری ڈائری میں کہیں درج ہے اور نہ اس وقت میرے ذہن میں آ رہا ہے' بہر حال وہاں جا کر عاشق ان کو خط لکھتا رہا لیکن پیسہ ایک بھی نہ بھیجا۔ اس طرح تین سال کا عرصہ گزر گیا پھر اس کے خط آنے بند ہو گئے گھر والے پریشان ہو گئے وہ اپنے طور پر پتا کرواتے رہے۔ سفارت خانے میں بھی گئے لیکن یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے عاشق کہیں گم ہو گیا ہے' کہیں سے کوئی تسلی بخش خبر نہیں ملی' اس طرح چھ سات ماہ کا عرصہ اور گزر گیا اور اب اچانک یہ اندوہناک اطلاع انہیں ملی اور وہ یہاں دوڑے آئے۔

میں نے انہیں چائے پانی پلا کر رخصت کر دیا اور ان سے اس ہوٹل کا پتا پوچھ لیا جہاں وہ مقیم تھا میں نے انہیں مقتول کی جیب سے برآمد ہونے والے تاج محل کے متعلق کچھ نہیں بتایا ابھی میں انہیں کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا' البتہ ایک بات طے ہو گئی تھی اور مجھے سو فیصد یقین ہو گیا تھا کہ عاشق کا قتل پیسے کے لیے نہیں ہوا تھا ورنہ قاتل اس کی جیب میں سونے کا تاج محل اور ایک بڑی رقم (اس زمانے کے لحاظ سے) چھوڑ کر نہ جاتا۔

مجھے غیر حاضر بلکہ اب اسے گمشدہ ہی کہنا چاہیے گیٹ کیپر کی تلاش تھی وہ منظر سے غائب کیوں ہوا تھا' کیا اس واردات کے ساتھ اس کا کوئی تعلق تھا یا کوئی اور بات تھی' ویسے اس کا حلیہ وغیرہ ہمیں پتا چل چکا تھا اور میں نے اس کا خاکہ وغیرہ بھی بنوا لیا تھا۔

تقریباً تین بجے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ موصول ہو گئی ساتھ تلاش بھی تھی جس ہوٹل میں مقتول عاشق کے لواحقین ٹھہرے ہوئے تھے وہ تھانے کے قریب ہی تھا بہر حال آدھے گھنٹے بعد وہ روتے دھوتے لاش لے کر چلے گئے اور میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میز پر پھیلا کر اس کا جائزہ لینے لگا۔ رپورٹ میں میرے کئی سوالوں کا جواب موجود تھا' لیجیے آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

مقتول کو رات گیارہ اور ساڑھے گیارہ بجے کے درمیان گلہ گھونٹ کر قتل کیا گیا تھا اور اس کے معدے میں خواب آور چائے پائی گئی تھی جبھی تو وہ زیادہ مزاحمت کیے بغیر موت کی آغوش میں چلا گیا تھا۔

بظاہر لگتا تو یہی تھا کہ قاتل اسے سوچے سمجھے

منصوبے کے تحت قتل کرنے سینما میں لایا تھا لیکن سینما میں ہی کیوں وہ اسے کہیں اور بھی قتل کر سکتا تھا۔ آدھی رات کو سینما میں قتل کرنے کی کیا وجہ یا مجبوری ہو سکتی تھی میں انہی سوالوں کے جنگل میں پھنسا ہوا تھا کہ اے ایس آئی ابرار کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"سر! کیا سوچ رہے ہیں؟"

"اوہ...... بھئی بیٹھو۔" اور جب وہ بیٹھ چکا تو میں نے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اس کے سامنے رکھ دی۔ رپورٹ پڑھ کر اس نے ایک گہری سانس لی اور رپورٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے سر کے بالوں کو ہاتھ سے سنوارتے ہوئے گویا ہوا۔

"سر! کچھ سوالوں کے جواب تو مل گئے ہیں لیکن یہ رپورٹ کچھ سوال بھی چھوڑ گئی ہے۔" اور جب اس نے میرے ساتھ سوال شیئر کیے تو یہ سوال میرے ذہن میں آنے والے سوالوں سے ملتے جلتے تھے۔

"بھئی! تمہاری سوچ کی گاڑی بھی اسی روٹ پر چڑھ رہی ہے جہاں پہلے ہی میری سوچ کی گاڑی کھڑی ہوئی ہے۔"

"پھر...... سر اب کیا کرنا ہے ویسے ایک بات ہے جو گڑبڑ ہے اس شہر میں ہے کیونکہ مقتول کے شہر میں میں نے جو تفتیش کی ہے وہاں مجھے ایسی کوئی بات معلوم نہیں ہوئی جس سے ثابت ہوتا کہ عاشق صاحب وہاں کسی لڑکی سے عشق کرتے تھے۔ میرے ساتھ وہاں کے تھانے کا مقامی اے ایس آئی بھی تھا۔" ابرار نے اپنی تفتیش کی کتاب کھول کر میرے سامنے رکھ دی۔

"تمہاری بات بالکل صحیح ہے کیونکہ حالات و واقعات اسی طرف اشارہ کر رہے ہیں اگر گیٹ کیپر مل جاتا تو...... خیر اس کے لیے تم ہی کچھ کرو گے۔" میں نے گیند اس کی کورٹ میں پھینکتے ہوئے کہا۔

"سر! میرے خیال میں اس کے باپ یا کسی قریبی رشتہ دار کو بلا کر تھانے میں بٹھا لیتے ہیں۔" اس نے اسی حربے کی طرف اشارہ کیا جو میں نے اپنی تفتیشی کہانی "انجام" میں آزمایا تھا۔

"تم جو مناسب سمجھو کرو لیکن مطلوبہ بندہ جلد از جلد حاضر ہونا چاہیے۔" میں نے اسے حتمی لہجے میں حکم دیا لیکن یہ اسی شام کی بات ہے کہ ہمارا مطلوبہ بندہ خود ہی آ گیا اس نے اپنا تعارف کروایا۔

"تھانیدار صاحب! میرا نام نذیر ہے اور میں سینما میں ڈیوٹی کرتا ہوں۔" میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور اس کی طرف پوری طرح متوجہ ہو گیا' وہ کہہ رہا تھا۔

"تھانیدار صاحب! میرا بکس میں قتل ہونے والے واقعے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" وہ یہاں تک ہی کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"پھر تم غائب کیوں ہو گئے تھے؟" میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

"دراصل مجھے تھانے سے بہت ڈر لگتا ہے اس کے علاوہ مجھ سے کچھ غلطیاں بھی ہوئی ہیں۔" اس نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

آگے بڑھنے سے پہلے اتنا بتا دوں کہ نذیر تھانے تک تو خود آیا تھا لیکن میرے کمرے تک اسے سپاہی بشارت لایا تھا جو میرے اشارے پر یہیں رک گیا تھا۔

"اچھا۔" میں نے ہنکارا بھرا۔ "کون سی غلطیاں بھئی' میرا مطلب ہے ایسی کون سی غلطیاں تم سے سرزد ہو گئی تھیں جنہوں نے تمہیں تھانے نہیں آنے دیا۔

"تھانے دار صاحب! اس دن بکس نمبر دس ریزرو تھا لیکن تھانے دار صاحب فلم شروع ہونے کے دس منٹ بعد تک بھی کوئی نہیں آیا' کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا

ہے اور اس کی وجہ کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ بہر حال اچانک دو آدمی آئے اور مجھ سے پوچھا' کیا کوئی بکس خالی ہے۔ میں نے انہیں کہا کہ ابھی تک بکس نمبر دس خالی ہے لیکن یہ ریزرو ہے' ہو سکتا ہے وہ آ جائیں۔

''دیکھو بھئی تم ہمیں بکس میں بٹھا دو ہم منہ مانگے دام دینے کو تیار ہیں۔'' جناب میں لالچ میں آ گیا اور میں نے انہیں اس شرط پر بکس دے دیا کہ اگر اسے ریزرو کروانے والے آ گئے تو انہیں اٹھنا پڑے گا۔''

''اور دوسری غلطی......؟'' میں نے اس کی مضطرب اور پریشان آنکھوں میں جھانکا۔

''میں آخری شو ختم ہونے کے بعد ہال اور بکس کا ایک چکر ضرور لگاتا تھا لیکن اس دن مجھ سے کوتاہی ہو گئی' دراصل اس رات میرے سر میں سخت درد تھا' تھانے دار صاحب اگر مجھے پتا ہوتا کہ......'' اس نے ایک جھرجھری سی لی اور رحم طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

''اگر جنہوں نے بکس ریزرو کروایا ہوا تھا وہ آ جاتے تو تم ان کے ساتھ کیا سلوک کرتے یعنی جنہیں تم نے بکس دیا تھا۔''

''جناب! گیلری میں چار پانچ کرسیاں فالتو پڑی رہتی ہیں' وقتِ ضرورت میں انہیں ہال کے کسی کونے یعنی خالی جگہ پر ڈال دیتا ہوں۔''

''اور یہ فالتو کمائی اپنی جیب میں ڈال لیتے ہو؟'' میں نے طنزیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے سر جھکا کر گویا اپنے جرم کا اقرار کر لیا لیکن اس کا یہ جرم اتنا بڑا بھی نہیں تھا کہ میں اسے حوالات میں بند کر دیتا۔ میں نے اسے چھوڑا نہیں بلکہ اسے سپاہی بشارت کے ساتھ کانسٹیبل کی بیرک میں بھیج دیا' جاتے جاتے وہ مجھے ایک بہت بڑا اشارہ دے گیا تھا۔

ابھی اسے بھیجے ہوئے تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ اے ایس آئی ابرار ایک عمر رسیدہ غریب سے آدمی کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوا اور ساتھ لائے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''سر! یہ گیٹ کیپر کے والد محترم ہیں۔''

''اچھا!'' میں نے بغور اس کا جائزہ لیا' اس کی شکل نذیر سے ملتی جلتی تھی اس کے کاندھے پر ایک پرانا سا رومال پڑا ہوا تھا۔

''بیٹھو بزرگو!'' میں نے نرم لہجے میں انہیں بیٹھنے کے لیے کہا

''تھانیدار صاحب! یقین کریں نذیر اس دن سے غائب ہے' جس دن سینما سے لاش ملی تھی۔'' وہ بہت غمزدہ اور پریشان لگتا تھا میں نے اسے زیادہ پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا اور ساری صورت حال اس کے گوش گزار کر دی۔

''اس وقت نذیر کدھر ہے' تھانے دار صاحب! کہیں آپ نے اسے حوالات میں تو بند نہیں کر دیا۔'' وہ بے ساختہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''بزرگو! بیٹھ جاؤ ابھی ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔'' پھر میں نے نذیر کو بلوا کر اس سے ملا دیا اور ساتھ ہی یہ بات بھی اس کے بھیجے میں بٹھا دی کہ ابھی اس کے بیٹے کو چھوڑا نہیں جا سکتا اور رخصت کر دیا۔

نذیر ہمارے قبضے میں آ چکا تھا اس کے دیئے ہوئے اشارے پر ہم نے کام کرنا تھا۔ اب اس سوال کی کوئی ضرورت نہیں رہ گئی تھی کہ وہ کہاں غائب رہا تھا کیونکہ غائب رہنے کی وجہ تو اس نے بتا ہی دی تھی اور یہ بات بھی بتائی تھی کہ وہ اس لیے خود ہی حاضر ہو گیا تھا کہ کہیں ہم اس کے گھر والوں کو پریشان نہ کریں وہ ایک جاگتا ذہن رکھتا تھا اور ہم نے اب

اس کے اس جاگتے ہوئے ذہن سے کام لینا تھا۔

اس رات اپنے کوارٹر میں جانے سے پہلے میں نے اے ایس آئی ابرار کو ہدایت کردی تھی کہ نذیر کا خیال رکھا جائے اور اسے کھانا وغیرہ کھلا دیا جائے۔

اگلی صبح جب میں تیار ہوکر تھانے پہنچا تو سردی کچھ بڑھ گئی تھی لیکن اب اتنی زیادہ بھی نہیں تھی کہ کوئلوں والی انگیٹھی کی ضرورت پڑتی۔

میں نے صبح کے ضروری کام نمٹانے کے بعد کانسٹیبل وزیر کو اپنے پاس بلایا اور اسے کچھ ہدایات دیں اور اسے اچھی طرح سمجھا دیا کہ اس نے کیا کرنا ہے۔

شام کو آ کر اس نے مجھے ایک حوصلہ افزا رپورٹ دی۔ اب میدان تیار تھا اور ہم نے تفتیش کے گھوڑے کو اس میں اتارنا تھا اور اس گھوڑے کی لگام ایک مخبر عورت کے ہاتھ میں دینی تھی۔

مخبر عورت نے ہمارا کام کردیا لیکن ابھی شک وشبے والی بات تھی، کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جاسکتی تھی۔

بہرحال یہ اس شام کی بات ہے کہ ہم جوتوں کی ایک بہت بڑی دکان پر پہنچ گئے، یہ دکان اتنی بڑی تھی کہ تقریباً تین منزلوں پر جوتے ہی جوتے تھے ظاہر ہے ہم یہاں جوتے خریدنے تو آئے نہیں تھے۔

کاؤنٹر پر ایک فربہ سا آدمی جس کی عمر ساٹھ کے قریب رہی ہوگی بیٹھا ہوا تھا وہ کاؤنٹر سے ذرا پیچھے ہی تھا لیکن اس کی توند کاؤنٹر کے ساتھ لگ رہی تھی۔

میرے ساتھ کانسٹیبل وزیر تھا، ہم سادہ کپڑوں میں تھے اور بظاہر ایسے دکان میں داخل ہوئے تھے جیسے گاہک ہوں۔

جو معلومات مجھ تک پہنچی تھیں ان کا تقاضہ یہی تھا راستے میں ہم نے ساری باتیں طے کرلی تھیں اور اپنے اپنے کردار کے متعلق سیر حاصل بحث کرلی تھی۔

ہم سیدھے دوسری منزل پر چلے گئے وہاں پر بھی ایک کاؤنٹر بنا ہوا تھا اور وہاں ایک تیکھے تیکھے نقوش والا جوان جس کی عمر تیس سال کے قریب لگتی تھی۔ بیٹھا گاہکوں سے پیسے وصول کررہا تھا، اِدھر اُدھر دو تین لڑکے گاہکوں کو جوتے وغیرہ دکھا رہے تھے۔ جوان کے نین نقش نیچے بیٹھے فربہ آدمی سے ملتے جلتے تھے، ہم سیدھے جوان کے پاس چلے گئے۔

''آئیں جناب!'' اس نے کاروباری مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے ہمارا استقبال کیا۔

ہماری معلومات کے مطابق یہ منزل امپورٹڈ شوز کے لیے مختص تھی، ہم نے اپنی وضع قطع ذرا امیرانہ بنائی ہوئی تھی اس نے ہمیں بڑی اسامی سمجھتے ہوئے ہمارے لیے دو کرسیاں وہاں ڈلوادیں۔ جب ہم بیٹھ چکے تو اس نے ایک لڑکے کو آواز دیتے ہوئے کہا۔

''اوئے غفورے اِدھر آؤ۔ یہ صاحب لوگ آئے ہیں انہیں شوز کی اچھی سی ورائٹی دکھاؤ اور سرفراز کو بھیج کر دودھ پتی منگوالو۔''

ہم نے اس کے پاس بیٹھ کر بات چیت کرنی تھی اور ہمیں کچھ وقت اس کے گزارنا تھا اس لیے ہم نے معلومات کے تحت خاموشی اختیار کرلی لیکن اسے اتنا کہا، ''بھئی ہمیں کوئی جلدی نہیں، غفور کو گاہکوں سے فارغ ہونے دو۔ ہم ذرا اطمینان سے شوز دیکھیں گے دراصل ہمیں شادی کے لیے شوز چاہئیں' وہ ہماری چال میں آگیا دوسرے اسے یہ نظر آرہا تھا (بظاہر) کہ ہم سے اسے ایک معقول آمدنی ہونے والی ہے' کچھ دیر کے بعد دودھ پتی آگئی۔

کانسٹیبل وزیر نے پیالی اٹھاتے ہوئے اپنا طے شدہ کردار ادا کیا۔

''آج کل فلم کی بڑی دھوم ہے۔ کیا آپ کو بھی فلموں سے دلچسپی ہے؟''

''بالکل جناب! میں نے......؟'' اچانک وہ

خاموش ہوگیا‘ اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا تھا۔

’’پچھلے دنوں بکس میں ایک قتل بھی ہوا تھا‘ جس کی وجہ سے اردگرد کافی خوب و ہراس پھیل گیا تھا۔‘‘ میں نے اپنی پیالی سے گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

’’اوہ جناب! آپ بھی کون سی بات لے کر بیٹھ گئے......‘‘ اس نے اس موضوع سے پہلوتہی کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا اور ہم نے واضح طور پر اس کی آنکھوں میں خوف اور تشویش کو ہلکورے لیتے دیکھا۔

قارئین اب یہاں یہ بات بتانے کا وقت آ گیا ہے کہ ہم یہاں تک کیسے پہنچے۔

نذیر (گیلری اور بکس کے گیٹ کیپر) نے ہمیں بتایا تھا کہ مقتول کے ساتھ اس نے جس جوان کو دیکھا تھا اسے اس نے فلاں شوز کی دکان میں دیکھا تھا اور لگتا یہی ہے کہ وہ اس دکان کے مالک کا بیٹا ہے۔

ہم اسے ڈائریکٹ تھانے میں بھی بلوا سکتے تھے لیکن ہم نے پہلے حالات کا جائزہ لینا چاہا۔ دوسرے یہ خدشہ بھی تھا کہ وہ غائب نہ ہو جائے اس کے بعد ہم نے اپنا تعارف کروایا تو وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہمیں دیکھنے لگا‘ ہم نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ ہم یہاں تک کیوں پہنچے ہیں‘ ہم اسے لے کر تھانے میں آ گئے۔ ہم کتنے تردد کے ساتھ اسے لائے ہوں گے اس کا اندازہ ذہین قارئین خود ہی لگا لیں۔ البتہ اتنا بتا دیتا ہوں کہ چونکہ اس کے دل میں چور تھا اس لیے اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

’’مجھے امید نہیں تھی کہ میں پکڑا جاؤں گا‘ میں نے چائے لانے والے لڑکے سے تو چہرہ چھپا لیا تھا لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ گیٹ کیپر مجھے پہچانتا ہے اور وہ آپ کو یہاں تک کا راستہ دکھا سکتا ہے۔‘‘

میں نے تھانے میں آتے ہی اسے حوالات میں بند کر دیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد اس کا باپ (یہ وہی بڑی توند والا بندہ تھا جو نچلی منزل میں کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا تھا) اس نے مجھے ایک بہت بڑی رشوت کی پیشکش کرتے ہوئے کہا۔

’’تھانیدار صاحب! شکیل نے مجھے ساری صورت حال بتا دی تھی‘ یہ مجبور ہوگیا تھا یہ سب کچھ کرنے کے لیے‘ آپ اس کی کہانی سن لیجیے اور پرچہ ذرا ہلکا بنا دیں‘ باقی کام میں خود کرلوں گا۔‘‘ میں نے اسے آرام سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

’’سیٹھ صاحب! پیسے سے ہر چیز نہیں خریدی جاسکتی‘ آپ جا کر اپنا کام کریں اور ہمیں اپنا کام کرنے دیں۔‘‘ اور اسے چلتا کر دیا۔

آدھی رات کو ہم نے شکیل کو بلا لیا اور اس سے اس کی کہانی سن لی۔ لیجیے قارئین آپ بھی پڑھ لیجیے انسان کی نفسیات کیسے کیسے گل کھلاتی ہے اور انسان کو مجبوراً کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ عاشق کے شہر میں جو کالج تھا وہ صرف ایف اے/ ایف ایس سی تک تھا یہاں قائم یونیورسٹی میں آ کر اس نے بی اے میں داخلہ لیا۔ شکیل نے بھی انہی دنوں اس یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا پھر چند ماہ بعد ہی دونوں گہرے دوست بن گئے۔ شکیل امیر ماں باپ کا بیٹا تھا اس کے پاس کار تھی جب کہ عاشق متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ یونیورسٹی کے ہاسٹل میں رہائش پذیر ہوگیا۔ جوانی کا دور ایسا ہوتا ہے کہ ہر چیز ہری ہری نظر آتی ہے ایک دن بازار میں عاشق کی ملاقات نورین سے ہوگئی ایک شاپنگ سینٹر میں وہ اپنے لیے ریڈی میڈ پینٹ شرٹ خریدنے گیا تو وہاں نورین کچھ چیزیں خریدرہی تھی۔ چیزیں خریدنے کے بعد اسے پتا چلا کہ وہ گھر سے چلتے وقت اپنے پرس میں پیسے ڈالنے تو بھول ہی گئی تھی۔ اسی دوران عاشق

پینٹ شرٹ پیک کروا کے بل ادا کرنے کاؤنٹر کی طرف آیا جہاں نورین کہہ رہی تھی۔

''اوہ سوری جناب! میں پیسے لانا تو بھول ہی گئی' یہ چیزیں آپ فی الحال سائیڈ پر رکھ لیں میں کل آ کر بل دے کر لے جاؤں گی۔''

عاشق کو آج ہی اپنے گھر والوں کی طرف سے فیس اور خرچ کے لیے منی آرڈر ملا تھا اور وہ نورین کی شخصیت سے متاثر ہو چکا تھا اس نے نورین سے کہا۔

''خاتون! اگر آپ اجازت دیں تو پے منٹ میں کردوں آپ مجھے بعد میں واپس کر دیجیے گا۔''

قصہ مختصر عاشق نے پے منٹ کر دی اور اس کے بعد وہی ہوا جو ازل سے ہوتا ہے یعنی دونوں کو محبت ہوگئی' جوانی ایسی ہی ہوتی ہے دونوں ملنے لگے۔ عاشق نے اپنے دوست شکیل سے بھی اپنی محبت کا ذکر کر دیا۔ محبت بڑھتے بڑھتے عشق میں داخل ہوگئی بقول اس گانے کے رفتہ رفتہ وہ میری ہستی کا ساماں ہوگئے...... دونوں دوستوں نے نورین کا گھر بھی دیکھ لیا' وقت پَر لگا کر اڑ گیا اور وہ دن آ پہنچا جب عاشق اور شکیل نے بی اے کا آخری پیپر بھی دے دیا' اس دن عاشق بہت اداس تھا وہ ایک پارک میں نورین سے ملا یہ وہی پارک تھا جس میں دونوں اکثر ملتے رہتے تھے۔ آج حالات اور تھے وقت مختلف تھا عاشق کو فی الحال نورین سے رخصت ہونا تھا' نورین بھی متوسط طبقے سے تعلق رکھتی تھی لیکن وہ محلوں کے خواب دیکھتی تھی جب آج عاشق نے اسے یہ کہا۔

''نورین میں بہت جلد اپنے والدین کو تمہارے گھر بھیجوں گا۔'' تو اس نے عاشق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''دیکھو میں آج تمہیں ایک بات بتا دیتی ہوں کہ میں چاہتی ہوں تم پہلے اچھی سی ملازمت کرو پھر میرے لیے ایک خوب صورت بنگلہ بنواؤ اور تب اپنے والدین کو میرے گھر بھیجنا۔'' عاشق نے حیران نگاہوں سے نورین کی طرف دیکھا تو وہ بولی۔

''محبت امتحان بھی لیتی ہے' دیکھو شاہجہان نے اپنی محبت کے لیے تاج محل بنوایا تھا تم میرے لیے ایک چھوٹا سا بنگلہ نہیں بنوا سکتے۔''

''ٹھیک ہے نورین! تم میرا انتظار کرنا۔'' وہ نورین سے رخصت ہو گیا گھر آ کر وہ کئی مہینے سوچتا رہا اس دوران بی اے کا رزلٹ بھی آ گیا۔ وہ فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو گیا تھا' وہ شکیل کے شہر جا کر اس سے ملا (وہ بھی پاس ہو گیا تھا) اور ساری صورت حال اس کے گوش گزار کر دی۔

''بھئی میں تو کہتا ہوں کہ تم باہر چلے جاؤ پھر اتنا پیسہ کما کر واپس آنا جس سے نورین کی خواہش پوری کر سکو۔''

عاشق باہر چلا تین سال اس کے خط آتے رہے اس کے بعد خط آنے بند ہو گئے پھر اس کے بعد تقریباً چھ سات ماہ کا عرصہ اور گزر گیا ایک دن اچانک شکیل عاشق کو اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گیا اور اس سے نظریں چرانے لگا۔ دراصل تین ماہ پہلے نورین اس کی بھابی بن چکی تھی جب کوئی بات ہونی ہوتی ہے تو سبب خود بخود بن جاتا ہے۔ شکیل کی ماں نے اپنے بڑے بیٹے شرجیل کے لیے رشتے کروانے والی ماسی سے کہہ رکھا تھا اُدھر نورین عاشق سے مایوس ہو چکی تھی جب اس کے لیے رشتے کی بات چلی اور اسے بتایا گیا کہ لڑکا ایک اعلیٰ افسر ہے اور سرکاری بنگلے کے علاوہ اس کا ایک ذاتی بنگلہ بھی ہے تو اس نے ہامی بھر لی اور اس طرح نورین شرجیل کی بیوی اور شکیل کی بھابی بن گئی۔ اب یہاں سے قسمت کی ستم ظریفی شروع ہوئی ہے عاشق نے

شکیل کو بتایا کہ وہ تین سال ٹھیک ٹھاک کام کرتا رہا اس نے چھٹی لی اس کے پاس کافی رقم جمع ہوگئی تھی رات کو اس نے ساری دولت بریف کیس میں رکھ لی لیکن اسی رات اس کے گھر ڈاکہ پڑ گیا اور ڈاکو اس کی ساری جمع پونجی لے گئے اور اسے باندھ کر چھوڑ گئے اس کی دنیا اندھیر ہوگئی اس کے خواب بکھر گئے۔ دوسرے دن وہ خود ہی گھسیٹتا ہوا دروازے تک آیا اس طرح پڑوسیوں نے اسے آ کر کھولا۔

کئی دن وہ باؤلا باؤلا پھرتا رہا' اس کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں کہ وہ واپس پاکستان آ سکتا۔ مجبور اس نے دوبارہ کام پر جانا شروع کر دیا۔ اسے کچھ ہوش نہ رہا کہ خط وغیرہ کا سلسلہ دوبار شروع کرتا چھ سات ماہ بعد اس کے پاس اتنے پیسے جمع ہو گئے کہ وہ آسانی سے واپسی کا ٹکٹ کٹوا سکتا تھا۔ اس نے حساب لگایا تو اندازہ ہوا پیسے بچ بھی جائیں گے اس کے ذہن سے نورین کے تاج محل والی بات محو نہیں ہوئی تھی اس نے سونے کا ایک خوب صورت سا تاج محل بنوایا اور چاندی سے اس کے اوپر شعر لکھوایا۔

یہاں ایک بات کی وضاحت کر دوں کہ تاج محل کے متعلق عاشق نے شکیل کو نہیں بتایا تھا البتہ باقی کہانی سنا کر کہا کہ وہ نورین کے متعلق بتائے کہ وہ کیسی ہے؟ علاوہ ازیں اس کے ساتھ ملاقات کرا دے' اب شکیل کے ہاتھ پاؤں پھول گئے کہ وہ اسے کیا جواب دے؟ اس کا ذہن ماؤف ہوگیا' بڑے بھائی شرجیل اسے بہت پیارا تھا اور وہ نورین کو اپنی بھابی کے طور پر دل و جان سے قبول کر چکا تھا۔ کچھ دن سے اس تک فلم ''ضدی'' کی دھوم پہنچ رہی تھی اس نے پہلے عاشق کو ایک اچھے سے ہوٹل میں کھانا کھلایا اور اس سے کہا۔

''یار بڑی زبردست فلم لگی ہے' آخری شو دیکھتے ہیں۔ اس وقت نورین سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔'' پھر جب وہ سینما کی طرف روانہ ہوئے تو اچانک شکیل کو یاد آ گیا کہ صبح شرجیل نے کہا تھا کہ رات کو آتے ہوئے وہ خواب آور گولیاں لے آئے' اسے بے خوابی کی شکایت تھی اور کبھی کبھی وہ خواب آور گولیاں استعمال تھا تھا بہرحال راستے سے شکیل نے خواب آور گولیاں لے لیں اور وہ سینما کے بکس میں آ کر بیٹھ گئے' بقول شکیل کے اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ وہ عاشق کو قتل کر دے گا وہ تو بس کسی طریقے سے یہ چاہتا تھا کہ مناسب الفاظ اور طریقے سے عاشق کو صورت حال سے آگاہ کر دے۔ آف ٹائم سے ذرا پہلے اس نے بات اس طرح شروع کی۔

''یار اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ نورین کسی کی ہو چکی ہو تو......؟''

''کیا مطلب؟'' عاشق نے چیخ سے مشابہہ آواز میں کہا۔ ''تم کب سے اس سے نہیں ملے؟''

''کافی عرصہ ہوگیا ہے' سال سے اوپر ہوگیا ہے۔'' شکیل نے جھوٹ بولا۔

''دیکھو شکیل! میں دونوں کو قتل کر دوں گا اور خود پھانسی چڑھ جاؤں گا۔'' عاشق نے سنگین لہجے میں کہا۔

ادھر یہ بات سن کر شکیل کے دماغ کا فیوز اڑ گیا اور اس نے ایک بھیانک فیصلہ کیا' خواب آور گولیاں اس کے پاس تھیں' آف ٹائم میں چائے منگا کر اس نے عاشق کی پیالی میں تین چار گولیاں ملا کر اسے پلا دیں اور پھر جو کچھ ہوا آپ کے علم میں آ چکا ہے۔

میرے خیال میں کافی باتیں عاشق اپنے دل میں ہی لے کر چلا گیا تھا۔

بے رحم دوست

انجم فاروق ساحلی

اگر دولت کے ساتھ انسانوں کو پرکھنے کی صلاحیت نہ ہو تو وہ دولت وقت سے قبل اپنا راستہ تبدیل کرلیتی ہے۔
ایک دولت مند کا قضیہ' اس نے خود اپنے دوست کو ڈکیتی کی دعوت دی تھی۔

میں نے نگاہ اٹھا کر شہریار کی صابن فیکٹری کی عمارت اور کچھ فاصلے پر رائے ونڈ روڈ پر واقع چار کنال کی عالی شان رہائش گاہ کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

وہ اپنی محنت، لگن اور مستقل مزاجی سے کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا اور میں اپنے فراڈ یا بددیانتی' تساہل پسندانہ طبیعت اور بدنیتی کی وجہ سے آج بھی وہیں کا وہیں تھا۔ جہاں سے پچیس برس قبل مستقبل کا آغاز کیا تھا۔

شہریار نے اپنے وطن پاکستان میں محنت سے نام اور مقام حاصل کرلیا تھا اور میں بیس برس یورپ میں رہنے کے بعد واپس لوٹا تو فراڈ' کرپشن' بددیانتی اور منشیات فروشی جیسے داغ میری شخصیت کا حصہ بن چکے تھے۔ میں لندن سے بمشکل جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہوا تھا اور اب یہ سوچ رہا تھا کہ اپنے ملک میں کوئی لمبا ہاتھ مارلوں' باہر کے مقابلے میں یہاں قانون کو خریدنا' استعمال کرنا اور دھوکا دینا بھی آسان تھا۔ میں کل ہی لوٹا تھا اور آج ہی معلومات حاصل کر کے اپنے دوست تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا تھا وہ اب سماجی رہنما بھی بن چکا تھا اور معاشرے میں اچھی خاصی پہچان حاصل کرچکا تھا۔

میرے استفسار پر میرے پرانے محلے دار نے شہریار کی تصویر والا اخبار دیا تھا کہ وہ اب سماجی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں اور آئیڈیل سوپ فیکٹری کے مالک ہیں۔ میں نے تصویر دیکھ کر فوراً پہچان لیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک دو اور دوستوں سے بھی اس کے متعلق سن رکھا تھا کہ بڑا آدمی بن چکا ہے۔

میں آگے بڑھا اور صابن فیکٹری کے گیٹ پر پہنچا اور گارڈ سے یہ کہا کہ ...... "میں شہریار کا بچپن کا دوست شہزاد ہوں اور کل ہی یورپ سے واپس آیا ہوں' جلد اندر اطلاع کرو۔" گارڈ مجھے گھورتا ہوا قریب میں بنی ہوئی چھوٹی سی لکڑی کی چوکی میں گھس کر فون پر صاحب کے سیکرٹری سے بات کرنے لگا۔ سیکرٹری نے شہریار کی اجازت پا کر سیکیورٹی گارڈ سے کہا کہ فوراً اندر بھیج دو۔

"جایئے صاحب!" گارڈ نے مسکراتے ہوئے ادب سے گیٹ کے چھوٹے دروازے کو دھکیل کر اندر جانے کا اشارہ کیا پھر آواز دے کر ایک ملازم کو ساتھ بھیج دیا۔ وہ اب بھی مجھے گھور رہا تھا وہ اس معاملے میں حق بجانب تھا۔ میری اور شہریار کی شکل وصورت' ایک دوسرے سے ملتی جلتی تھی' قدوقامت بھی ایک جیسا تھا' رنگ روپ اور بالوں کا ہیئر اسٹائل بھی تقریباً ایک دوسرے سے مشابہ تھا۔ اس لیے تلاشی کے بغیر داخلے کی اجازت مل گئی تھی۔

میں فیکٹری کے گیراج نما حصے سے گزر کر ایک چوڑی روش پر ملازم کے پیچھے قدم اٹھانے لگا۔

دونوں جانب گھاس کے سرسبز میدان ساتھ چل رہے تھے اور ان سے پرے دونوں طرف بڑے بڑے کمرے برابر واقع تھے۔ جن میں بہت سے مزدور اور کاریگر صابن بنانے اور پیکنگ میں مصروف تھے۔ ایک عمارتی بلاک میں ایک جگہ کمپنی کا ڈائریکٹر صابن کی ٹکیوں پر کمپنی کی مہر پرنٹ کرر ہا تھا۔ ایک طرف کچھ کاری گر صابن کمپنی کی مشہوری کے رنگا رنگ پوسٹر اور بینر، فلیکس بورڈ وغیرہ تیار کرر ہے تھے۔

شہر یار کا کام زوروں پر تھا۔ میرے دل میں حسد کی ٹیس سی اٹھنے لگی۔ شہر یار اس کے حواس پر چھایا ہوا تھا۔

☆☆......☆☆

آفس میں داخل ہوا تو شہر یار ''شہزاد شہزاد میرے یار'' کہتا ہوا بازو پھیلا کر اپنی ریوالونگ چیئر سے اٹھا اور لمبی میز کے پاس سے گزر کر سامنے آ کھڑا ہوا۔ میں بھی چہرے پر خوشی کے جذبات لیے آگے بڑھا۔ ''میرے یار تم تو بن گئے بڑے آدمی'' میں اس کے پھیلے ہوئے بازوؤں میں سما گیا۔

''یار تم کب آئے؟'' شہر یار نے سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''کل ہی آیا ہوں اور اب توبہ کر لی ہے باہر کے ارادوں سے۔''

''وہ کیوں؟'' شہر یار نے مسکرا کر پوچھا۔

''مجھے ملک چھوڑنا راس نہیں آیا۔ میں نے یورپ میں کئی کام کیے، پیسہ کمایا لیکن پھر پیسہ نقصان کے ذریعے نکلتا چلا گیا اور آج میں قلاش اور پریشان ہو کر واپس لوٹا ہوں۔ میری جیب میں صرف چند ہزار روپے ہیں۔''

''تم بالکل فکر نہ کرو، اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ اس فیکٹری میں تمہیں سیٹ کر دیں گے، میں نے تو تمہیں پہلے بھی رابطہ ہونے پر مشورہ دیا تھا کہ اپنا ملک اپنا ہی ہوتا ہے۔ واپس آ جاؤ، اللہ تمہارے نصیب یہاں بھی کھول دے گا۔''

''ہاں یار تم ٹھیک کہتے ہو، میں کمانے کے باوجود وہاں سکھی نہیں رہ سکا۔ وہ مشینی زندگی ہے ذرا سی اونچ نیچ ہوئی اور انسان بہت دور جا گرتا ہے۔ اب میں نے ملک نہ چھوڑنے کا تہیہ کر لیا ہے۔''

شہر یار نے بٹن دبا کر ملازم کو طلب کیا اور گولڈ ڈرنک اور کیک پیزا لانے کے لیے کہا۔ جلد ہی بھاپ اڑاتی چائے کا دور بھی چلنے لگا۔ ہم کھانے پینے سے فارغ ہوئے تو شہر یار نے گھڑی دیکھی۔ شام کے چھ بج چکے تھے۔ چنانچہ اس نے دو گھنٹے قبل ہی مجھے ساتھ لے کر گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ کچھ کام اس نے آفس سیکرٹری کو سمجھا دیے۔ فیکٹری ایریا کے پارکنگ پر اس کی نئی پجارو کھڑی تھی۔ میں اس کے مقابل آ بیٹھا۔ گاڑی پروقار انداز سے فیکٹری کے بیچ واقع سڑک سے گزرتی ہوئی گھاس کے سرسبز و شاداب میدانوں کے درمیان چلنے لگی۔ رہائشی عمارت کے قریب آتے ہی سڑک کے دونوں جانب پودوں پر رنگ برنگ کے کھلے ہوئے پھول جھوم جھوم کر نظروں میں شادابی پیدا کرنے لگے۔ یہاں الیکٹرک پول پر لگی روشنیاں اجالا کیے ہوئے تھیں۔

میں شہر یار کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ میری سٹی گم ہو گئی۔ کاش یہ سب کچھ مجھے مل جائے اور میں اس شاندار اور پروقار زندگی سے لطف اندوز ہو سکوں۔ میرے ذہن میں ایک خطرناک سانپ رینگنے لگا۔

شہر یار نے پجارو باہر ڈرائیو وے پر ہی کھڑی

کردی۔ ہم نیچے اترے میں نے ماحول کا طائرانہ جائزہ لیا۔ وہ تین طرف گھاس کے میدانوں میں گھری ہوئی ایک شاندار سفید عمارت تھی جو روشنیوں سے جگمگاتی ہوئی کسی کنواری کا حسین خواب معلوم ہوتی تھی۔ عمارت کی عقبی جانب ایک سرسبز وشاداب باغ پھیلتا چلا گیا تھا۔ جہاں ایک ملازم جانوروں کو ہانک رہا تھا۔ دور کے منظر میں کچھ چھوٹے چھوٹے جانور بھی متحرک دکھائی دیئے۔ شہریار نے بتایا کہ وہ جنگلی بطخیں ہیں۔

"یار! تم نے تو ایک اچھی خاصی جاگیر بنا رکھی ہے۔"

"بس یار اللہ کا کرم ہے جب اس نے دینا ہو تو خود بخود راستے بنا تا چلا جاتا ہے اور انسان خود ہی حیران رہ جاتا ہے۔"

داخلی دروازے پر دو گارڈ موجود تھے۔ انہوں نے جھک کر سلام پیش کیا۔ ہم دونوں سنگ مرمر کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دروازے کے سامنے پہنچے گارڈ ادھر ادھر سرک گئے۔ عمارت سطح زمین سے کچھ بلندی پر واقع تھی۔ شہریار نے اطلاعی گھنٹی بجائی۔ ایک باوردی ملازم نے دروازہ کھولا اور پیچھے ہٹ کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔ آراستہ وپیراستہ مقامات سے گزرتے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو ہر چیز سے امارت جھلکتی نظر آئی۔ فرش پر نرم مخملی قالین' چھت پر بیش قیمت فانوس' قیمتی فرنیچر' صندل اور آبنوس کی میزیں اور الماریاں میزوں پر موجود گلدانوں میں تازہ گلاب مہک رہے تھے۔ میں نے ایک حسرت بھری آہ بھرتے ہوئے بائیں جانب دیوار کے قریب اسٹینڈ پر موجود شیشے کے باکس میں رنگین مچھلیوں کو تیرتے ہوئے دیکھا۔ کمرے کے دائیں جانب شیشے کی شفاف دیوار کے پار موجود آبشار ہمارے اندر داخل ہوتے ہی ہلکی آواز کے ساتھ بہنے لگی۔

میں پھٹی پھٹی نظروں سے اس کے ٹھاٹ دیکھ رہا تھا۔ اس نے مجھے عمارت کی سیر بھی کروائی۔ بالکونیوں اور کھڑکیوں سے لان کے سرسبز وشاداب مقامات' نہانے کے تالاب' شطرنج گاہ اور گھوڑوں کو ہری ہری گھاس چرتے ہوئے دیکھا۔ شہریار کو گھڑسواری کا بچپن سے شوق تھا۔ میرے تصور کے پردے پر وہ لکڑی کا گھوڑا رینگنے لگا جس پر سوار ہو کر شہریار بچپن میں اپنے گھر کے صحن کا چکر لگایا کرتا تھا۔

واپس ڈرائنگ روم میں آئے تو سامنے حائل خوشنما پردہ سمٹ گیا اور ڈائننگ ٹیبل پر انواع واقسام کے کھانے چنے ہوئے دکھائی دیئے۔ نیلم ہماری منتظر تھی۔

"السلام علیکم بھابی" میں مسکرا کر آگے بڑھا اور شہریار کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گیا۔ شہریار نے ہمارا باقاعدہ تعارف بھی کروادیا۔

"آپ تو کمال کے آدمی ہیں۔" اس نے سر سے پاؤں تک مجھے دیکھتے ہوئے بے تکلفانہ لہجے میں کہا۔ "آپ تو سرتاپا شہریار کے ہم شکل دکھائی دیتے ہیں۔ صرف داڑھی مونچھوں کا فرق ہے۔"

"ہاں بھابی ہم دونوں ایک دوسرے کی کاربن کاپی ہیں اور قدرت نے ایک ہی ڈائی سے ہمیں بنایا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو یہ محسوس کیا کہ وہ کچھ ناآسودہ سی ہے۔ شاید بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ شہریار اس کے معیار پر پورا نہیں اتر رہا تھا۔ وہ بے حد خوبصورت اور پرکشش عورت تھی۔ جس کی تمنا کسی بھی مرد کے دل میں پیدا ہوسکتی تھی۔

اس وقت ایک لڑکا بھی کھیلتا کودتا ہوا آ پہنچا اور سامنے واش بیسن سے ہاتھ دھو کر بیٹھ گیا۔ ”یہ میرا بیٹا عمران ہے۔ میٹرک میں پڑھتا ہے اور کھیل کود کرکٹ فٹ بال، بیڈمنٹن کا شوقین ہے اور جاسوسی کہانیوں اور ناولوں کا تو یہ دیوانہ ہے۔“ شہریار نے تعارف کرایا۔

لڑکا بڑا خوبصورت تھا لیکن وہ نیلم شہریار کا بیٹا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ شہریار کی پہلی بیوی سے پیدا ہوا تھا جو ایک حادثے میں فوت ہو گئی تھی۔ کچھ خبریں مجھے ایک دوست سے ملتی رہتی تھیں۔ جس سے میں اپنی بیوی اور ماں کے متعلق رپورٹ لیا کرتا تھا۔ میری ماں اب فوت ہو چکی تھی اور باپ تو کب کا ہمیں چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ بیوی کو میں نے طلاق بھجوا دی تھی وہ اس کا تقاضہ کرتی تھی۔

❁ ❁ ❁

کھانے کے بعد ایک شاندار کمرے میں میری رہائش کا انتظام کر دیا گیا۔ ملازم کے لیے قریب ہی بیل موجود تھی۔ صبح شہریار نے میری دیوالیہ کاروباری پوزیشن کو دیکھ کر مجھے آفس اور گھر میں اپنا سنیئر سیکرٹری تعینات کر دیا اور اس طرح ایک شیطانی منصوبہ میرے ذہن میں تیار ہونے لگا۔

میں اب آسانی سے شہریار کا روپ دھار سکتا تھا اور اس کے دستخطوں کی نقل بھی اتارنے کی کامیاب مشق کر چکا تھا۔ اس کام میں مجھے کافی مہارت اور تجربہ تھا۔ مجھے ملازمت کرتے ہوئے ایک ہفتہ گزر گیا۔ ہفتے کی صبح میں جلد بیدار ہو کر شہریار کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ آج شام وہ ریڈیو اسٹیشن پر مالیاتی پالیسی پر گفتگو کرنے والا تھا۔ پھر وہاں سے فارغ ہو کر اسے اپنے چھوٹے بھائی عرفان کے پاس قصور جانا تھا۔

وہ نہانے دھونے ناشتہ کرنے اور اپنے جونیئر سیکرٹری کو ہدایات دے کر میرے کمرے کی طرف آیا۔ میں باہر برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ ہم عقبی زینے کی طرف بڑھے، نیچے اترے اور صحن عبور کر کے عقبی گیٹ سے نکل کے باغ میں سیر کرتے ہوئے دور نکل آئے۔ سبزہ ہریالی او پھولوں کی مہک سے ماحول بڑا خوشگوار معلوم ہو رہا تھا۔ پرندے درختوں پر چہچہاتے ہوئے موسیقی کا رس کانوں میں ٹپکا رہے تھے۔ گھاس پر شبنم کے قطرے موتیوں کی مانند چمک رہے تھے۔ ہوا ٹھنڈی اور تیز تھی۔ سخت سردی کا موسم تھا۔

شہریار کی جاگیر دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ درختوں کی بھرمار تھی۔ پودوں اور پھولوں کی دیکھ بھال کے لیے کئی مالی رکھے ہوئے تھے ان سب مالیوں کا انچارج رحمت مالی تھا۔ چند گز کے فاصلے پر شہریار نے درختوں میں پھولوں کے کنج کے پاس چرتے ہوئے ایک مویشی کو دیکھا تو اس کا موڈ یکدم خراب ہو گیا۔ وہ باغ میں جانوروں کی آمد قطعی پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ رحمت اور دوسرے مالیوں کو سخت سست کہنے لگا۔ وہ بد انتظامی پر غصے میں دکھائی دے رہا تھا۔

”شہریار ادھر دیکھو، میں نے دور تمہارے ہٹ میں کسی آدمی کی جھلک دیکھی ہے۔ ہو سکتا ہے اس نے جانور چھوڑ رکھا ہو“ اتنی بات شہریار کو غصہ دلانے کے لیے کافی تھی کہ اس کا باغ ہو اور کوئی عام آدمی جانور چرنے کے لیے چھوڑ دے۔ اس طرح تو پورا باغ اور جاگیر عام لوگوں کی گزرگاہ اور چراہ گاہ بن جائے گی۔ وہ خشمگیں نگاہوں سے ہٹ کا جائزہ لینے لگا۔ میں تیزی سے ہٹ کی

طرف بڑھنے لگا پھر ایک جگہ اشارہ کرتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا۔ جو میرے منصوبے کا سب سے اہم مرکز تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا میری توقع کے مطابق شہریار پگڈنڈی چھوڑ کر چھوٹے چھوٹے پودے روندتا ہوا آ رہا تھا۔ میں اپنی کامیابی پر مسرور ہو گیا۔ مویشی خانے سے جانور بھی رات کے وقت جا کر میں نے ہی چھوڑا تھا۔

شہریار نے دور سے ہی چلاتے ہوئے کہا۔ ''شہزادخدا کی قسم اگر کوئی لٹیرا وغیرہ ہوا تو اسے ایسا مزہ چکھاؤں گا کہ عمر بھر یاد رکھے گا۔''

''ہاں ہم دونوں مل کر اس کی ایسی گت بنائیں گے کہ اسے چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔''

شہریار قریب آیا تو ہم جھاڑیاں ہٹا کر ہٹ کے پاس جا پہنچے۔ گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی' ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مدت سے اسے استعمال نہیں کیا گیا۔ کائی جگہ جگہ جمی ہوئی تھی' جالے بھی لٹک رہے تھے۔ لکڑی کے بڑے دروازے کے علاوہ اس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ اس لیے اس میں ہوا کا گزر بھی مشکل سے ہوتا تھا۔

میں نے جلدی سے دروازہ کھولا' اندر داخل ہو گیا شہریار بھی قریب آ گیا۔ ہٹ بالکل خالی تھا۔ میں آگے بڑھ کر ہٹ میں موجود بڑی چارپائی' لکڑیوں کے ڈھیر اور پرانی الماری کے عقب میں جھانکنے لگا۔ شہریار بھی نزدیک آ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ''فرش پر قدموں کے نشانات موجود ہیں۔''

میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ یہ ہٹ شہریار نے ہی بنوایا تھا اور جب وہ تنہائی چاہتا تو اس ہٹ میں آ کے کچھ وقت گزارتا اور پرندوں کا شکار کر کے انہیں خود ہی پکا کر سیر کا لطف اٹھایا کرتا تھا۔ یہ اس کی تفریح بھی تھی اور ورزش بھی۔ ایک طرف گیس سلنڈر اور اسٹو بھی رکھا ہوا تھا۔ الماری میں برتن بھی موجود تھے۔ شہریار نے آگے بڑھ کے ہٹ کی اکلوتی کھڑکی کھولی جو مشرق کی جانب واقع تھی۔ کھڑکی وا کرتے ہی سورج کی روشنی تیزی سے اندر آنے لگی۔ وہ مڑا ہی تھا کہ میں نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور دو فائر کر دیئے۔ یہ ننھا منا آٹومیٹک بے آواز پستول میں نے شہریار کی اسٹڈی کی میز کی دراز سے اڑایا تھا۔ اس کے منہ سے گھٹی گھٹی چیخ نکلی اسے زیادہ چیخنے کا موقع نہ ملا۔ یہ میرے حق میں بہتر تھا۔ وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا پھر ساکت ہو گیا۔

میں تیزی سے حرکت میں آیا۔ میں نے اس کی جیب سے موبائل نکالا' قیمتی گھڑی' ہیرے کی انگوٹھیاں اتار کر خود پہنیں اور پھر اس کی جیب سے کرنسی نوٹ بھی نکال لیے۔ شہریار سلیپنگ سوٹ میں تھا میں اسے گھسیٹ کر ہٹ کے باہر چھوٹے سے احاطے میں موجود ایک گڑھے کے پاس لے آیا جسے میں نے آ کر کدال سے گہرا کر چکا تھا۔ میں نے شہریار کو اس میں پھینک کر مٹی اور خشک پتے اور شاخیں پھیلا دیں۔ پھر میں واپس ہٹ میں آیا' خون کے دھبے صاف کیے' پھر الماری کے عقب میں چھپایا ہوا شہریار کا دوسرا بالکل اسی طرح کا سلیپنگ سوٹ نکال کر پہننے لگا جو میں یہاں چھپا گیا تھا۔ میں جلدی جلدی اس کے اتارے ہوئے جوتے پہننے لگا۔ پھر الماری میں لگے شیشے کے سامنے آیا الماری میں موجود ریزر کی مدد سے' داڑھی اور مونچھیں صاف کرنے لگا۔ اس کام سے فارغ ہو کر جب میں نے اپنا جائزہ لیا تو مسرت سے جھوم اٹھا۔ میں ہو بہو شہریار بن گیا تھا۔

میں نے اپنے کپڑے ہٹ کے عقبی جانب

لا کر پھینکے اور لائٹر کا پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی۔ پھر واپس پلٹ آیا اور گڑھے پر الوداعی نگاہ ڈالتا ہوا احاطے سے باہر نکل آیا اور تیز تیز قدموں سے واپس رہائش گاہ کی طرف بڑھنے لگا۔ ایک جگہ مالی رحمت مل گیا۔ ''صاحب آپ کا دوست نظر نہیں آرہا۔''

''وہ لمبی سیر کرتے ہوئے دور چلا گیا ہے۔ اگلے دروازے سے نکل کر اپنی ماں سے ملنے جارہا ہے۔ پھر لوٹ آئے گا۔'' مالی مطمئن ہو کر سر ہلانے لگا۔

میں شہریار بنا خوشی اور مسرت سے اٹھلاتا ہوا چل رہا تھا۔ میرا دل خوشی سے بھر گیا تھا۔ لیکن پھر میں کچھ خطرات محسوس کر کے سنجیدہ اور چوکنا ہو گیا۔ شہریار کی آواز کی ہو بہو نقل کی مشق اور اس کے اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے کے انداز' دوستوں اور خاص خاص لوگوں کے بارے میں جان چکا تھا۔ میں نے بڑے آئینے کے سامنے اس کی نقل کی مشق بھی کر لی تھی۔

میں عمارت کے قریب پہنچا تو چوکیدار نے مجھے سلام کیا' اور ادب سے ایک طرف ہٹ گیا اور رائفل لے کر راؤنڈ پر چلا گیا۔ میں شہریار ہی دکھائی دے رہا تھا۔ ناشتے کی میز پر نیلم بھی مجھے نہ پہچان سکی۔ اس کا بیٹا عمران سو رہا تھا۔ میں نے اردگرد ملازموں کو پا کر نیلم کو بھی بتادیا کہ میرا دوست اپنی والدہ کی طبیعت بگڑنے پر باغ سے ہی روانہ ہو گیا ہے۔ ملازم بھی باخبر ہو گئے۔ ناشتے کی میز پر میں مختصر سی گفتگو کر کے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے کمرے میں آکر بریف کیس کھول کر کاغذات کا جائزہ لینے لگا۔ سیکرٹری کو معمولات کے کام سمجھا کر میں آفس روانہ ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد سیکرٹری بھی اپنی چھوٹی کار میں بیٹھ کے فیکٹری چلا آیا۔ وہ غیر شادی شدہ تھا اس لیے شہریار نے ڈبل تنخواہ پر کوٹھی میں بھی رکھ چھوڑا تھا۔ وہ کوٹھی پر ضروری فائلوں اور کاغذات کی جانچ پڑتال کیا کرتا تھا۔

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ سارا کام منیجر ہی سنبھالتا تھا۔ مجھے صرف خاص خاص لوگوں سے ملنا اور چیکوں پر دستخط کرنا ہوتے تھے۔ کوئی نیا معاہدہ زیر بحث نہیں تھا جس سے میری لاعلمی کھل جاتی۔

میں نے دو دن بڑے اطمینان سے گزارے۔ میں نیلم اور عمران سے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے جلد ہی الگ ہو جاتا تا کہ وہ کچھ بھانپ نہ لیں۔ میں بڑی بڑی رقموں کے چیک کاٹ چکا تھا اور اب میری نظر گھر کی تجوری پر تھی۔ میں نیلم کی بے جا فرمائشوں اور مداخلت سے بے زار ہو گیا تھا اور جلد ہی دولت سمیٹ کر یہاں سے نکلنے کا پروگرام سوچ رہا تھا۔ ویسے بھی میں متلون مزاج اور سیلانی آدمی تھا۔ میرے لیے جم کر کہیں رہنا اور بیٹھنا مشکل ہوتا تھا۔

مجھے دبئی' صفائی' کشادگی اور ملک ملک سے آنے والی عورتوں اور فلمی اداکاراؤں' ماڈلز کی وجہ سے بہت پسند تھا۔ پھر وہاں سے دوسرے ملکوں کی سیر و سیاحت کرنا بھی آسان تھا۔

رات خلوت کے لمحات گزارنے کے بعد جب صبح صبح نیلم سے ملاقات ہوئی تو وہ کچھ چونکی ہوئی تھی پھر اس نے مجھے گھورتے ہوئے کالر سے پکڑ لیا اور بولی۔ ''پہلے تو کبھی آپ نے ایسی حرکتیں نہیں کیں جو آپ سے رات سرزد ہوئیں۔''

''بس بیگم انسان کبھی کبھی ورائٹی چاہتا ہے' انسان کوئی مشین نہیں ہے۔ کبھی زیادہ موج مستی کو جی چاہتا ہے۔'' وہ کچھ شرما گئی اور نظریں جھکا لیں۔ میں گھڑی دیکھ کر پورٹیکو کی طرف بڑھنے لگا۔ پجارو باہر

ڈرائیووے پر کھڑی تھی۔
ڈرائیور دروازہ کھولے تیار کھڑا تھا لیکن میں بھی بچار وخود ہی ڈرائیو کرتا تھا۔

❁ ❁ ❁

رات کے وقت میں طاقتور ٹارچ لے کر باغ میں گھومتا ہوا مالیوں کی راہ سے بچ کر ہٹ کی طرف نکل آیا۔ پھر بھی منحوس مالی رحمت اچانک ہی گھومتا ہوا اس طرف آنکلا اور کہنے لگا۔ "صاحب آپ تو رات کے وقت اس طرف نہیں نکلتے۔"
"بس رحمت پیٹ میں کچھ گرانی ہے، میں ذرا ٹہل کر آتا ہوں۔" رحمت اپنی کوٹھری کی طرف چلا گیا۔ میں چلتے چلتے ہٹ کے قریب چلا آیا۔ میں گڑھے کا جائزہ لینا چاہتا تھا لیکن جیسے ہی میں گڑھے کے سامنے پہنچا میری ٹی گم ہوگئی۔ بس ایسی حالت تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ گڑھا کھلا پڑا تھا اور جھانکنے پر اندر شہریار کی لاش موجود نہیں تھی۔ میں کتنے ہی لمحے ساکت وصامت کھڑا پھٹی پھٹی نگاہوں سے خالی گڑھے کو گھورتا رہا۔ میری چھٹی حس خطرے کا احساس دلانے لگی۔

❁ ❁ ❁
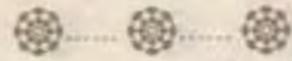
شہریار کو ہوش آ گیا تھا اور اس نے خود کو سکون بخش حرارت کی گود میں محسوس کیا تھا۔ اس کا بستر بالکل آتش دان کے قریب تھا۔ آتش دان میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ قریب ہی ایک دراز قد مضبوط جسم کا بوڑھا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ ایک سفید رنگ کا بڑا سا جسیم کتا بھی زمین پر بیٹھا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا اور زبان لٹکی ہوئی تھی۔ کچھ یاد آتے ہی شہریار کی آنکھیں فوراً اپنے سینے پر اٹک گئیں جہاں پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور تکلیف اور درد کا احساس بھی اسی جگہ پر تھا۔ اسے جھرجھری سی آ گئی۔ "حرامزادہ شہزاد نے کس بے رحمی سے میرے سینے پر فائر کیے تھے۔" وہ بڑبڑا کر غصے سے کسمسایا۔ چہرہ بھی سرخ ہوگیا۔ "حرامزادے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ کتے کی موت ماروں گا۔ تم دوستی کے نام پر غلیظ دھبہ ہو۔" وہ پھر بڑبڑا کر رہ گیا۔ "آرام کیجیے شہریار صاحب، اس طرح خون پھر نکلنا شروع ہو جائے گا۔" بوڑھا جلدی سے قریب آ گیا۔ "بس شکر کیجیے بچ گئے، گولیاں دل کے قریب لگی تھیں۔ میں نے انہیں آپریشن کر کے نکال دیا ہے۔ میں سرجن ہوں اور آپ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ آپ اس وقت باغ کے سرے سے دو فرلانگ دور ہیں۔"
"آپ نے مجھے کیسے بچایا۔" شہریار نے چونک کر پوچھا۔
"میں اکثر آپ کی جاگیر میں ٹائیگر کے ہمراہ لمبی سیر کے لیے نکل جاتا ہوں۔ اس عمل کے دوران چار دن قبل موتی نے ہٹ کے قریب انسانی جسم اور خون کی بو پا کر بھونکنا شروع کر دیا اور زنجیر کو جھٹکے دینے لگا۔ میں نے زنجیر چھوڑ دی۔ یہ بھاگ کر ہٹ کے مختصر احاطے میں گھس کر نتھنے پھلا کر بو سونگھنے لگا۔ پھر اس نے پنجوں کی مدد سے ایک جگہ سے گڑھا کھودنا شروع کر دیا۔ مٹی زیادہ سخت نہیں تھی۔ میں بھی بھاگ کر وہاں چلا گیا۔ جب ہم دونوں نے مٹی ہٹائی تو نیچے آپ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا دکھائی دیے۔ وہاں چوہوں کے لمبے لمبے بل تھے اور معمولی مقدار میں ہوا اندر پہنچ رہی تھی۔ میں ایک تجربہ کار ڈاکٹر اور سرجن ہوں۔ جو زمانے کا ڈسا ہوا ہوں اور شہر چھوڑ کر اس ویران سی جگہ رائیونڈ روڈ پر رہتا ہوں۔ یہیں چند مریض وغیرہ آ جاتے ہیں۔ میں نے نبض

دیکھی ٔ دل کی دھڑکن محسوس کی ٔ زندگی قبر میں بھی موجود تھی۔ کیونکہ آپ کا وقت نہیں آیا تھا۔ چنانچہ میں آپ کو نکال کر کندھے پر ڈال کر اس طرف لے آیا اور احتیاط کے طور پر کسی سے تذکرہ نہ کیا۔

میں کسی زمانے میں پہلوانی بھی کیا کرتا تھا اس لیے آپ کا بوجھ بخوبی اٹھا لیا تھا۔"

"اوہ تو یہ ماجرہ ہے۔" شہریار کے ہونٹ سکڑ گئے۔ اس نے لباس میں موبائل ٹٹولا جو غائب تھا۔ "بابا آپ کے پاس موبائل ہے؟"

"نہیں۔" ڈاکٹر نے افسردگی سے سر ہلایا۔ "میں جب پچھلی بار سودا سلف خریدنے بازار گیا تھا تو کسی نے جیب سے موبائل اور پرس دونوں چیزیں نکال لی تھیں۔

"پھر کسی مریض کو بھگایئے پولیس اسٹیشن" شہریار نے مضطرب لہجے میں کہا۔

"مریض تو آج کل کوئی بھی نہیں آرہا۔ آپ دو دن بعد ٹھیک ہو جائیں گے پھر ہم دونوں چلیں گے۔" بوڑھے ڈاکٹر نے آرام کرنے کا مشورہ دیا پھر ڈرپ میں طاقت کے انجکشن شامل کرنے لگا۔ شہریار کو غنودگی آ گئی وہ پھر سو گیا۔

❁ ❁ ❁

"خطرے کی تلوار اب میرے سر پر لٹک رہی ہے۔ جس کا توڑ مجھے کرنا ہوگا ورنہ اس پر عیش زندگی کا اختتام پھر کسی اندھیرے غار کی مانند ہوگا۔" میں بڑبڑاتا ہوا عمارت کی طرف بڑھنے لگا۔ "کیسے بچ نکلا؟ کس نے گڑھا کھود کر اسے نکالا؟" یہ سوالات بار بار ذہن میں گردش کرنے لگے۔ "اسے ختم کرنا ہوگا ٔ اسے پھر مارنا ہوگا۔" یہی جملہ بار بار میرے منہ سے نکلنے لگا۔

❁ ❁ ❁

آج مجھے دوسرا دن تھا۔ میں دوربین لے کر صبح کے وقت ہٹ کے قریب ایک درخت پر بیٹھ کر باغ کے آخری سرے سے شروع ہونے والی آبادی اور اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ اچانک میں چونک اٹھا اور پلکیں جھپکانا بھول گیا۔ باغ سے تین چار فرلانگ کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا احاطہ تھا جس کی دیواریں زیادہ بلند نہیں تھیں۔ احاطے کے اندر باغیچہ بنا ہوا تھا اور وہاں شہریار ایک دراز قد تندرست بوڑھے کے ساتھ چہل قدمی کر رہا تھا۔ شہریار آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا اس کے چہرے پر کمزوری کے آثار تھے۔ وہ اس وقت جھک کر باغیچے کی کیاری میں لگے گلاب کے پودے سے پھول توڑ رہا تھا۔ سرخ گلاب اسے بے حد پسند تھا۔ میرا ڈرائنگ روم ٔ بیڈ روم ٔ ٹی وی لاؤنج اور فیکٹری آفس روم سرخ گلاب کے پھولوں کی خوشبو سے مہکتا رہتا تھا۔ "یہ بوڑھا ہی اسے بچا کر لے گیا ہے۔ ان دونوں کو ختم کرنا پڑے گا۔ ارے ان کے پاس تو ایک قد آور کتا بھی ہے۔" میں بڑبڑایا تھا۔ جسیم کتا بوڑھے کے قدموں میں لوٹ رہا تھا۔

❁ ❁ ❁

میں رات کے وقت شہریار کا ریوالور لوڈ کر کے بوڑھے کے مکان کی طرف روانہ ہو گیا۔ سردی کا موسم تھا ٔ اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے درختوں اور جھاڑیوں سے شائیں شائیں کا شور مچاتے ہوئے گزرتے تو خاموشی کی روح لرز جاتی۔ میں ٹارچ کی روشنی سے تاریکی کا سینہ چیرتا ہوا جانے پہچانے راستے پر تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جارہی تھی۔ میں ہر حال میں اپنے دوست کو موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا تھا۔ یہی عمل میری بقا کا ضامن ہوسکتا تھا۔ میں ہر قسم کے

جذبات اور دوستی کے گزرے ایام فراموش کر چکا تھا۔ دوستی کی روشنی کا چراغ دولت کی ہوس نے گل کر دیا تھا۔ آج پیسے کی تلوار سے انسان کا لہو ٹپک رہا ہے۔

تقریباً آدھے پونے گھنٹے بعد میں احاطے کے پاس پہنچ گیا۔ بوڑھے کا مکان باغیچے کے آخری سرے پر واقع تھا اور ہائی وے سے کچھ دور ہی تھا۔ اردگرد سناٹا اور ویرانی تھی۔ آبادی یہاں سے کچھ فاصلے پر تھی۔ جہاں سے مدہم مدہم زرد روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ باغیچے میں ایک بلب لکڑی کے پول پر روشن تھا۔ اس کے علاوہ مکان کے ایک کمرے میں روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے تھیلے سے گوشت کے بے ہوشی کی دوا ملے ٹکڑے نکالے اور باغیچے کی طرف بڑھا۔ میں نے ایک شگاف سے اندر جھانکا' کتا چوکنا ہو کر گھوم رہا تھا۔ حالانکہ دو بجے کا عمل تھا۔ میں نے گوشت کے ٹکڑے اچھال کر پھینک دیئے۔ کتا میری خوشبو سونگھتا غراتا ہوا ٹکڑوں کی طرف آیا۔ میں آگے بڑھ کر باڑ کا جائزہ لینے لگا۔ ایک جگہ ایک شگاف موجود تھا۔ جسے میں نے کٹر کی مدد سے چوڑا کرتے ہوئے راستہ بنا لیا پھر ادھر ادھر نگاہ ڈال کر اندر داخل ہو گیا۔ اب بھرا ہوا ریوالور میرے ہاتھ میں تھا۔ کتا چاند کی روشنی میں ایک جگہ بے سود پڑا دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی اس پر پھینکی اور اس کی طرف بڑھنے لگا میں اپنا اطمینان کرنا چاہتا تھا۔

بس اسی لمحے بجلی سی چمکی اور کتے نے برق سرعت کے ساتھ مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ وہ بہت چالاک کتا تھا اس نے ٹکڑے نہیں کھائے تھے اور میری گھات میں تھا۔ میں نے سائیلنسر لگے پستول سے اس پر فائر کیا لیکن وہ بچ نکلا۔ میں اس کے دھکے سے زمین پر آ گرا وہ میرے اوپر آ گیا۔ میں نے کہنی منہ کے آگے کرتے ہوئے دوسرا فائر کیا لیکن وہ پھر بھی بچ نکلا۔ گولی اس کے بالوں کو چھوتی گزر گئی۔ وہ بھیانک غراہٹوں کے ساتھ میری گردن دبوچنے کی دیوانہ وار کوشش کرنے لگا۔ اسی کشمکش میں' زور آزمائی میں پستول میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ خیریت ہوئی کہ میں دستانے اور لمبا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ کتے کے دانت کوٹ میں اٹک گئے لیکن پستول اور ٹارچ ادھر ادھر گر پڑیں۔ اس وقت مجھے دور کسی کے کھانستے ہوئے اس طرف آنے کی آواز سنائی دی۔ کتے نے ادھر دیکھا۔ بس اس لمحے میں نے کمر کے گرد لپٹی بیلٹ سے خنجر نکالا اور کتے کے پیٹ میں اتار دیا۔ کتے کی چیخ سے ماحول گونج اٹھا۔

''کون ہے؟ کون ہے؟'' اس آواز کے ساتھ رائفل کا ایک فائر بھی مکان کے احاطے سے ہوا۔ میں نے اٹھ کر بھاگنے میں ہی خیریت سمجھی۔ میں کسی زمانے میں جوڈو کراٹے اور کشتیاں کیا کرتا تھا۔ جوگنگ کی بھی عادت تھی۔ اس لیے کتے سے مقابلہ کر گزرا۔ ورنہ وہ بڑا خوفناک دکھائی دیتا تھا۔ میں سوراخ سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا اور سرپٹ بھاگنے لگا۔ پستول اور ٹارچ دونوں اشیاء اندر ہی رہ گئی تھیں۔ کافی دور آ کر سانس لیا پھر گھر کی طرف تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ پینتالیس سال کی عمر میں اتنی اچھل کود کافی تھی۔ میں عقبی گیٹ سے گھر میں داخل ہوا۔

❁ ❁ ❁

اگلی رات میں ایک اور پلان کے ساتھ اس مکان اور باغیچے کے پاس موجود تھا۔ میرے پاس

چار لیٹر پیٹرول کا گیلن تھا۔ باغیچے کے احاطے اور مکان کے گرد سوکھی ہوئی جھاڑیاں اور خشک زرد گھاس پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے پیٹرول جابجا چھڑک کر ماچس کی چند تیلیاں جلا کر پھینکیں اور کچھ دور آ کر تماشہ دیکھنے لگا۔ آگ کے شعلے بھڑکتے چلے گئے۔ باغیچے میں خشک گھاس اور لکڑیوں کا ڈھیر سا لگا ہوا تھا جو شاید آتش دان کے لیے جمع کی گئی تھیں۔ ان سب نے آگ پکڑ لی۔ مکان کے دروازے اور کھڑکیوں پر آگ بھڑکنے لگی۔ دھواں اٹھنے لگا۔ میں دانت پیستا ہوا بے رحم نظروں سے آگ کے شعلوں کو پھیلتا ہوا دیکھنے لگا۔

لیکن میں یہ بھول گیا تھا کہ مارنے والے سے بچانے والا زیادہ طاقتور ہے۔ اس وقت آسمان پر گڑگڑاہٹ کے ساتھ بجلی چمکی اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ میں نے بادلوں کا خیال ہی نہیں کیا تھا۔ اب کتے کے بھونکنے کی کمزور آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ وہ ابھی زندہ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بارش نے آگ کے بھڑکتے سرکش شعلوں کو بجھا بجھا کر ٹھنڈا کر دیا اور صرف دھواں جگہ جگہ سے اٹھنے لگا۔ میں غصے اور بے بسی سے اپنی تدبیر کی ناکامی کو مایوس نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ اسی لمحے مجھے پھر کتے کے بھونکنے کی آواز قریب سے سنائی دی۔ اور ساتھ ہی فضا ایک ہوائی فائر سے گونج اٹھی۔ میں تیزی سے واپس بھاگنے لگا اور دوسری مرتبہ گھر آ کر بستر پر گر کر ہانپنے لگا۔ میں ایک بار پھر ناکام ہو چکا تھا۔

بستر پر زخمی سانپ کی مانند بل کھاتے ہوئے میں نے ایک اور پلان تیار کر لیا جس کے بعد چند فرلانگ کا فاصلہ اس کے لیے ناقابل عبور بن جائے گا اور قدم قدم پر موت اس کا استقبال کرے گی۔

صبح فیکٹری جا کر میں فارغ ہونے کا بے تابی سے منتظر تھا۔ فیکٹری سے نکلنے کے بعد میں نے ٹھوکر نیاز بیگ کے ایک بدنام ہوٹل میں میں اجرتی قاتل گروپ سے ملا اور انہیں پانچ لاکھ روپیہ ایڈوانس دے دیا۔ پندرہ لاکھ کی ادائی کام کے بعد تھی۔ اجرتی قاتل شہریار کی تصویر دیکھ کر فوری طور پر رہائش گاہ کے باہر اور باغ میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ وہ پستولوں اور چھوٹی رائفلوں سے مسلح تھے۔ اب میں مطمئن تھا کہ چند فرلانگ کا راستہ ناقابل عبور ہوگا۔ اور قدم قدم پر موت اس کی منتظر ہوگی۔ ایک اجرتی قاتل میری ہدایت کے مطابق بوڑھے کے مکان پر بھی گیا لیکن وہ دونوں مکان سے غائب تھے البتہ زخمی کتا لیٹا غرا رہا تھا۔

ابھی ایک اور کانٹا شہریار کا بیٹا عمران میرے دل میں کھٹک رہا تھا۔ وہ مجھ سے کچھ خائف اور چونکا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ وہ جاسوسی کہانیاں پڑھنے اور جاسوسی فلمیں دیکھنے کا شوقین تھا اور ایک لمبی نال والی واٹر گن بھی ہر وقت ساتھ لیے پھرتا تھا۔

❁ .... ❁ .... ❁

ٹھوکر نیاز بیگ کے ایک کیفے میں عمران اسکول سے واپسی پر بے چینی سے انسپکٹر کامران کا منتظر تھا۔ جو اس کے والد کا کالج کے زمانے کا دوست تھا۔ وہ آج کل ٹھوکر کے تھانے میں تعینات تھا۔ عمران موبائل فون جیب میں رکھتے ہوئے تیسری بار گھڑی دیکھ رہا تھا کہ اسی لمحے انسپکٹر کامران جیپ سے اتر کر تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ عمران اسے ایک کونے میں لے گیا اور تمہید باندھنے کے بعد بولا۔

"کامران صاحب مجھے شک ہے کہ وہ میرا والد

نہیں، اس کا سراپا، رنگ روپ، تو وہی ہے لیکن روح بدل گئی ہے۔ وہ مجھ سے زیادہ بات نہیں کرتا، نہ میری اصلی ممی جو فوت ہو چکی ہے اس کی تصویر کے نیچے بھی مجھے لے کر نہیں جاتا۔ اس کے لہجے میں سچائی اور شفقت نہیں ہوتی۔ پاپا ایک ہفتہ قبل اپنے ہم شکل دوست شہزاد کو گھر لائے، انہیں ملازمت دے دی، کوٹھی میں رہائش بھی دی گئی، صبح صبح دونوں ہٹ کی طرف سیر کرنے کے لیے نکل گئے۔

واپسی پر یہ پاپا اکیلے آئے اور دوست کے متعلق بتایا کہ وہ ہٹ کے سامنے والے ویران راستے سے اکیلا ہی واپس چلا گیا ہے اس کی والدہ کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔'' عمران نے صورت حال کو واضح کرتے ہوئے کہا۔

''تم فوراً کیا چاہتے ہو؟'' انسپکٹر عمران نے پوچھا۔ ''آپ ان کے دوست کو تلاش کریں اس سلسلے میں پاپا سے سوال جواب کریں، اور پاپا کی نگرانی بھی کریں۔''

''گڈ تم کافی ذہین لڑکے ہو، بالکل کسی ننھے منے جاسوس کی مانند'' کامران نے شفقت سے عمران کا گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

❁ ❁ ❁

شام کے وقت انسپکٹر کامران ڈرائنگ روم میں میرا منتظر تھا۔ اس نے چند سوال کیے۔ دو کا جواب تو میں نے صحیح دے دیا۔ دو کو ٹال دیا کہ پچھلی مرتبہ مری کے ٹور میں ہوٹل کی سیڑھیوں سے گرا تھا، سر کے پچھلے حصے میں چوٹ آئی تھی، کچھ کچھ بھول جاتا ہوں۔''

''شہریار! آپ اپنے دوست کا ایڈریس لکھوا دیجیے، ہم ایک سلسلے میں ان سے ملنا چاہتے ہیں؟'' انسپکٹر کامران نے مجھ پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔

''ضرور، ضرور کیوں نہیں۔ لیکن ایسی کیا ضرورت آپڑی، انہیں تلاش کرنے کی۔'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''وہ ایک کیس میں مطلوب ہیں۔ ابھی صرف اتنا ہی بتا سکتا ہوں۔''

''میرا وہ دوست شہزاد بیس سال یورپ میں رہ کر واپس لوٹا ہے۔ ہمارا بچپن اسی شہر لاہور میں گزرا ہے۔ میں نے پرانا ایڈریس اور ایک ہوٹل کا پتہ بتا دیا۔ انسپکٹر کامران نے اسی وقت موبائل پر اپنے ماتحتوں سے کہا کہ پوچھ گچھ کر کے فوراً اطلاع کریں۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہی اطلاعات مل گئیں کہ اس نام کا آدمی وہاں موجود نہیں، البتہ اس کی والدہ تو عرصہ قبل ہی فوت ہو چکی ہے۔ اس کی وفات پر بھی وہ نہیں آیا تھا۔'' انسپکٹر کامران نے مجھ سے کہا۔ ''شہریار وہ تو بالکل غائب ہو گیا، کوئی سراغ نہیں مل رہا۔'' ''میں کیا کہہ سکتا ہوں، کہاں نکل گیا وہ کچھ ایسا ہی سیلانی طبیعت کا آدمی ہے، کہیں ٹک کر نہیں رہتا۔ اس نے والدہ کی طبیعت کے متعلق بھی غلط بیانی سے کام لیا، وہ تو کچھ عرصہ قبل ہی وفات پا چکی ہے۔'' انسپکٹر کامران نے مجھے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ''عجیب بات ہے آخر اسے ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی، بہر حال آیا تو پوچھوں گا۔'' میں نے الجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ انسپکٹر کامران مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔

''میں تھکا ہوا ہوں، اب اجازت چاہوں گا تم کھانا کھا کے جانا۔'' میں نے کہا اور ڈرائنگ روم سے نکل کر خواب گاہ کی طرف بڑھنے لگا۔

❁ ❁ ❁

عمران ایک ستون کی آڑ سے نکل کر ڈرائنگ روم

کی طرف چلتے ہوئے دروازے پر پہنچا اور اندر داخل ہو گیا۔ دونوں سرگوشیاں کرنے لگے۔

میرے دوبئی جانے کے انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ میرا پاسپورٹ اور نیا شناختی کارڈ بن چکا تھا۔ میں ایک فرضی شخصیت کے روپ میں سفر کرنے والا تھا۔ بڑی بڑی رقموں کے بعد اب میں تجوری کا صفایا کرنا چاہتا تھا۔ میرا پروگرام تھا کہ اگر آج رات شہریار قتل ہو جائے جس کی تلاش اب ہو رہی تھی تو اس کی لاش تجوری والے کمرے میں ڈال دی جائے تا کہ ڈکیتی کا ماحول بن جائے۔ اس کے لیے میں نے اجرتی قاتلوں سے کہہ دیا تھا کہ اسے ہلاک کر کے آج رات عقبی دروازے سے تین بجے تک لے آئیں۔

تجوری کی چابیاں مجھے بڑی مشکل سے دستیاب ہوئی تھیں۔ یہ اس طرح کہ میں نے نیلم کو خفیہ مقام سے چابیاں نکال کے تجوری والے کمرے سے تجوری کھول کے کچھ رقم نکالتے اور چابیاں واپس رکھتے دیکھ لیا تھا۔ یہ رات تین بجے کا واقعہ تھا۔ تھوڑی بہت رقم تو الماریوں میں موجود تھی جو معمول کے اخراجات کے لیے کافی تھی لیکن ابھی تک تجوری کھولنے کا کوئی موقع نہیں آیا تھا۔

اب میدان صاف تھا' آج رات میں تجوری کا صفایا کرنے والا تھا۔ میں نے اپنی خواب گاہ جہاں شہریار سویا کرتا تھا۔ اس کی الماری کے خفیہ خانے سے چابیاں نکالیں اور وہیں سے الارم سسٹم اور دوسری دشواریوں کے لیور بورڈ سے آف کر کے نچلی منزل کے زینے کی طرف بڑھنے لگا۔ بھرا ہوا ریوالور میرے کوٹ کی جیب میں موجود تھا۔ جو میں نے قاتل گروپ سے خرید لیا تھا۔ چاقو بھی میں نے کمر پر بیلٹ باندھ کر اس میں لٹکا رکھا تھا۔

رات کے تین بجے کا عمل تھا۔ میں بغیر کسی دشواری کے نچلی منزل کے وسطی کمرے میں پہنچ گیا۔

میں نے تجوری بے خوف وخطر کھول لی۔ اب اس کے دروازے میں کرنٹ نہیں دوڑ رہا تھا۔ اور نہ دروازہ خفیہ لاک میں جکڑا ہوا تھا۔ میں تجوری کی رونق دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ ہزار ہزار اور پانچسو والے نوٹوں کی بہت سی گڈیاں قطاروں میں موجود تھیں۔ اس کے علاوہ زیورات' ڈالرز بونڈز وغیرہ اور شیشے کے باکس میں بہت سے ہیرے جگمگا رہے تھے۔ میرے منہ میں پانی آ گیا۔ میں سب کچھ جلدی جلدی اپنے بیگ میں ڈالنے لگا۔ اس وقت بیرونی دروازہ کھلنے اور قدموں کی ہلکی آہٹ سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا اور دھک سے رہ گیا۔ مسز شہریار اور نیا خوبصورت نوجوان دراز قد باورچی اندر داخل ہو کر آگے بڑھ رہے تھے۔ دروازہ شاید انہوں نے متبادل چابی سے کھول لیا تھا اور ممکن ہے تجوری کی دوسری چابی بھی بنوا لی گئی ہو۔ ان کے ہاتھوں میں چھوٹے چھوٹے پستول بھی نظر آ رہے تھے۔ وہ حیرت سے پھیلی ہوئی آنکھوں کے ساتھ آگے بڑھے۔ ''ہمارا کام تو سیٹھ صاحب خود ہی کر رہے ہیں۔'' نیلم نے دراز قد لڑکے کو کہنی مار کر مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

''ڈارلنگ یہ زیادہ اچھا ہے' سیٹھ صاحب کو ٹھکانے لگا کے یہیں ڈال دیں گے تا کہ ڈکیتی کا ماحول بن جائے۔'' لڑکا سفاکی سے بولا اور آگے بڑھا۔ ''ہٹ جاؤ سیٹھ' آج سب کچھ ہمارا ہے۔''

''نہیں تم نہیں لے جا سکو گے' میری دولت کو' میں خطرہ محسوس کر رہا تھا اس لیے اپنی دولت کہیں اور منتقل کرنے والا ہوں۔'' لڑکا قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

"اب یہ تمہارے لیے بے کار اور ہمارے لیے کار آمد ہے۔" میں نے جلدی سے پستول نکالنے کی کوشش کی لیکن نیلم نے فائر کردیا۔ گولی نے میرا ہاتھ زخمی کردیا۔ خون ٹپ ٹپ گرنے لگا۔ میں کراہ کر رہ گیا۔ فائر بے آواز تھا۔ میں سونے چاندی اور دولت کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا ہوا تجوری سے ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ پھر غصے سے چلایا۔

"تم دونوں آپس میں ملے ہوئے ہو۔ نیلم تمہیں شرم نہ آئی میری بیوی ہو کر غیر لڑکے سے مراسم قائم کرکے، مجھے لوٹنے اور مارنے کا پروگرام بنا کر آئی ہو۔" "تم بڑھاپے کا شکار ہو چکے ہو اور میں نوجوان ہوں۔ بے وقوف بوڑھے۔" نیلم نے بے باکی سے جواب دیا۔ دراز قد باورچی مسکرایا اور ریوالور کے ٹرائیگر پر دباؤ ڈالنے لگا۔

اسی لمحے کمرے کا بغلی دروازہ ایک دھماکے کے ساتھ کھلا اور شہریار اور دراز قد بوڑھا اندر داخل ہوئے۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" شہریار گرجا۔ میں حیرت سے اچھل پڑا۔ شہریار کے ہاتھ میں اس کا پستول تھا جو مجھ سے باغیچے میں گر گیا تھا۔ اسی لمحے نیلم کے یار نے شہریار کو موقع دیئے بغیر تیزی سے فائر کرکے شہریار کا پستول گرادیا۔ نیلم بار بار کبھی مجھے اور کبھی شہریار کو دیکھنے لگی۔

"اوہ اب میں سمجھی یہ شہریار کا ہم شکل ہے۔ بہرحال اب دونوں کو ساتھ مرنا ہوگا۔ اور یہ بے چارہ بوڑھا بھی۔" اس نے سفاک لہجے میں کہا۔ شہریار مجھے شعلہ بار نگاہوں سے گھورنے لگا۔

"بے غیرت، بے شرم انسان تم سے زیادہ بے رحم دوست میں نے نہ دیکھا ہے نہ سنا ہے۔ میں نے تمہیں فیکٹری میں ملازمت دی گھر میں ٹھہرایا تم نے

اقوال دوستی

☆ اگر تمہارے دوست ایسے ہیں جو تمہاری غلط تعریف کے بجائے تمہاری غلطیوں سے آگاہ کرتے ہیں تو تم عقل مند ہو۔ تم نے اچھے دوستوں کا انتخاب کیا۔ (فیثا غورث)

☆ جو اپنے دوست کو برے کاموں سے باز نہیں رکھتا وہ دوستی کے قابل نہیں (جالینوس)

☆ دوست اس کو سمجھ جو خلوت میں تیرے عیب تجھ پر ظاہر کرے۔ تجھے تنبیہہ کرے اور تیرے پیچھے لوگوں میں تیری تعریف کرے اور مصیبت کے وقت تیری ہمراہی کرے۔ (مامون)

☆ ہر اچھی کتاب انسان کا بہترین دوست ہے۔ (ملٹن)

اس کا صلہ یہ دیا کہ مجھے ہٹ میں قتل کرکے گڑھے میں دبا دیا۔ اگر ڈاکٹر کا کتا میرے جسم اور خون کی بو نہ سونگھ لیتا تو تم کامیاب ہوجاتے۔ ڈاکٹر اکرام میرا محسن ہے اور تم میرے بدترین دشمن ہو۔ تم دوستی کے نام پر سیاہ دھبہ ہو اور یہ نیلم جسے میں غربت کے گندے تاریک ماحول سے نکال کر جگمگاتی زندگی میں لایا، یہ بھی گندگی کا ڈھیر ثابت ہوئی۔ اس نوجوان کی داشتہ بن کے میری دولت لوٹنا چاہتی ہے اور خون کی پیاسی نظر آرہی ہے۔" نیلم سرخ سرخ آنکھوں سے سیٹھ شہریار کو گھورتی ہوئی ٹرائیگر پر دباؤ ڈالنے لگی۔ اسی لمحے نوجوان باورچی بھی لبلبی پر دباؤ بڑھانے لگا۔ موت پستولوں کے دہانوں سے نکلنے والی تھی۔

میں، شہریار اور ڈاکٹر منجمد سے ہو کر رہ گئے۔ سانس سینے میں اٹکنے لگا۔ زندگی کسے عزیز نہیں ہوتی۔ اس وقت ایک چہکتی ہوئی آواز سن کر سب چونک اٹھے۔ نیلم اور اس کا دوست ہیرا دھک سے رہ

گئے۔ ادھر ادھر نگاہ دوڑانے پر سب کی نگاہیں کمرے کی اکلوتی کھڑکی پر جم کر رہ گئیں' اس کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔ وہاں سے شہریار کے بیٹے عمران کی لمبی واٹر پستول کی نال جھانک رہی تھی۔

"ہینڈز اپ اب تم لوگ بچ نہیں سکتے۔" عمران نے کسی ہیرو کی مانند باہر سے للکارا۔ شہریار کا چہرہ کھل اٹھا۔ اسی لمحے نیلم اور ہیرا نے پستول کا رخ کھڑکی کی طرف کر دیا۔ "یہ تو ابھی بچہ ہی ہے یہ کیا کر سکتا ہے اور یہ واٹر گن" نیلم نے کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اسی لمحے واٹر گن کا ٹرائیگر دب گیا اور پستول کی نال سے سرخ مرچ ملا پانی دھار کی صورت میں ہیرا کی آنکھوں میں جا پڑا۔ جو عمران کو نشانہ بنانے والا تھا۔ وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھے چیختا ہوا گھومنے لگا۔ پھر بیٹھتا چلا گیا۔ دوسری دھار فوراً نیلم کی آنکھوں پر پڑی۔ وہ بھی چیختی ہوئی پستول پھینک کر آنکھیں ملنے لگی۔ میں نے پستول نکالا تو تیسری دھار اس سے قبل میری آنکھوں پر بھی آ پڑی۔ میں بھی چیخنے لگا۔

اس وقت عمران اندر داخل ہوا' کسی فاتح جاسوس کی مانند' شہریار نے اسے سینے سے لگا لیا۔ میرا بہادر اور ذہین بچہ' کمال کر دیا تم نے' تم تو پورے جاسوس ہو' ننھے منے جاسوس۔" اس وقت بھاری قدموں کے ساتھ انسپکٹر کامران اندر داخل ہوا۔ ہمیں جکڑ کر آنکھیں صاف کر دی گئیں۔ اجرتی قاتل انسپکٹر کامران کی حراست میں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں' وہ سپاہیوں کے نرغے میں تھے۔

یہ قاتل مجھے اندر شہریار کے غائب ہونے کی خبر دینے آئے تھے کہ راستے میں انسپکٹر کامران نے انہیں گرفتار کر لیا۔ ادھر عمران نے میدان مار لیا۔

انسپکٹر کامران نے صورت حال جاننے کے بعد شہریار سے پوچھا کہ آپ کس طرح کوٹھی میں داخل ہوئے۔ باہر تو موت کے فرشتے موجود تھے۔" شہریار نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "خطرہ محسوس کرتے ہوئے ہم ڈاکٹر کا مکان چھوڑ کر اسی ہٹ میں چلے آئے تھے جہاں میرے بے رحم دوست نے مجھے قتل کیا تھا۔ اسی ہٹ کے عقب سے ایک سرنگ جو زمانہ قدیم کی بنی ہوئی ہے' اس کا دہانہ تجوری کے ساتھ والے کمرے میں نکلتا ہے۔ اس کے ذریعے ہم یہاں آنے میں کامیاب ہوئے۔ باغ میں ڈاکٹر نے اجرتی قاتلوں کو دیکھ لیا تھا۔

انسپکٹر کامران' شہریار کو بتانے لگا کہ "عمران بہت ذہین لڑکا ہے بالکل کسی جاسوس کی مانند' اس نے نیلم اور باورچی ہیرا کے تعلقات کو بھی بھانپ لیا تھا اور صورت حال نازک ہوتی دیکھ کر واٹر پستول کے پانی میں سرخ مرچ اور کالا نمک ملا دیا تھا۔"

ٹوٹے ہوئے شیشے کے متعلق عمران نے بتایا کہ ایک دن جب دودھ خراب کرنے والی بلی بھاگی تو پرانے باورچی نے کوئی وزنی شے اسے کھینچ ماری تھی جس سے شیشے میں سوراخ پڑ گیا تھا۔

روحانی علاج

حافظ شبیر احمد

ت س ...... کوہاٹ

جواب:۔ فجر کی نماز کے بعد سورۃ الفاتحہ 41 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ مرض والی جگہ پر ہاتھ رکھ کر پڑھیں۔ صدقہ بھی دیں۔ ان شاء اللہ بہت جلد آپ کا یہ مسئلہ حل ہوجائے گا۔

یہ عمل ہمیشہ جاری رکھیں گی تو کوئی بیماری مستقل نہیں ہوگی۔

نورین غلام سرور ...... قصور

جواب:۔ 1:۔ امتحان میں کامیابی کے لیے۔ "یا فتاح" 1 تسبیح روزانہ۔ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ امتحان شروع ہونے سے نتیجہ آنے تک سب کرسکتے ہیں۔

2:۔ ورزش کریں۔

آب علی ...... چکوال

جواب:۔ نوکری کے لیے:۔ سورۃ القریش ہر نماز کے بعد 21 مرتبہ یا رات کو 3 تسبیح بھائی خود کریں تو بہتر ہے۔ ورنہ والدہ کرلیں۔

مقدمہ میں کامیابی کے لیے:۔ "یا عدل" روزانہ 1000 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف رات کے وقت۔ پڑھتے وقت کامیابی کا تصور ذہن میں رکھیں۔

امتحان میں کامیابی کے لیے:۔ سورۃ القریش پڑھیں ہر نماز کے بعد 7 مرتبہ۔

آپ جو وظائف کرتی ہیں وہ کریں یا نہ کریں آپ کی مرضی۔ جن مسائل کے لیے رجوع کیا ہے ان کے لیے کوئی اور وظیفہ نہ پڑھیں علاوہ اس کے جو بتایا گیا ہے۔

رشتے کے لیے:۔ سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74' 70 مرتبہ بعد نماز فجر اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

اس شخص سے پیچھا چھڑانے کے لیے رات کے وقت 1 مرتبہ سورۃ نوح پڑھا کریں۔ پڑھتے وقت پیچھا چھڑانے کا تصور بھی رکھیں۔ یہ تمام وظائف پاکی کی حالت میں کرنے ہیں۔

پروین افضل ...... بہاول نگر

جواب:۔ 1:۔ میڈیکل چیک اپ کروائیے۔ اپنا اور شوہر کا۔ اس کا رزلٹ بتائیے پھر دیکھیں گے۔

2:۔ سورۃ یٰسین کی آیت نمبر 65 ہر نماز کے بعد 21 بار پڑھیں دیور کے لیے۔

فرزانہ بی بی ...... راولپنڈی

جواب:۔ ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ "یا فتاح" امتحان شروع ہونے سے نتیجہ آنے تک تینوں پڑھیں۔

ب۔ش۔زر ...... کراچی

میری بڑی بیٹی شادی کے لیے جمعہ جمعہ سورۃ رحمٰن پڑھ رہی ہے۔

جواب:۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74' 70 مرتبہ روزانہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ یقین کے ساتھ پڑھیں۔

طیبہ افتخار ...... ضلع جہلم

جواب:۔ سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74' 70 مرتبہ اول وآخر 11'11 درود شریف ہر نماز کے بعد سورۃ الفلق اور سورۃ الناس 9'9 مرتبہ۔

سیدہ فوزیہ گیلانی ...... لاہور

جواب:۔ ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ سورۃ الاخلاص پڑھیں۔ تصور رکھیں دونوں کاموں کے ہونے کا۔

ثوبیہ بی بی......کالوپنڈ

جواب:۔ رشتے کے لیے:۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74 '70 مرتبہ روزانہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

پورے گھر میں روزانہ پانی چھڑکیں اور پئیں بھی دم کرکے' باتھ روم کے علاوہ سورۃ الفلق' سورۃ الناس 41'41 مرتبہ۔ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

بہنیں ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ سورۃ الاخلاص پڑھیں اور دعا کریں۔ اپنے لیے بھی اور ابو کے لیے بھی۔

عائشہ ناز......ملتان

جواب:۔ "یا علیم علمنی" پڑھنے سے پہلے 21 بار پڑھ کر سبق یاد کریں۔ ان شاء اللہ کامیابی ہوگی۔

ع'ش......ڈنگہ

جواب:۔1:۔ جب گھر چینی آئے اس پر 3 مرتبہ سورۃ مزمل پڑھ کر دم کردیں۔ چینی سب کے استعمال میں آئے۔ (اول وآخر 3'3 بار درود شریف)۔

2:۔ قرض کی ادائیگی کے لیے عشاء کی نماز کے بعد 7 مرتبہ سورۃ العادیان پڑھیں اور دعا کریں۔

3:۔ پلاٹ بیچنے کے لیے ہر نماز کے بعد سورۃ القریش 11 مرتبہ دعا کریں ان شاء اللہ جلد اچھا سودا ہوجائے گا۔

ثمازیہ اختر......فیصل آباد

جواب:۔ عمل جاری رکھیں۔ مسئلہ ضرور حل ہوگا۔ صدقہ بھی دیں۔

ثمرہ......جہلم

جواب:۔ جب شوہر سوجائیں ان کے سرہانے کھڑے ہوکر 1 تسبیح سورۃ الاخلاص پڑھیں اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ دعا بھی کریں۔

سلمان علی......ملتان

جواب:۔ سونے سے پہلے اول:۔ 25 بار درود ابراہیمی دوئم:۔ 125 بار سورۃ النصر سوئم:۔ 25 بار درود ابراہیمی بعد پڑھنے کے دعا مانگیں روزانہ۔

نوٹ

جن مسائل کے جوابات دیئے گئے ہیں وہ صرف انہی لوگوں کے لیے ہیں جنہوں نے سوالات کیے ہیں۔ عام انسان بغیر اجازت ان پر عمل نہ کریں۔ عمل کرنے کی صورت میں ادارہ کسی صورت ذمہ دار نہیں ہوگا۔

ای میل صرف بیرون ملک مقیم افراد کے لیے ہے۔

rohanimasail@gmail.com

روحانی مسائل کا حل کوپن برائے مارچ 2013ء

نام.................. والدہ کا نام.................. گھر کا مکمل پتا..................

....

گھر کے کون سے حصے میں رہائش پزیر ہیں..................

خوشبو سخن

عمر احمد

وچھوڑا

کسی کے بچھڑنے سے
زندگی کا کارواں رکتا نہیں
چلتا رہتا ہے
غم اور خوشی کا سماں
یونہی بدلتا رہتا ہے
دھوپ اور چھاؤں کا کھیل
یونہی آنکھ مچولی کھیلتا ہے
زمانے کا رنگ بدلتا نہیں
مگر
دل کے نہاں خانوں میں سناٹا بڑھتا جاتا ہے
روح کی گہرائیوں میں اک خلا سا ابھرتا ہے
جو دکھائی نہیں دیتا
کوئی چاہت اسے بھر نہیں سکتی
ہجر کا یہ خلا
روح و دل میں یونہی سدا رہتا ہے
کبھی بھرتا نہیں

طاہرہ جبین تارا...... لاہور

جو میرے جیسا ہو

مجھے تلاش ہے اس کی
جو میرے جیسا ہو
نہ ہو فرشتہ نہ فرشتوں جیسا ہو
نہ دور دیس کا شہزادہ ہو
مجھے تلاش ہے اس کی
جو میرے جیسا ہو
نہ ہو وقت کا امام
نہ پرستان کا راجہ ہو
میں انسان ہوں جیسی
وہ میرے جیسا ہو
میرے دکھ کو جانتا، میرے خلوص کو پہچانتا ہو
وہ میری ذات کی سب گہرائیوں سے واقف ہو
مجھے تلاش ہے اس کی
جو میرے جیسا ہو
منافقتوں کے پردے میں وہ نہ لپٹا ہو
وہ میری حساسیت سے آشنا ہو
وہ دلداریوں کے سب ہنر سے واقف ہو
وہ میرا ہم سفر وہ میرا ساتھی وہ میرا رہبر ہو
مجھے تلاش ہے اس کی
جو میرے جیسا ہو

ریحانہ سعیدہ...... لاہور

فصل فراق

چشم نم کی بارش میں
دریچے کی چوکھٹ سے لگا
جانے کتنے سمے سے
موج ہوا کے ساتھ
رقص کرتی ہوائیں
تلاطم خیز یادوں کے بھنور کے بیچ
کسی بوسیدہ بادبان کی طرح
بھیگی ہوئی بوجھل پلکوں پر
برہنہ پا
انگلیوں کے لہولہو
نازک پوروں سے
اپنے پندار کی کرچیاں
سمیٹتے اور سوچتے ہوئے
جانے کون سا خواب بن رہا ہے
جیسے خواہشیں بانجھ ہو گئی ہوں
زرد آب رتوں کی تنہائی ہے
تپتے ہوئے دشت میں
سرابوں کا سفر جاری ہے

ان زخموں کی مہک سے
کسی کا لمس پایا ہے
شاید......!!
موسم فصل فراق آیا ہے
عبدالحکیم ساجد......منچن آباد

غزل

جب بھی لٹے رفاقتوں کے نام پر لٹے
اتنا سمجھ لو دوستو ہم بے خبر لٹے
اس راہ گزار زیست پر چلتے تو ہیں مگر
کتنے ہی کارواں دوران سفر لٹے
اس کارواں کی عقل میں جانو فتور ہے
جو ایک ہی مقام پر بارد گر لٹے
پھر تو امیر شہر بھی ٹھرا کر رہ گیا
اس شہر بے مثال میں جب گھر کے گھر لٹے
کس مصلحت کے تحت ہیں ہم اس پر گامزن
جس راہ گزر میں قافلے شام و سحر لٹے
محفوظ جس مقام سے گزرے ہیں سادہ لوح
صد حیف اس مقام پر اہل ہنر لٹے
غیروں کے ہاتھوں سے رہا محفوظ عمر بھر
پھر دوستوں کے ہاتھوں سے کیسے قمر لٹے
ریاض حسین قمر......منگلا ڈیم

گھنی چھاؤں

سنسناتی ہوئی
دوپہر ہر طرف
چلچلاتی ہوئی
دھوپ تھی ہر طرف
کوئی پیاسا بہت
کوئی زخمی بہت
کوئی بے آسرا
سب ہی بے خانماں
سب ہی مجروح ہیں
سب ہی مفتوح ہیں
کون جارح یہاں؟
کون فاتح یہاں؟
کون منصف بنے؟
اس قدر دھوپ میں
سب پہ سایہ فگن
اپنی دھن میں مگن
سب کو آواز دو
زندگی بانٹ دو
ایستادہ رہو
مستعد تم رہو
تم گھنی چھاؤں ہو
تم گھنی چھاؤں ہو
ڈاکٹر قمر عالم......کراچی

غزل

زادِرہ لے کے یادوں کی تنویر میں
گمشدہ راستوں کا ہوں راہگیر میں
اُس سے کہہ دو کہ لے جائے آنکھیں مری
اُس کی دل میں سنبھالوں گا تصویر میں
گاؤں اُجڑا ہُوا پھر سے آباد ہو
اِک حویلی کروں ایسی تعمیر میں
پھر خوشی شرم سے منہ چھپاتی پھرے
بانٹ دوں گر یہاں غم کی جاگیر میں
کوئی بتلائے بھی کیا خطا ہے مری
کس لئے سہہ رہا ہوں یوں تعزیر میں
مجھ کو دی ہے امانت میاں قیس نے
عشق! تیری بڑھاؤں گا توقیر میں
مرے دشمن صفیں باندھ کر ہیں کھڑے
اب کہ ارشد اُٹھاؤں گا شمشیر میں
ارشد محمود ارشد

ذوقِ آگہی

عفان احمد

جدید ضرب المثل

☆ دلہے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔

☆ خاوند وہ جو ساس کے کام آئے۔

☆ بھاگتے شوہر کی ریزگاری ہی سہی۔

محمد یعقوب حماس...... ڈیرہ غازی خان

حسد کی خرابی

مجھ سے کسی کو اذیت نہ پہنچے یہ تو میں کر سکتا ہوں لیکن مجھ سے حسد کرنے والوں کو میں کیا کروں وہ خود ہی حسد کے سبب سے رنج اور تکلیف میں پڑے ہوئے ہیں۔

اے حاسد! تو مر جا اس لیے کہ دوسروں کے بارے میں جلا پا (تمناء زوالِ نعمتِ غیر) ایسی مصیبت ہے کہ اس کی ایذا اور خرابی سے سوائے موت کے چھٹکارا ملنا مشکل ہے۔ (گلستان ص ۱۵)

رفیق اے ڈوگر...... لاہور

سلطان محمود غزنوی رحمہ اللہ تعالیٰ اور ایاز کا قصہ

غزنی کے بادشاہ کی ایک شخص نے بُرائی بیان کی کہ تعجب کی بات ہے ایاز میں کوئی حسن و جمال بھی نہیں اور بادشاہ اس سے محبت رکھتا ہے، جس پھول میں نہ رنگ ہو نہ خوش بُو اس پر بلبل کا عاشق ہونا عجیب ہے۔ کسی نے یہ بات سلطان محمود سے کہہ دی۔ وہ رنج و غم میں پڑ گیا اور کہا: اے صاحب! مجھے اس کی عادت سے عشق ہے نہ کہ اس کے قد اور خوب صورتی سے۔ حضرت سعدی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں نے سنا ہے کہ اونٹ ایک تنگ جگہ میں گر پڑا اور موتیوں کا صندوق ٹوٹ گیا بادشاہ نے لوٹ لینے کی عام اجازت دے دی اور وہاں سے جلدی جلدی سواری ہنکا دی، سوار لوگ بادشاہ سے غافل ہو کر موتی اور مونگے لوٹنے میں لگ گئے۔ بڑے بڑے نوکروں میں سے بادشاہ کے پیچھے ایاز کے سوا کوئی بھی نہ رہا۔ اس نے دیکھ کر کہا: اے خمدار زلفوں والے محبوب! لوٹ میں سے کیا لایا؟ اس نے کہا: کچھ بھی نہیں میں تو آپ کے پیچھے دوڑتا رہا، خدمت گزاری کی وجہ سے مال میں نہ لگا۔ (سبحان اللہ کیا وفاداری ہے)

فائدہ: درباریوں کو کسی حال میں بادشاہ سے غافل نہیں ہونا چاہیے طریقت کے خلاف ہوگا اگر اولیاء خدا کے علاوہ دوسرے سے تمنا کرنے لگیں اگر تیری نگاہیں دوست کے احسان پر لگی ہیں تو تُو اپنی فکر میں ہے نہ کہ دوست کی جب تک حرص سے تیرا منہ کھلا ہوا ہے تیرے دل کے کان میں غیب سے کوئی راز نہیں آئے گا۔

ثوبیہ ناز...... کوئٹہ

نفع اور نقصان کا تعلق تقدیر سے ہے

ایک کمزور شکاری کے جال میں ایک بڑی مچھلی آ پھنسی وہ اس کو روکنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا، مچھلی اس پر غالب آ گئی اور جال ہاتھ سے چھڑا لے گئی (ایک غلام ندی کا پانی لینے گیا ندی کا پانی آیا اور غلام کو بہا لے گیا) جال ہر دفعہ مچھلی لاتا تھا اس مرتبہ مچھلی جال کو لے گئی، شکاری ہر بار شکار حاصل کرتا، کبھی نقصان بھی اٹھانا پڑتا ہے)۔ دوسرے شکاریوں نے افسوس کیا اور ملامت کرنے لگے کہ ایسا شکار تیرے جال میں پھنسا اور تو اس کی حفاظت نہ کر سکا تو اس نے کہا: اے بھائیو! میں کیا کر سکتا تھا وہ مچھلی میری روزی نہیں تھی اور ابھی اس کی زندگی کے دن باقی تھے مطلب یہ کہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں وہ مچھلی میرے نصیب میں نہیں تھی۔ (گلستان ص ۱۳۲)

فائدہ بے روزی کے شکاری دریا میں مچھلی نہیں پکڑ سکتا ہے اور بے موت کے مچھلی خشکی پر نہیں مر سکتی ہے، نفع اور نقصان سب اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ (تقدیر حق ہے)

خرم افتخار...... کراچی

دعا

اے اللہ! تو وہ ذات ہے کہ تیرے لیے سجدہ ریز ہے رات کی تاریکی اور دن کا نور، چاند کی چاندنی، سورج کی شعاعیں اور بہتے پانی کا شور، درختوں کی سرسراہٹ۔ اے اللہ! تو وہ ذات ہے کہ تجھ جیسا کوئی نہیں تو ہر چیز پر قادر ہے۔ اے اللہ! تو نے مجھے پیدا کیا۔

اور نہیں تھی۔ تھا۔ میں کوئی چیز، ظلم کیا میں نے خود پر اور مجھ سے گناہ ہوئے اور میں اپنے گناہوں کا اقرار کرتا/کرتی ہوں۔" اے میرے رب! مجھے معاف کردے۔ اگر کردے تو مغفرت میرے لیے۔ اے میرے رب! پس نہیں کمی ہوگی تیری بادشاہت میں اور اگر تو مجھے عذاب دے۔ اے میرے رب! تو تیری سلطنت میں اضافہ نہ ہوگا کسی چیز کا۔ اے میرے رب! اور تیرے بغیر کسی سے میرے گناہوں کی مغفرت نہیں مل سکتی۔ اے میرے رب! پس مجھے بخش دے (آمین)۔

ماخوذ ترجمہ دعائے قدح معظم سے

محمد حذیفہ پیرزادہ...... ناظم آباد

فہم و فراست کی اعلیٰ مثال

خلفائے راشدین ہمارے لیے قابل صد احترام ہیں۔ چاروں آسمان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چمکتے دمکتے وہ ستارے ہیں جن کی مثال نہ تھی۔ نہ قیامت تک ہوگی۔ ہر خلیفہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر سایہ پروان چڑھا اور عشرہ مبشرہ کے قابل ترین شرکا میں تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو باب العلم اور حیدر کرار کہا۔ آپ فن ضرب میں یکتا تھے اور آپؓ نے بعض روایات کے مطابق الجبرا میں سب سے پہلے صفر کا استعمال کیا اور آج چودہ سو سال کے بعد کمپیوٹر کی زبان میں صفر ہی کا عمل دخل ہے۔ اگر صفر کا ہندسہ نہ ہوتا تو پھر کمپیوٹر بے کار تھا۔ یہ حضرت علی کی عقل و دانش کی ایسی مثال ہے جس کا دوسرا ثانی نہیں۔ ایک مرتبہ آپؓ ایک مجلس میں تشریف فرما تھے کہ اتنے میں تین شخص حاضر ہوئے تھوڑی دیر کے بعد آپؓ نے توجہ دی اور پوچھا کہ تم لوگ کیسے آئے ہو؟ تینوں ذرا بے چین تھے ایک نے بڑھ کر عرض خدمت کیا کہ حضور ہمارے ساتھ ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔ حضرت علیؓ نے استفسار کیا کہ کیا مسئلہ ہے؟ وہ لوگ بولے کہ ہمیں وراثت میں سترہ اونٹ ملے ہیں کئی دن سے الجھے ہوئے ہیں کہ وصیت میں ان اونٹوں میں آدھے اونٹ ایک کو ملیں گے دوسرے کو تیسرا حصہ اور تیسرے بھائی کو نواں حصہ ملے گا۔ حضرت علیؓ نے چند لمحے خاموشی اختیار کی اور بولے۔ دیکھو ہم ایسا کرتے ہیں کہ ان 17 اونٹوں میں فی الحال ایک فرضی اونٹ جمع کر لیتے ہیں۔ یہ اٹھارہ ہو گئے۔ اب ان کو وصیت کے مطابق تقسیم کر دیتے ہیں۔ اس طرح یہ حساب ہوا پہلے والے کو 9 اونٹ، دوسرے کو 6 اونٹ اور تیسرے کو 2 اونٹ ملیں گے۔ اس طرح کل 17 اونٹ ہو گئے فرضی جمع کیا گیا اونٹ بھی فرضی ہی رہا۔ لو بھئی تم لوگوں کی پریشانی دور ہو گئی۔

حضرت علیؓ کی ذہانت کا یہ کرشمہ سن کر نہ صرف احباب مجلس دنگ رہ گئے بلکہ ان تینوں نے بھی حضرت علیؓ کے ہاتھ چوم لیے۔ مسلمان شروع سے ہی بے مثل تھے یہ مال و زر کے لالچ میں آ کر خراب ہوئے۔ جنگ وجدل کے بعد بہت عرصہ مسلمان دنیا پر حکمرانی کرتے رہے۔ کاش آج بھی مسلمانوں کو وہی عروج مل جائے۔

ابن مقبول جاوید احمد صدیقی...... راولپنڈی

قسط نمبر 7

جگت سنگھ

شمیم نوید

شمیم نوید

تاریخ کے صفحات میں محفوظ سرزمین پنجاب کی ایسی دلگداز داستان جو کلاسک داستانوں میں شمار ہوتی ہے..... جور و جبر کے خلاف بغاوت کی آتشیں آندھیوں کا احوال' جو حاکمانہ غرور کے کوہساروں کے ساتھ پورے جاہ و جلال سے ٹکراجاتی ہیں۔ یہ کہانی ان لوگوں کے لیے بھی فسانۂ عبرت ہے' جو آنے والی نسلوں کو انتقام اور دشمنی کے جذبات منتقل کرتے رہتے ہیں اور سیدھے سادھے نوجوان "جگت سنگھ" بن جاتے ہیں اور پھر حالات کسی کے قابو میں نہیں رہتے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار "جگت سنگھ" ایک ایسا ڈاکو ہے جس کا نام سن کر بڑے بڑے بہادروں کا پتہ پانی ہو جاتا تھا۔ دراصل فطری طور پر امن و آشتی کا پیامبر ہے۔ "جگت سنگھ" کے کردار کا رومانی پہلو' جو شروع سے آخر تک "چندن" اور "ویرو" کی صورت میں اس کہانی میں رچا بسا نظر آتا ہے اس بات کا معتبر ترین گواہ ہے کہ لطیف جذبات رکھنے والا نوجوان جسے دنیا خطرناک ڈاکو کے طور پر جانتی ہے اندر سے کتنا نرم اور محبت کرنے والا ہے۔

"جگت سنگھ" کہاں سے چلا اور کہاں پہنچا' آئیے قارئین یہ جاننے کے لیے ہم بھی زیر نظر کہانی میں "جگت سنگھ" کے ساتھ ساتھ گاؤں کے سرسبز کھلیانوں' اونچے نیچے ٹیلوں اور پر خطر کھنڈرات کے نشیب و فراز میں سفر کرتے ہیں۔

"میں ابھی اس کا فیصلہ کر دیتا مگر پھر کبھی اسے نبٹا دوں گا۔ کیونکہ دھما کا کر کے میں پولیس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانا نہیں چاہتا۔" جگت نے ڈاکٹر کو سچ بات بتادی۔

"تم نے مجھے منہ مانگا بدلہ دینے کا وعدہ کیا ہے جگت۔" ڈاکٹر نے دھیمے لہجے میں کہا۔

جگت ہوشیار ہوگیا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ ڈاکٹر کی نیت میں گڑبڑ ضرور ہے۔ کیونکہ کچھ دیر پہلے اس نے اپنی بیوی سے کہا تھا "یہ جگا ڈاکو ہے اور اس کے سر پر پانچ ہزار کا انعام ہے۔" جگت نے کچھ سوچ کر کہا۔

"ڈاکٹر صاحب کیا آپ کو پیسے کی ضرورت ہے؟"

"بالکل یہاں اسپتال بنانا ہے۔ کچھ میں نے جمع کیے ہیں پھر بھی پانچ ہزار میں کام ہو جائے گا۔" ڈاکٹر جگت کا امتحان لے رہا تھا۔ جگت کی الجھن بڑھ گئی۔ پانچ ہزار کا ہندسہ اسے مزید شک میں گرفتار کر رہا تھا۔

"میں آپ کو روپے لا دوں گا۔ یہ وعدہ کرتا ہوں۔" جگت نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"نہیں' نہیں' لوٹ کے پیسے سے اسپتال نہیں بناؤں گا۔" ڈاکٹر نے سر ہلا کر کہا۔

"اس دنیا میں کون نہیں لوٹتا ڈاکٹر صاحب؟" جگت نے مٹھیاں کس کر کہا۔ "سرمایہ دار غریب کو لوٹتے ہیں' زمیندار کسانوں کو لوٹتے ہیں کارخانے دار مزدوروں کو لوٹتے ہیں بیوپاری گاہک کی جیب خالی کر لیتے ہیں میں ان سفید لباس لٹیروں کو لوٹ کر اور خطروں سے جنگ کرتا ہوا پیسے لاتا ہوں آپ اسے حرام کی کمائی سمجھتے ہیں؟" جگت کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے۔ اسے اس سرمایہ دارانہ لوٹ کھسوٹ کے نظام سے نفرت تھی۔ محنت کشوں کا خون چوس کر دولت جمع کرنے والا اور حویلیاں بنانے والا سرمایہ دار

جب انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے کسی بہادر محنت کش کو مسلح ہو کر مقابلہ کرتے دیکھتا ہے تو چلا اٹھتا ہے ظلم ہو رہا ہے بچاؤ مگر جب وہ لاکھوں انسانوں کے منہ سے نوالہ چھین کر اپنی تجوری کا وزن بڑھاتا ہے۔ اس وقت ان کی آہ و فریاد سننے کے لیے اس کے کان بہرے ہو جاتے ہیں۔ جگت پڑھا لکھا نہ ہو کر بھی یہ سب کچھ جانتا تھا اور اس کے سینے میں انتقام کے شعلے بھڑک رہے تھے۔

''جگت سنگھ، تم بہت زیادہ جوش میں آ گئے ہو۔'' پہلی بار ڈاکٹر نے اسے پورے نام سے پکارا۔

''اگر ڈاکو بننا گناہ نہ ہوتا تو ساری دنیا محنت مزدوری کر کے پیسہ کمانے کی بجائے ڈاکے ڈالتی۔''

''یہ سچ ہے ڈاکٹر مگر آپ کو ڈاکو کون بناتا ہے۔ آپ نے کبھی یہ سوچا ہے؟'' جگت پہلی بار دل کی بھڑاس نکال رہا تھا۔

''باپ دادا کی زمین کے سلسلے میں ناانصافی ہوئی دشمنی شروع ہو گئی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اپنے دو جوان بھائیوں کی لاشیں دیکھیں۔ یہ سب یاد آتا ہے تو میرا خون کھول اٹھتا ہے۔ ڈاکٹر مجھے اس طرح جنگلوں میں بھٹکنے اور مارے مارے پھرنے کا شوق نہیں ہے۔ میرے ماں باپ ہیں، بیوی ہے جس کے ساتھ میں نے اپنی زندگی کی صرف ایک رات گزاری ہے۔ میں نے اب تک اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا بھی نہیں کھایا۔ سر پر کفن باندھ کر اس طرح دن رات بھٹکتا رہتا ہوں۔''

ڈاکٹر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ پھر سر ہلا کر بولا۔ ''یہ حقیقت ہے کہ جب ظلم حد سے گزر جاتا ہے تو انسان کے ذہن میں انقلاب جنم لیتا ہے اور جب انقلاب جنم لیتا ہے تو اس کے ہاتھوں کی مٹھیاں کس جاتی ہیں اور بغاوت کے شعلے بھڑکنے لگتے ہیں مگر......!''

ڈاکٹر اپنے گلے میں پڑے ہوئے کراس پر انگلیاں پھیرنے لگا۔ ہنومان کے ہونٹ ایک بار پھر متحرک نظر آ رہے تھے۔ ڈاکٹر اور جگا دونوں اس کے قریب آ گئے۔ ڈاکٹر نے اس کی نبض دیکھی پھر سر پر ہاتھ رکھا۔

''دوا کا نشہ ٹوٹ رہا ہے اور بخار چڑھ رہا ہے۔'' ڈاکٹر نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ اس کی بیوی کرسی پر بیٹھی بیٹھی سو چکی تھی۔ اس لیے ڈاکٹر نے خود پانی میں کپڑا بھگو کر ہنومان کی پیشانی پر رکھا۔ جگت نے ڈاکٹر سے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب یہ کام مجھے بھی آتا ہے آپ کچھ دیر آرام کر لیں۔''

ڈاکٹر مسکرا دیا۔ ''آرام نہیں ہو سکتا بیٹے۔'' ڈاکٹر کی آواز میں فکر جھلک رہی تھی۔ ''ابھی یہ خطرے میں ہے۔'' جگت کا دل کانپ گیا اس کے ہاتھ کی مٹھیاں کس گئیں۔

''اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں انسپکٹر سنہا کو ختم کر دوں گا۔''

''کسی کو ختم کرنے کے خیال سے تم اسے زندگی نہیں دے سکتے جگت۔'' ڈاکٹر نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ''مگر میں اسے زندہ رکھنا چاہتا ہوں کیونکہ تم مجھے پورا معاوضہ دو گے۔'' ڈاکٹر کے ہونٹوں پر پراسرار سی مسکراہٹ تھی۔ جگت نے محسوس کیا ڈاکٹر یہی ایک بات بار بار دہرا رہا ہے۔ وہ مجھ سے کیا بدلہ چاہتا ہے؟ آخر اس نے مشکوک انداز میں کہا۔

''ڈاکٹر صاحب اگر آپ مجھے گرفتار کرا کر پانچ ہزار روپے وصول کرنا چاہتے ہیں تو......!'' اتنا کہہ کر وہ رک گیا۔ پھر چارپائی پر پڑی ہوئی رائفل اٹھا کر بولا۔ ''پولیس میری لاش کا بھی اتنا ہی انعام دے گی۔ اس

لیے مجھے زندہ سپرد کرنے کی بجائے آپ مجھے گولی مار دیں۔" جگت کے لہجے میں ہارے ہوئے جواری کا سا دکھ تھا۔

"تو تم میرے ہاتھ سے قتل ہونا چاہتے ہو؟" ڈاکٹر نے عجیب سا سوال کیا۔

"ایسا نہیں تو پھر میں خود کو گولی مار کر ختم کرلوں گا۔" جگت نے پرجوش لہجے میں کہا۔

"خودکشی کرنے سے روح کا نقصان ہوتا ہے بیٹے خدا ناراض ہوتا ہے کیا تمہیں نہیں معلوم؟" جگت سوچ رہا تھا کہ وہ ہر بات میں شکست کھا رہا ہے۔ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا جواب دے؟ مگر ڈاکٹر اسی طرح پرسکون تھا۔ "تم زیادہ جلد باز مت بنو پہلے اپنے ساتھی کو ٹھیک ہونے دو۔"

کچھ دیر بعد جگا کو بیٹھے بیٹھے نیند آ گئی۔ اسے کچھ احساس نہیں رہا۔ ڈاکٹر نے اس کے شانے ہلائے تو وہ چونک کر جاگ گیا اور اس کا ہاتھ رائفل کے دستے پر جم گیا۔ مگر مسکراتے ہوئے ڈاکٹر کو دیکھ کر مطمئن ہو گیا۔

"اب تمہارا ساتھی خطرے سے باہر ہے لہٰذا تم بستر پر جا کر لیٹ جاؤ۔" ڈاکٹر نے کہا۔

مگر جواب میں جگت کھڑا ہو گیا اور ہنومان کی پیشانی پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "میں نے اسے نیند کی گولی دے کر سلایا ہے کیونکہ تکلیف سے یہ ہاتھ پٹخ رہا تھا۔"

"ڈاکٹر صاحب آپ نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔" یہ کہتے ہوئے جگت نے دیوار کی جانب دیکھا مگر گھڑی نہیں تھی لہٰذا ڈاکٹر سے پوچھا۔ "کیا وقت ہوا ہے؟"

جیب سے پاکٹ واچ نکال کر ڈاکٹر نے کہا۔

"تین بجے ہیں۔"

"پھر میں اسے لے جاتا ہوں۔" جگت نے عاجزانہ نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"کیوں اتنی کیا جلدی ہے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"صبح سے پہلے مجھے بحفاظت اپنے ٹھکانے پر پہنچ جانا چاہیے۔"

"میں اسے لے جانے کا مشورہ نہیں دوں گا تم جا سکتے ہو۔" ڈاکٹر نے جواب میں کہا۔

"اور صبح پولیس یہاں آ گئی پھر؟" اس نے ڈاکٹر کو آزمانے کے لیے کہا۔ "یہاں تک پہنچنے کے لیے انہیں نشانیاں مل جائیں گی اور آپ ہنومان کو پولیس کے سپرد کر دیں گے۔"

ڈاکٹر سوچ میں ڈوب گیا۔

"تمہاری بات درست ہے۔ کیونکہ موت کے پنجے سے بچانا میرا فرض ہے مگر قانون کے پنجے سے نہیں بچا سکتا۔ جاؤ اسے لے جاؤ یسوع مسیح اس کی حفاظت کریں گے۔" یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر نے گردن میں لٹکتے ہوئے کراس کو آنکھوں سے لگایا۔ پھر بستر بنانے کے بعد جگت اور ڈاکٹر نے ہنومان کو چارپائی پر لٹا دیا۔ کچھ دیر تک جگت ڈاکٹر کو دیکھتا رہا پھر کچھ یاد کر کے اندر والے کمرے میں گیا۔ کرسی پر سوئی ہوئی میری کے سامنے اس نے سر جھکایا پھر میز پر پڑے ہوئے دودھ کے گلاس کو پی گیا اور ڈبل روٹی کے دو ٹکڑے جیب میں رکھ لیے۔

"ماں جی سے کہنا دودھ بہت میٹھا تھا۔" یہ کہتے ہوئے جگت کی آواز بھرا گئی۔ ڈاکٹر نے اس کے ہاتھ میں دو پڑیاں تھما دیں۔

"یہ مرہم زخم پر چار چار گھنٹے بعد لگانا اور دوا جب اسے درد محسوس ہو پانی میں ڈال کر پلا دینا۔" ڈاکٹر نے اسے دوا کے استعمال کا طریقہ بتایا۔ جگت نے جھک کر ڈاکٹر کے پیر چھوئے۔

"میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا

ڈاکٹر۔" جگت نے بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کی آنکھوں کے کونے بھیگ گئے اور اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے وہ جلدی سے پشت پھیر کر باہر کی جانب بڑھا فوراً ہی ڈاکٹر کی آواز نے اس کے قدم روک لیے۔

"ٹھہرو تم نے مجھے کچھ دینے کا وعدہ کیا تھا کیا بھول گئے۔"

آنکھیں خشک کر کے جگت ڈاکٹر کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ ایک کاغذ پر کچھ لکھ رہے تھے۔ انہوں نے اس کو تہہ کر کے جگت کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"کیا اس میں دوا لکھی ہے آپ نے؟" جگت نے پوچھا۔

"ہاں، مگر تمہارے لیے صبح اٹھ کر اور شام سونے سے پہلے اسے پڑھ لینا سمجھ لینا مجھے معاوضہ مل گیا۔" ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔ جگت کی آنکھوں سے حیرت جھانکنے لگی۔ اسے ڈاکٹر بالکل یسوع مسیح دکھائی دے رہا تھا۔

"مجھے معاف کرنا ڈاکٹر صاحب میں نے آپ پر غلط شک کیا تھا آپ عظیم ہیں۔" وہ زیادہ نہ بول سکا کیونکہ آواز حلق میں اٹک گئی تھی۔ پھر وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔

جگت اور ہنومان کو بحفاظت واپس آتے دیکھ کر ساتھی مسرت سے چیخ اٹھے۔ جگت نے سب سے پہلے پوچھا۔

"ہم میں سے اور کتنے زخمی ہوئے؟"

سب لوگ چپ ہو گئے بچن نے کہا "چھ زخمی ہوئے اور چار کام آ گئے۔"

جگت غم میں ڈوب گیا۔ پہلی بار اس کی پارٹی کو اتنا نقصان ہوا تھا۔ اسے انسپکٹر سنہا پر غصہ آ گیا۔ ہنومان کو کمرے میں لٹا کر وہ واپس آیا اور اپنے صافے کے سرے میں سے ڈاکٹر کا دیا ہوا پرچہ کھول کر پڑھنے لگا اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں لکھا تھا۔

"انتقام لینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اسے اپنے دل میں ہی سما لینا چاہیے۔ یسوع مسیح تمہاری مدد کریں۔"

❀ ❀ ❀
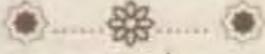
جہاں ڈاکوؤں اور پولیس کے درمیان جھڑپ ہوئی تھی وہ جگہ ارجن سنگھ کی پارٹی کے پڑاؤ سے پانچ میل دور تھی۔ زخمی اور بے ہوش سنہا کو لے کر پولیس اس جگہ تک پہنچی۔ اس وقت ارجن سنگھ نشہ کر کے جوا کھیل رہا تھا۔ ایک شخص نے آ کر اطلاع دی۔

"صاحب سنہا صاحب جھڑپ میں......!"

اس وقت چونکتے ہوئے ارجن سنگھ نے کہا۔ "ختم ہو گئے؟"

"نہیں بری طرح زخمی ہو گئے ہیں۔" جواب میں کہا گیا۔

ارجن سنگھ نے انسپکٹر سنہا کے دو انجام سوچ لیے تھے۔ ڈاکوؤں کی گولی سے خاتمہ یا بدنامی کے ساتھ استعفیٰ، زخمی سنہا کی جیت نہ ہوئی پھر بھی وہ شکست خوردہ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ بے ہوش سنہا کے چہرے پر ارجن سنگھ نے جنون دیکھا۔ زخموں سے چور سنہا بڑبڑا رہا تھا۔

"اس کا تعاقب کرو اسے فرار نہ ہونے دینا۔"

ارجن سمجھ گیا کہ جگا فرار ہو گیا ہے۔ اس نے آنے والے لوگوں سے پوچھا۔

"ڈاکوؤں کا سردار زخمی ہوا یا صحیح سلامت نکل بھاگا؟"

"ہم تو جگا کو نہیں پہچانتے جناب مگر انسپکٹر سنہا اس کا تعاقب کرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"وہ جگا ہے۔" مگر وہ اپنے زخمی ساتھی کو اٹھا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ سنہا صاحب زخم کی تاب

نہ لا کر بے ہوش ہوگئے۔"

"ڈاکوؤں میں سے کتنے مارے گئے؟" ارجن نے پوچھا۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ سنہا صاحب کو کتنا فائدہ ہوا؟

"تین یا چار مارے گئے ہوں گے جناب ان کی لاشوں پر بھی سخت جھڑپ ہوئی ڈاکو اپنے ساتھیوں کے ہاتھ اور گردنیں کاٹ کر لے گئے۔" اس شخص نے مودبانہ لہجے میں کہا۔

"بہت سے لوگ اپنے ہاتھ پر اپنا نام لکھواتے ہیں مرنے والے کو ہاتھ پر لکھے ہوئے نام یا چہرے سے پہچان نہ لیا جائے اس لیے ڈاکو اپنے جس ساتھی کی لاش نہیں لے سکتے اس کے ہاتھ اور گردن لے جاتے ہیں۔ اس بات سے ارجن سنگھ واقف تھا۔ وہ کسی خیال میں غرق تھا۔ اس وقت ایک پولیس کانسٹیبل نے مشورہ دیا۔

"صاحب' اگر آپ پارٹی کے ساتھ ڈاکوؤں کا تعاقب کریں تو ہم انہیں گھیر سکتے ہیں۔ منتشر ڈاکوؤں میں سے کوئی ضرور ہاتھ لگے گا۔ جگا بھی اپنا زخمی ساتھی لے کر زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔"

ارجن یہ بات سمجھتا تھا سپاہی کا حساب ٹھیک تھا مگر ارجن کی نیت خراب تھی۔ اس نے بہانا بنایا اور مصنوعی غصے سے بولا۔

"ہمارے صاحب اس حالت میں ہیں اس وقت ہمارا فرض ان کا فوری علاج کرانا ہے۔ صاحب کو کچھ ہوگیا تو پولیس ڈیپارٹمنٹ کی عزت کو زبردست نقصان ہوگا۔"

ارجن سنگھ اگر پیچھا کرتا تو ڈاکوؤں کی پارٹی ختم ہوجاتی جگا ضرور ہاتھ آ جاتا کیونکہ وہ دس میل دور کرپچن ڈاکٹر کے گھر میں انہیں مل جاتا۔ مگر ارجن سنگھ کو ترقی چاہیے تھی۔ وہ اپنے افسر کے استعفیٰ کا منتظر تھا۔ سحر کے وقت ہی ارجن سنگھ نے سنہا کی بیوی کو جگایا۔ ارجن سنگھ کے چہرے پر غم دیکھ کر وہ لرز گئی۔ بری خبر سننے کی وجہ سے ان کا دل دھڑکنے لگا۔

"صاحب زخمی ہیں اور اسپتال میں بے ہوش

پڑے ہیں۔ میں آپ کو بلانے آیا ہوں۔" ارجن سنگھ نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ارجن سنگھ سے پربھاوتی دیوی کو پہلے سے نفرت تھی۔ جس شخص سے نفرت ہو وہی شخص بری خبر لے کر آئے اس صورت میں وہ اور برا دکھائی دیتا ہے۔ ایک سرد آہ بھر کر وہ اپنی سوئی ہوئی بچی پر نظر ڈالتی ہوئی تیزی سے باہر آ گئی۔ اس کا دل بھگوان سے پرارتھنا کر رہا تھا۔

"مجھے اور میری معصوم بچی کو بے سہارا نہ کر دینا بھگوان ہم نے کبھی کسی کا کچھ نہیں بگاڑا۔"

پھر کچھ دیر بعد وہ بے ہوش شوہر کے سینے پر سر رکھ کر بلک بلک کر رونے لگی۔ دل ہلکا ہونے کے بعد سنہا کی بیوی سے ڈاکٹر نے کہا۔

"ہم سخت الجھن میں ہیں شریمتی جی۔ گولی گھٹنے میں کافی گہری اتر گئی ہے۔ انہیں بچانے کا صرف ایک علاج ہے۔" اتنا کہہ کر وہ رک گیا۔

"وہ کیا؟" پربھاوتی نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"ان کا پیر کاٹنا پڑے گا۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"اوہ۔" کہتے ہوئے پربھاوتی کی آواز بیٹھ گئی اور پیر کپکپانے لگے۔

"بہن اس وقت آپ ہمت ہار گئیں تو ہماری الجھن بڑھ جائے گی۔" ڈاکٹر نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"کبھی انسان کو بچانے کی خاطر کچھ چھوڑنا پڑتا ہے۔ اس وقت ہر لمحہ انہیں خطرے کی جانب دھکیل رہا ہے۔"

"ہم جن پیروں پر کھڑے ہیں آپ وہی پیر کاٹ دینا چاہتے ہیں ڈاکٹر۔" پربھاوتی کہنا چاہتی تھی مگر اس نے صرف اتنا کہا۔

"جس طرح مناسب سمجھیں کریں۔"

پھر ڈاکٹر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ شام کو جب سنہا کو ہوش آیا تو وہ یہی دہرا رہا تھا۔

"اس کا تعاقب کرو، دیکھنا نکل کر جانے نہ پائے۔"

پھر آنکھیں کھول کر اس کمرے میں نظریں گھمائیں سامنے ڈاکٹر اور نرس کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے برابر اس کی بیوی اور ارجن سنگھ بیٹھے ہوئے تھے۔ پربھاوتی نے سنہا کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"اب آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟"

وہ سمجھ گیا کہ وہ کہاں ہے؟ چہرے پر سے جنون ختم ہو گیا اور اس کی جگہ شدید تکلیف کے آثار نمایاں ہو گئے۔ آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی۔ حلق خشک ہونے لگا۔

"آخر میں ہار گیا اور وہ جیت گیا۔" پھر پانی کا پیالہ پی کر بولا۔

"پولیس کی کوشش ناکام ہوئی۔ برہمن کی دعا بر آئی۔ جیسی بھگوان کی مرضی۔"

کچھ دیر بعد اس کے پیر میں تکلیف شروع ہوئی۔ ران پر ہاتھ دبا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ ڈاکٹر نے فوراً انجکشن لگایا پھر اس نے کچھ دیر بعد آنکھیں کھول دیں اور ڈاکٹر سے پوچھا۔

"ڈاکٹر کتنے دن بستر پر رہنا پڑے گا؟ اگر جلدی کھڑا کر دو تو آخری بار جگا کا تعاقب کروں گا۔ صرف آخری بار۔" سنہا کی آواز میں جوش جھلک رہا تھا۔ ڈاکٹر کے لیے سنہا کی بات کا جواب دینا الجھن والی بات تھی۔ مریض کو پتا نہیں تھا کہ اس کا پیر کاٹ دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر نے سب سے کہا تھا کہ ایسی خوفناک خبر دینے میں جلدی نہ کرنا شاید مریض برداشت نہ کر سکے۔

اچانک خود بخود سنہا کی نظر پیر کی جانب گئی۔ اوڑھی ہوئی چادر کے نیچے کی جانب جگہ خالی نظر آنے لگی وہ

چونک گیا۔ درد بھری نظروں سے اس نے ڈاکٹر کی جانب دیکھا۔ ڈاکٹر نے نظریں جھکالیں۔ بیوی اس کی جانب آنسو بھری آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ سمجھ گیا اس نے بائیں پاؤں کی ران کو ہلانے کی کوشش کی مگر پھر سیدھا ہوگیا۔ مریض نے یہ صدمہ برداشت کرلیا ہے اس کا یقین کرلینے کے بعد ڈاکٹر نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''انسپکٹر' آئی ایم ویری سوری ہمارے پاس دوسرا کوئی علاج نہیں ہے اور آپ سے اجازت لینے کا وقت بھی ہمارے پاس نہیں تھا کہ آپ کے ہوش میں آنے کا انتظار کرسکتے۔ لہٰذا بہن سے اجازت لے کر ہمیں آپریشن کرنا پڑا۔''

''تھینک یو ڈاکٹر۔'' سنہا نے بھاری لہجے میں کہا۔ مگر اب اس کی بیوی بری طرح رونے لگی۔ سنہا اسے تسلی دینے لگا۔ ''اری پگلی اس طرح رونے سے کیا فائدہ اب تمہیں مجھے سہارا دینا ہے۔ ہم بیوی کو شوہر کا آدھا جسم کہتے ہیں۔ اگر میرا بایاں پیر کٹ گیا تو کیا ہوا؟''

ارجن سنگھ نے بھی ساتھ دیا۔

''ہاں بہن' فرض پورا کرنے کے سلسلے میں صاحب آخری لمحے تک لڑتے رہے ہمارے جیسوں کو تو ان کی بہادری سے سبق لینا چاہیے۔''

سنہا نے ارجن سنگھ سے کہا۔

''قدرت کے کھیل نرالے ہیں جگا کو ختم نہ کرسکا تو میں پولیس ڈیپارٹمنٹ کی سیڑھیاں اتر جاؤں گا یہ میرا عہد تھا۔ جب مدت پوری ہونے کا وقت آیا اس وقت پیر کٹ گیا۔ اب سیڑھیاں نہیں چڑھ سکوں گا۔'' سنہا نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ارجن سنگھ آگے کچھ سننے کا منتظر تھا سنہا نے اسے مخاطب کیا۔

''اب ساری ذمہ داری تم پر آئے گی میں اپنے استعفیٰ میں تمہاری سفارش کروں گا۔''

ارجن کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ سنہا کی بیوی کو اس کی خوشی ناگوار گزری۔

❀ ❀ ❀

پولیس انسپکٹر بننے کے بعد پہلی بار جب ارجن سنگھ اپنے سابق انسپکٹر سنہا سے ملنے گیا تو اس کی چال سے غرور جھلک رہا تھا۔ اس کے منہ سے بدبو آرہی تھی۔ سنہا نے اس سے مصافحہ کیا۔

''مبارک باد دیتا ہوں تمہیں ارجن سنگھ۔ جس ڈاکو کو میں نہ پکڑ سکا میری دعا ہے کہ اسے پکڑنے میں تم کامیاب ہو۔''

''صاحب۔'' ارجن سنگھ کے لیے صاحب کا لفظ ادا کرنا اچھا محسوس نہیں ہوا مگر مجبوراً وہ بولا۔

''اب مجھے اپنی قوت دکھانے کا موقع ملا ہے میں جگا کو دیکھ لوں گا۔''

''نشہ کرکے آئے ہو غالباً۔'' سنہا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

ارجن کو سنہا کی بات ناگوار گزری۔ ''جی ہاں صاحب آج خوشی کا دن ہے لہٰذا ذرا......!'' مگر پھر ارجن سنگھ نے محسوس کیا کہ اب صفائی دینے کی ضرورت کیا ہے وہ اکڑ کر بولا۔

''مگر میں آپ کا وعظ سننے نہیں آیا۔'' سنہا ہنس دیا جیسے کہہ رہا ہو۔ ''انسپکٹر بننے کے لیے میری سفارش اچھی لگی مگر اب مشورہ بھی اچھا نہیں لگے گا۔''

سنہا کی ہنسی سے ارجن سنگھ مشتعل ہوگیا اور اس کے دل کی بات زبان پر آگئی۔ ''تمہارے اور میرے کام کا طریقہ مختلف ہے۔ زندگی گزارنے اور کام کرنے کے سلسلے میں ہمارے راستے مختلف ہیں تم نے ڈاکو پکڑنے کا عہد بھی کیا اور اس کے بیوی کے سر پر ہاتھ رکھ کر سدا سہاگن رہنے کی دعا بھی دی۔ اسی

وقت میں سمجھ گیا تھا کہ یہ کام تمہارے ہاتھوں انجام نہیں پائے گا ڈاکو کے رشتے داروں سے بھلائی کیسی۔ اب تم دیکھنا میں ان کے ساتھ کس طرح پیش آتا ہوں۔'' ارجن سنگھ نے پر جوش انداز میں کہا اور چل دیا۔ سنہا نے صرف اتنا کہا۔

''تم جس طرح مناسب سمجھتے ہو کرو مگر صرف اتنا یاد رکھنا کہ پولیس انسپکٹر اور ڈاکوؤں کا سردار دونوں ہی انسان ہیں۔ مگر ارجن سنگھ سنی ان سنی کرتا ہوا باہر چلا گیا۔

❋ ❋ ❋

ہولی منانے کے لیے میکے گئی ہوئی چندن گھبرائی ہوئی سسرال لوٹی تھی۔ اس نے پولیس کے ساتھ جگا کے کئی معرکوں کی خبریں سنی تھیں۔ وہ بری طرح بے چین تھی۔ اخبارات میں بھی یہ خبریں شائع ہوئی تھیں کہ پولیس سے تصادم کے دوران چار ڈاکو مارے گئے اور کچھ سخت زخمی ہوئے۔ جگا فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ وہ بھی شدید زخمی ہے چندن اس کے لیے فکر مند تھی کہ اگر واقعی جگا زخمی ہے تو اس کی نگہداشت کے لیے اسے جگا کے پاس ہونا چاہیے تھا۔ ویرو نے بھی دوسرا خط نہیں لکھا تھا اور نہ ہی کافی دن سے جگا کا کوئی آدمی آیا تھا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے دریافت کیا۔

''ماں جی ان کی کوئی خبر ملی؟''

ماں جی بھی متفکر لہجے میں بولیں۔ ''بیٹی ابھی تک کوئی اطلاع نہیں کہ وہ کیسا ہے۔''

''آپ نے سنا سنہا کا پیر کاٹ دیا گیا؟'' چندن نے ماں جی سے کہا۔

''ہاں اب انہوں نے نوکری بھی چھوڑ دی ہے۔ ان کی جگہ ارجن سنگھ کو مقرر کیا گیا ہے۔ بے چارے سنہا کو اپاہج بنا کر جگا کو کیا ملا؟'' ماں جی نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ پھر اپنے آپ کو تسلی دینے والے لہجے میں بولیں۔

''یہ اچھا ہوا کہ اس کی جان بچ گئی۔ نہیں تو برہم ہتیا کا پاپ ہو جاتا۔''

''میں ایک بات سوچ رہی ہوں کہ.....!'' چندن کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

''کیا سوچ رہی ہو چندن؟'' ماں جی نے پوچھا۔

''ہمیں ان کی عیادت کے لیے جانا چاہیے۔'' چندن کور نے بمشکل کہا۔ شاید ماں جی کو اس کی یہ بات پسند نہ آئی یہ سوچ کر اس نے بات کا رخ موڑ دیا۔

''سنہا صاحب سے ہی ان کے بارے میں صحیح خبر مل سکتی ہے۔''

ماں جی اپنی بہو کی آنکھوں میں دیکھنے لگیں۔ سنہا اب پولیس انسپکٹر نہیں رہا تھا اس لیے ماں جی کے خیال میں اس کی عیادت کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ اس کے علاوہ یہ کہ جب وہ پولیس انسپکٹر بھی تھا تو اس نے اپنے دشمن جگا کی بیوی کو دعا دینے میں کسی قسم کے بخل سے کام نہیں لیا تھا۔ اس لیے بہو کی بات ماں جی کے دل کو لگی۔

''مگر تمہارے سسر شاید ہماری بات سے اختلاف کریں گے۔'' ماں جی نے شک کا اظہار کیا۔

''باپو کو میں منا لوں گی۔ اپنے بیٹے کے متعلق اطلاع کے لیے وہ بھی بے چین ہوں گے۔''

رات کھانا ختم کرنے کے بعد سوہن سنگھ کے سامنے پروگرام پیش کیا گیا۔ پہلے تو انہوں نے انکار کیا۔ ''جگت نے جسے زخمی کر کے اپاہج بنا دیا وہ شخص تم لوگوں کو اپنے گھر میں داخل ہونے دے گا؟ بے عزتی ہونے سے نہ جانا بہتر ہے۔'' سوہن سنگھ بولے۔

''مگر باپو وہ ایسے آدمی نہیں ہیں پولیس انسپکٹر تھے تب بھی انہوں نے ہم سے غلط بات نہیں کی۔'' چندن

کور نے عاجزانہ لہجے میں کہا۔
"تمہیں جانا ہے تو مجھے کوئی انکار نہیں۔" سوہن سنگھ نے نیم رضامندی کا اظہار کیا۔ "مگر تمہیں ناناکی ڈانٹ ضرور سننی پڑے گی۔"
"ان سے بھی سمجھ لیں گے۔" ماں جی نے مضبوط لہجے میں کہا۔

❁ ❁ ❁

"رتیا گاؤں سے دو عورتیں آپ سے ملنے آئی ہیں۔" سنہا کی بیوی نے کمرے میں داخل ہو کر سنہا سے کہا۔ "میں انہیں اندر بلالوں۔"
"رتیا سے کون آیا ہے؟" سنہا نے سوچتے ہوئے کہا۔ "انہیں بلاؤ۔"
چندکور اور اس کی ساس کو دیکھ کر سنہا متعجب ہو گیا۔
"ارے آپ لوگ آئی ہیں۔ تشریف رکھیں۔"
سنہا نے جلدی سے کہا۔ پھر اپنی بیوی سے بولا۔ "پربھا تم انہیں پہچانتی ہو یہ جگا کی ماں اور بیوی ہیں۔"
پربھاوتی نے انہیں ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا مگر اس کی آنکھوں میں عجیب سی الجھن تھی۔ جس ڈاکو نے اس کے شوہر کو جان سے مارنے کی کوشش کی اپاہج بنا کر اس کی زندگی تباہ کر دی۔ اس کے رشتے داروں کا یہاں کیا کام؟ چندن کور سے آنکھیں ملتے ہی پربھا نے سر جھکا لیا۔
"آپ لوگ بخیرت ہیں ماں جی؟" سنہا نے ماحول کی کشیدگی محسوس کرتے ہوئے کہا۔
ماں جی نے بھی سانس لے کر کہا۔ "ہاں صاحب ہم تو خیریت سے ہیں لیکن ہمیں اس کا افسوس ہے۔"
ماں جی کا اشارہ سنہا کے زخمی پیر کی طرف تھا۔
"ماں جی ایسا بھی ہوتا ہے۔" سنہا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "جنگ کے لیے میدان میں جانے والوں کو ایسے حالات سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ ہمارا تو کام ہی یہی ہے۔"
چندن کے چہرے پر اداسی تھی۔ "صاحب سنا ہے آپ کا پیر کاٹ دیا گیا ہے۔" چندن نے کچھ دیر بعد دھیمے لہجے میں کہا۔
"ہاں بہن اس کے علاوہ جان بچانے کا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔" پھر سنہا نے چادر ہٹا کر پیر دکھایا۔ "گولی بہت گہری اتر گئی تھی۔"
کٹا ہوا پیر دیکھ کر چندن کور کے منہ سے آہ نکل گئی۔ پربھاوتی نے دیکھا کہ اس نے کچھ چھپانے کے لیے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ پھر بھی چہرہ چغلی کھا رہا تھا کہ آنکھوں میں آنسو ہیں۔ ساس بہو کے متعلق پربھا کے دل میں جو برائی پیدا ہوئی تھی وہ ختم ہو گئی۔
"پربھا ان کے لیے کچھ لے آؤ۔" سنہا نے کہا پھر ماں سے پوچھا۔
"لسی پئیں گی آپ لوگ؟"
"نہیں صاحب آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں۔"
"اس میں تکلیف کی کیا بات ہے؟ آپ لوگ اتنی دور سے میری عیادت کرنے آئی ہیں۔"
پربھاوتی کمرے میں چلی گئی تو ماں جی نے کہا۔
"صاحب آپ ہماری نظر میں بہت نیک آدمی ہیں۔ اس لیے ہم آپ سے جھوٹ نہیں بولیں گے۔ ہم صرف عیادت کرنے نہیں آئے۔" جگت کی ماں نے سر جھکا کر شرمندہ لہجے میں کہا۔
"کیا آپ پر پھر کوئی نئی مصیبت آ گئی؟" سنہا متفکر لہجے میں بولا۔
"صاحب، ہم جگت کی خیریت بھی معلوم کرنے آئے ہیں۔ پولیس سے تصادم کے بعد اس کی اب تک کوئی خبر نہیں ملی۔ اخبارات میں پڑھا کہ وہ زخمی ہو گیا ہے اس لیے ہماری جان آدھی ہو رہی ہے۔" ماں جی کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"ارے آپ لوگ بے کار فکر کر رہی ہیں۔ اگر وہ زخمی ہوتا تو اتنی آسانی سے فرار نہ ہو جاتا۔ مجھے یاد ہے آخر تک میں نے اس پر اندھا دھند گولیاں برسائیں مگر بھگوان نے اسے بچالیا۔" سنہا نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ اس کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔ ماں جی اور چندن کور کو اطمینان ہو گیا۔ پھر بھی چندن نے محسوس کیا شاید سنہا انہیں خوش کرنے کے لیے ایسا کہہ رہا ہو اس لیے اس نے پھر کہا۔

"صاحب آپ پر ہمیں پورا اعتماد ہے تبھی تو ہم یہاں آئے ہیں۔ کیا آپ کو صحیح معلوم ہے کہ......!"

"ارے چندن کور، جگا میرے ہاتھ سے زخمی ہوتا تو مجھے انعام و اکرام سے نواز جاتا۔ میں کیوں جھوٹ بولوں گا؟" سنہا نے مسکرا کر کہا۔ اسی لمحے پر بھاوتی لسی کے گلاس لے کر آ گئی۔ سنہا نے کہا۔

"آپ لوگ لسی پئیں دل ٹھنڈا ہوگا۔" سنہا کی چھوٹی بیٹی رانی کو پتا چلا کہ جگا ڈاکو کی ماں اور بیوی اس کی عیادت کرنے آئی ہیں تو وہ دوڑتی ہوئی کمرے میں آ گئی۔ مگر ان دونوں کو دیکھ کر اپنی ماں کی پشت پر اس طرح چھپ گئی جیسے ڈر گئی ہو۔ سنہا ہنس دیا۔

"ارے رانی بیٹی۔" سنہا نے اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ "دیکھو اپنے گھر مہمان آئے ہیں انہیں نمستے کرو۔"

مگر رانی دونوں ساس بہو کو ناخوشگوار نظروں سے گھورنے لگی۔ چندن نے محبت سے اسے قریب بلایا۔ "بیٹی آپ کا نام کیا ہے؟" پھر بھی رانی خاموش رہی۔ چندن نے دوبارہ کہا۔ "کیا تم ہم سے خفا ہو؟"

رانی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ سب چونک گئے وہ فرش کی جانب دیکھ کر بولی۔ "میرے باپو کو جگا نے گولی کیوں ماری؟"

"ارے اتنی بات پر ان سے ناراض ہو گئی میری بیٹی؟" سنہا نے اس کے سر پر چپت لگاتے ہوئے کہا۔ "مجھے جگا کی گولی نہیں لگی بلکہ میں اس کے ساتھی کی گولی سے زخمی ہوا ہوں۔" سنہا کی بات سن کر جیسے رانی مطمئن ہو گئی۔ وہ چندن کی جانب دیکھنے لگی مگر کچھ سوچ کر اس نے اپنے باپو کے کان میں کچھ کہا۔ سنہا قہقہہ مار کر ہنس دیا پھر رانی کا رخسار تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

"یہ کہہ رہی ہے ان دونوں کو ہمارے کمرے میں بند کر دیں باپو اس طرح جگا بھی پکڑا جائے گا کیونکہ وہ ان دونوں کو چھڑانے ضرور آئے گا۔" لڑکی کی چالاکی پر سب ہنس پڑے۔ رانی شرما کر کمرے سے بھاگ گئی۔ کچھ دیر بعد چندن نے کہا۔

"ہم جانے کی اجازت چاہتے ہیں صاحب۔"

"ابھی بیٹھیے نا۔" سنہا کی بیوی نے پہلی بار کہا مگر وہ کھڑی ہو گئیں۔

"کچھ بھی کام میرے لائق ہو آپ بے کھٹکے آ جائیں۔ میں اب پولیس انسپکٹر نہیں رہا۔" سنہا نے مسکرا کر کہا۔

پر بھاوتی انہیں دروازے تک رخصت کرنے کے لیے آئی باہر ہزارہ سنگھ کھڑا تھا۔ ماں جی نے اس کا تعارف کرایا۔ "یہ میرا چھوٹا بھائی ہے ہم نے آپ کا مکان نہیں دیکھا تھا اس لیے اسے ساتھ لے آئے۔"

"آپ اندر کیوں نہیں آئے بھائی؟" پر بھاوتی نے ہزارہ سے پوچھا۔

ماں جی نے جھٹ کہا۔ "سنہا صاحب نے اسے جیل بھیجا تھا شاید اس لیے ناراض ہے۔ مرد جلدی دشمنی نہیں بھولتے بہن۔" پھر تینوں پر بھاوتی کو نمستے کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ پر بھاوتی انہیں جاتے دیکھتی رہی۔

جب وہ لوگ گھر پہنچے کھڑکی باہر سے بند تھی۔

پڑوسی ان کی جانب دیکھ رہے تھے۔ اس لیے وہ سمجھ گئیں کہ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔ اسی وقت جگت کے بڑے تایا بھی دوڑتے ہوئے آئے۔

"کیا ہوا؟" انہوں نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔

"ہم تو ابھی باہر سے آئے ہیں۔" ہزارہ نے جواب دیا۔

"مجھے کسی نے بتایا کہ پولیس سوہن سنگھ کو لے گئی۔" تایا نے بتایا۔

"مگر کس جرم میں؟" جگت کی ماں نے پوچھا۔

"چلو گھر میں چلیں۔"

اندر جا کر انہوں نے پورا مکان الٹ پلٹ کر دیکھا سارا سامان بکھرا ہوا تھا۔

"معلوم ہوتا ہے ان لوگوں نے مکان کی تلاشی بھی لی ہے۔" ماں جی کا دل بھر آیا۔ ہزارہ سنگھ ماں جی کے ہمراہ سنہا کے یہاں گیا تھا۔ وہ بھی اس وقت ساتھ تھا۔ وہ ایک دم بپھر گیا۔

"میں سمجھتا ہوں یہ نئے پولیس انسپکٹر ارجن سنگھ کا کام ہے میں فوجدار کے پاس جا رہا ہوں یہ سمجھتے کیا ہیں؟" ہزارہ نے دانت پیس کر کہا۔

"ہزارہ تایا کو ساتھ لے جا' جوش میں آنے کی ضرورت نہیں ہے پولیس سے دشمنی مول نہیں لینی چاہیے۔" ماں جی نے اسے سمجھایا۔

تایا اور ہزارہ کو دیکھ کر فوجدار سمجھ گیا اس نے صرف اتنا بتایا۔

"انسپکٹر صاحب خود آ کر سوہن سنگھ کر پکڑ کر لے گئے تھے۔ کہتے تھے اوپر سے حکم ہوا ہے لوگوں کو ڈاکو ستائیں اور ان کے رشتے دار چین سے رہیں یہ اچھی بات نہیں۔"

یہ سن کر ہزارہ گرم ہو گیا۔ "جگت کو پکڑ نہیں سکے تو غصہ ہم نہتے اور پر امن شہریوں پر اتار رہے ہیں؟"

ہزارہ نے بلند آواز میں کہا مگر تایا نے بات سنبھالی۔

"ہزارہ اس میں فوجدار صاحب کا کیا قصور ہے؟"

"قصور کسی کا بھی ہو جب جگت کو پتا چلے گا تو پنجاب میں طوفان آ جائے گا۔" اتنا کہہ کر ہزارہ غصے سے بل کھاتا ہوا باہر نکل گیا۔ ہزارہ کا جی چاہتا تھا کہ اگر اسے کہیں سے بندوق مل جائے تو وہ ارجن سنگھ کو گولی مار دے۔

❁ ❁ ❁

ہنومان نے ہوش میں آ کر سب سے پہلا سوال یہی کیا۔ "کیا سنہا ختم ہو گیا؟"

جگت اس کی صورت دیکھنے لگا۔ دشمنی اور انتقام انسان کو کس قدر پاگل بنا دیتا ہے۔ موت کے قریب ہو کر بھی انسان اپنے دشمن کی موت کی خواہش کرتا ہے۔ کیا انتقام کا زہر انسان کی رگ رگ میں اتر جاتا ہے جو قریب المرگ ہو کر بھی چین نہیں لینے دیتا۔

"ہنومان۔" جگت نے نرمی سے کہا۔ "ہم سب اس وقت تمہاری زندگی کی فکر کر رہے ہیں اور تمہیں سنہا یاد آ رہا ہے۔"

ہنومان نے جگت کی نظروں سے بچنے کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ بے ہوشی میں بھی وہ سنہا کی موت کی خبر معلوم کرنے کا خواہشمند تھا مگر ہوش میں آنے کے بعد اسے مایوسی ہوئی۔ جسم کی تکلیف کی پروا کیے بغیر اس نے کہا۔ "جگت تم خوامخواہ عین وقت پر درمیان میں آ گئے اور مجھے گھسیٹ کر دور لے گئے۔" پھر کچھ دیر رک کر بولا۔ "اگر دو ایک فائر اور جھونک دیتا تو پولیس کو اس کی لاش ملتی۔" ہنومان ہانپنے لگا۔ وہ خود کس قدر زخمی ہے اسے اب اس کا احساس ہو چکا تھا۔

جگت نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پیار بھرے لہجے میں کہا۔

"فی الحال بحث بند کرو۔ سنہا بھی تمہاری طرح

زخمی ہے۔ ہمارے ساتھی نے اپنی آنکھوں سے اسے تڑپتے دیکھا ہے۔ پولیس والے اسے زخمی حالت میں اٹھا لے گئے ہیں۔"

ہنومان نے سرد آہ بھری۔ "پھر تو وہ بچ جائے گا۔ مرنے سے پہلے میرے دل میں صرف یہی خواہش رہ جائے گی اگر مجھے اس کے مرنے کی خبر مل جاتی تو میں کتنے سکون سے مر سکتا تھا مگر ڈاکٹر اسے بچالیں گے جگت۔"

"ہنومان تو ایسی باتیں مت سوچا کر۔" جگت نے کچھ سختی سے کہا۔ "اس کا جو کچھ ہونا ہے اس کی ہمیں کوئی پروا نہیں تم بچ گئے میرے لیے یہی بہت بڑی بات ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ مکمل آرام کرنے سے تم جلدی ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

"ڈاکٹر؟" ہنومان نے متعجب لہجے میں پوچھا۔ "کون ڈاکٹر؟"

"کرسچن ڈاکٹر۔ اس نے ساری رات تمہارا علاج کیا تمہارے سینے سے گولی نکالی۔" یہ کہہ کر جگت نے پولیس سے تصادم کے بعد کی تمام روداد سنا دی۔ ہنومان دلچسپی سے سنتا رہا۔ اس طرح اس کے درد کا احساس کم ہو گیا۔ یہ دیکھ کر جگت کو اطمینان ہوا مگر ہنومان کو شک ہوا ایک ڈاکو کی جان بچانے کے لیے ڈاکٹر نے اتنی جانفشانی کیوں کی؟

"جگت شاید ڈاکٹر کو یہ پتا نہیں چلا ہوگا کہ ہم لوگ ڈاکو ہیں اور تمہارے سر پر پانچ ہزار کا انعام ہے۔"

"پہلے تو میں نے یہ بات چھپائی۔ مگر وہ بہت زیادہ چالاک تھا۔ آخر میں نے مان لیا کہ میں جگا ڈاکو ہوں۔"

ہنومان کے چہرے پر حیرت ابھر آئی۔ "پھر بھی اس نے میرا علاج کیا؟ شاید تم نے اسے کسی بڑی رقم کا وعدہ کیا ہوگا۔"

"نہیں ہنومان وہ لالچی نہیں ہے تجھے یاد ہے کہ جب ہم چھوٹے سے تھے تو فرشتوں کی باتیں سنتے تھے جو سب انسانوں کی بھلائی چاہتے ہیں اور ان انسانوں کے لیے دعائیں بھی کرتے ہیں مجھے ڈاکٹر ایسا ہی کوئی فرشتہ نظر آیا۔"

ہنومان نے سوچا جگت اس کا دل بہلانے کے لیے کہہ رہا ہے۔

"کیا تم سچ بول رہے ہو کہ اس نے مفت علاج کیا؟"

"میں نے اس سے کہا تھا کہ اگر اس نے تمہاری جان بچالی تو میں اسے منہ مانگا انعام دوں گا مگر اس نے مجھ سے کچھ طلب نہیں کیا بلکہ اس نے مجھے کچھ دیا ہے۔" یہ کہہ کر جگت نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکال کر پڑھا۔ "انتقام لینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اس جذبے کو اپنے دل سے نکال دینا چاہیے کوشش کرو یسوع مسیح تمہاری مدد کریں گے۔"

ہنومان چونک گیا۔ پھر اس کا مطلب سمجھنے کے لیے کچھ دیر تک اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ پھر وہ اچانک زور سے چیخا۔ "اس کاغذ کو پھاڑ دو جگت پھینک دو اسے۔ بھول جاؤ اس نصیحت کو۔" ہنومان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھیں باہر نکل آئی تھیں۔ پر جوش انداز میں اس نے مٹھیاں کس لیں مگر زخم میں ٹیس اٹھنے لگی اور جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ جگت بری طرح گھبرا گیا۔ اس نے ہنومان کی پیشانی پر ہاتھ رکھا پھر اس کا سینہ آہستہ آہستہ سہلانے لگا اسے کچھ یاد آ گیا اور ڈاکٹر کی دی ہوئی پڑیا میں سے دوا نکال کر اس نے پانی منگوایا اور کہا۔

"ہنومان تم جذبات میں مت آؤ ابھی تمہاری جان خطرے میں ہے دوا پی لو۔" جگت کا لہجہ بہت نرم تھا۔ ہنومان نے جگت کی جانب دیکھا۔ "نہیں پہلے تم

ڈاکٹر کی لکھی ہوئی نصیحت کو پھینک دو ورنہ میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا۔" ہنومان کی آواز میں جوش جھلک رہا تھا۔

"ہنومان تم سمجھتے کیوں نہیں؟ اس کاغذ کو پھاڑ دینے سے کچھ نہیں ہوگا۔ ابھی تک میں اسے کئی بار پڑھ چکا ہوں۔ اس پر لکھا ہوا ایک ایک لفظ میرے ذہن میں ہے۔ میں نے ڈاکٹر سے عہد کیا تھا کہ اس کا دیا ہوا کاغذ صبح شام ضرور پڑھوں گا۔"

ہنومان خاموش رہا اس نے دیکھا جگت کی آواز میں بھاری پن آ گیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ جس شخص نے اسے بچانے کی خاطر اتنی محنت کی تھی اس سے صرف ایک ذرا سی بات پر ضد کرنا اچھی بات نہیں تھی۔ اس نے سعادت مندانہ انداز میں دوا پی لی کچھ دیر بعد ہنومان نے اپنے ارد گرد دیکھا اس نے اپنے ساتھیوں کا جائزہ لیا پھر چونک کر بولا۔

"بچن کہاں ہے، تصادم کے دوران کہیں وہ......!"

ہنومان کی آواز سے خوف جھلک رہا تھا۔

"نہیں، نہیں...... ہنومان وہ بالکل سلامت ہے۔" جگت نے اسے اطمینان دلایا میں نے اسے ویرو کو لانے کے لیے بھیجا ہے۔"

ہنومان نے آنکھوں کو سوالیہ انداز میں حرکت دی، "مگر کیوں؟"

"تمہاری تیمارداری کرنے کے لیے کیا خبر تمہیں کب تک بستر پر رہنا پڑے؟ وہ تمہارا اچھی طرح خیال رکھے گی۔" جگت نے کہا۔

ہنومان سوچ رہا تھا جگت اس کے لیے کتنا فکر مند ہے۔ یہ خیال آتے ہی اس کی پلکیں بوجھل ہو گئیں۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ ٹھیک ہونے کے باوجود بھی شاید اس کی زندگی بے مصرف رہے۔ ساری زندگی اسے کسی کے سہارے کی ضرورت ہوگی۔ اس سے تو بہتر ہے کہ اس سے آگے وہ نہ سوچ سکا پھر اس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ "جگت میرے لیے یہ سب کچھ کرنے سے بہتر ہے کہ میرے سینے میں گولی مار دو تا کہ اس حالت سے چھٹکارا مل جائے۔"

اس کے الفاظ ختم ہوتے ہی جگت نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "بکواس بند کر...... تو...... تو...... ایسی کم ہمتی کی باتیں کرتا ہے۔" جگا کی آواز میں ایک عجیب سا دکھ تھا۔ ایک عجیب سی محبت تھی۔ وہ جھٹکے سے کھڑا ہو گیا اور ہنومان کو غصیلی نظروں سے دیکھتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

شام تک سب خاموش رہے سب کے دل پر کسی قسم کا بار تھا۔ جگا ڈاکو کی بغاوت کسی نئے موڑ پر پہنچتی نظر آنے لگی۔ سنہا سے مقابلے میں مرنے والے ساتھیوں کا غم انہیں ستا رہا تھا۔

مرے ہوئے ساتھیوں کے گھر والوں کی مدد کے لیے خاصی رقم پہنچا دی گئی تھی جگت نے خود یہ انتظام کیا تھا۔ اس کے باوجود جب بھی ایسے کٹھن حالات پیدا ہوتے ہیں اس وقت ہر کسی کے ذہن میں یہ سوال گونجتا۔ "کیا ڈاکو کی زندگی ایک ایسا راستا ہے جس سے لوٹنا ممکن نہیں؟"

رات کو بچن، ویرو کو لے کر آ گیا۔ اس نے ہنومان کے بارے میں سن کر ایک خوشخبری سنائی۔

"سنہا کا پیر کٹ گیا۔"

ہنومان تو اس کی موت کی اطلاع سننے کا خواہش مند تھا پھر بھی اس کے دل کو اطمینان ہوا۔ "اب وہ کسی بیوہ کی طرح گھر میں بیٹھا رہے گا۔" پھر دانت پیس کر کہا۔ "جگت کو چھ ماہ میں ختم کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔"

جگت ویرو کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اسے دیکھے ایک ماہ گزر چکا تھا۔ ویرو نے شرما کر سر جھکا لیا۔

جگت نے پوچھا "تم اتنی کمزور کیوں ہوگئی ہو ویرو، کیا وہاں کا ماحول تمہیں موافق نہیں آیا۔"

ویرو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی وہ کہنا چاہتی تھی کہ تمہاری جدائی نے مجھے اس حال کو پہنچادیا۔ مگر اس نے کہا۔ "یہ تو آپ نے مجھے کافی دن بعد دیکھا ہے اس لیے ایسا محسوس کر رہے ہیں۔ باقی اچلا بہن کے یہاں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ بہت اچھے لوگ ہیں۔ مجھے ان کا بچہ بہت پیارا لگتا ہے۔" آخری الفاظ میں ویرو کے ماں بننے کی خواہش جھلک رہی تھی۔

جگت کا جی چاہا کہ ویرو کو اپنی بانہوں کے حلقے میں سمیٹ لے۔ ویرو اس سے قریب ہو کر بھی اس کے لیے دور تھی۔ مگر اس نے اپنی خواہش پر قابو پالیا۔ چندن اور ویرو جیسے دو میٹھے جھرنوں کے درمیان ہونے کے باوجود خود وہ پیاسا تھا۔ جوانی کی یہ پیاس شاید اب بغاوت کرنا چاہتی تھی۔

"دیکھا جائے گا۔" اس نے دل میں کہا اب وہ نئے شکار کا پروگرام مرتب کرنے کے متعلق سوچ میں ڈوب گیا۔ جگت اس کے ساتھیوں نے ہولی کا تہوار نہیں منایا کیونکہ وہ ابھی اپنے مارے جانے والے ساتھیوں کا سوگ منا رہے تھے۔ دوسرے دن جگت نے ایک دل دہلا دینے والی خبر سنی۔

"تمہارے باپو کو پولیس لے گئی۔" مخبر نے یہ کہہ کر سر جھکا لیا۔

"کیا......؟" جگت نے چونک کر پوچھا۔ اس نے کبھی اس کے متعلق سوچا تک نہیں تھا۔ "مگر کب......؟"

"کل شام نیا پولیس انسپکٹر ارجن سنگھ خود گھر آ کر انہیں گرفتار کر کے لے گیا۔" مخبر نے کہا۔

جگت کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ بچن نے مخبر سے پوچھا۔ "مگر کون سے جرم کے تحت پولیس نے انہیں گرفتار کیا ہے اور انہیں کہاں لے گئے ہیں۔"

"مجھے یہ نہیں معلوم ہوا جناب، مگر تھانہ میں نہیں ہیں لوگ کہتے ہیں جگا کو بے بس کرنے کے لیے ارجن سنگھ نے یہ چال چلی ہے۔"

سب لوگ اس خبر سے سخت بے چین ہوگئے۔ ہنومان جواب تک خاموش تھا دانت پیس کر بولا۔ "اس ارجن سنگھ کو میں موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔" مگر پھر اسے اپنی حالت کا خیال آیا اور دکھ بھری آواز میں بولا۔ "اگر میں ٹھیک ہوتا تو پھر۔"

"ہنومان تم اس کی فکر مت کرو۔" جگت نے کہا۔ "اپنے باپو کی عزت سے کھیلنے والے کو میں چھٹی کا دودھ یاد کرا دوں گا۔" پھر مخبر کی جانب گھوم کر بولا۔ "تم میرے گھر جا کر کہو کسی قسم کی فکر نہ کریں اور باپو کو کہاں رکھا گیا ہے اس کے متعلق مکمل اطلاع جمع کر کے جلدی سے واپس آؤ۔" پھر وہ خود ہی بڑبڑایا۔ "اس ارجن سنگھ کو میں نے طوائف کے کوٹھے پر نچایا تھا شاید وہ پہلا سبق بھول گیا ہے بدمعاش۔"

جگت کا جنون دیکھ کر ہنومان خوش ہوگیا۔ ہنومان کو خوشی تھی کہ اب ڈاکٹر کی نصیحت جگا کے ذہن سے نکل جائے گی۔

❁ ❁ ❁

غصے میں بل کھاتے ہوئے نانا ارجن سنگھ سے ملنے پہنچ گئے۔

"آیئے...... آیئے نانا۔" ارجن سنگھ نے عیارانہ لہجے میں کہا اور کھڑے ہو کر نانا کا استقبال کیا۔ نانا کے چہرے سے غصے کے آثار چھٹ گئے۔ ارجن سنگھ کی سسرال دھرم پور تھی۔ اسی رشتے سے اس نے نانا کہا تھا۔ ارجن نانا کے گرم دماغ سے واقف تھا۔ اس لیے ان کے سامنے چالاکی سے کام لے رہا تھا۔

"مجھے یقین تھا کہ آپ آئیں گے نانا۔" اس نے نرم لہجے میں کہا۔

"تم میرے داماد کو بغیر جرم اٹھا کر لے گئے ظاہر ہے مجھے آنا ہی تھا۔" نانا سنبھل کر بولے وہ جانتے تھے کہ انہیں سارے علاقے کی پولیس کے چیف سے کام نکالنا تھا۔

"کیا کریں نانا ہمیں بھی اوپر کے حکم پر عمل کرنا پڑتا ہے۔" ارجن سنگھ نے مختصر کہا۔

"مگر جب تمہاری جگہ سنہا تھا تو اس نے کبھی جگت کے گھر والوں کے ساتھ یہ سلوک نہیں کیا۔ تم تو ہمارے آدمی ہو تم بھی سکھ ہو اور ہم بھی بیٹا باغی ہو جائے تو اس کی سزا باپ کو دو گے؟" نانا نے وکیل کی طرح پوچھا۔

"ڈاکو ہونا تو کوئی خاص بات نہیں مگر کسی کی بہو بیٹی کو اغوا کرنا کس طرح برداشت کیا جا سکتا ہے؟" ارجن سنگھ نے نانا کے چہرے پر بدلتے تاثرات دیکھے پھر مزید کہا۔

"موہن سنگھ آپ کا خاندانی دشمن ہے پھر بھی اس کی بیوی کو اغوا کرنا بہادری نہیں ہے۔ لوگوں کو ہم کیا جواب دیں گے۔" نانا کو اس بات کی توقع نہیں تھی کہ ارجن سنگھ یہ کہے گا۔ ویرو کے اغوا پر نانا بھی جگت سے خفا تھے پھر بھی دفاع کرنے کی غرض سے بولے۔ "وہ عورت تو خود جگت کے ساتھ گئی ہے۔"

"آپ سے کس نے کہا۔" ارجن سنگھ نے پوچھا۔

"لوگ کہتے ہیں۔ یہ کسی نے نہیں دیکھا کہ عورت نے کوئی احتجاج کیا تھا۔"

"نانا آپ بھی کہاں لوگوں کی باتوں میں آ گئے۔ وہ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ ویرو اور جگت کے درمیان ناجائز رشتہ تھا مگر ہم اس پر کس طرح یقین کر لیں۔" نانا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ مشتعل ہو جائیں ارجن سنگھ نے کہا۔

"آپ جیسا شخص یہ کس طرح برداشت کر سکتا ہے؟"

"اس کا مطلب ہے اس عورت کے بدلے میں آپ میرے داماد کو بند کر رہے ہیں۔" نانا نے سخت لہجے میں کہا۔

"جیل میں کیسے بند کر سکتے ہیں نانا؟ ہم نے انہیں بڑی حفاظت سے رکھا ہے جب کوئی اپنے آدمی کو اٹھا لے جائے اس صورت میں کیا گزرتی ہے جگا کے لیے یہ سبق ضروری تھا۔" ارجن سنگھ نے آخری جملہ سخت لہجے میں کہا۔

"مگر تم کب تک اسے نظر بند رکھو گے؟"

"یہ ہم کس طرح کہہ سکتے ہیں آپ اپنے نواسے کو کہلوا دیں کہ وہ ویرو کو واپس بھیج دے۔" ارجن سنگھ نے چال چلی۔

"تو تم سودے بازی کرنا چاہتے ہو؟" نانا کا ذہن زناٹے میں آ گیا۔

"آپ اس طرح جلد بازی نہ کریں نانا ذرا ٹھنڈے دماغ سے سوچیں اگر ویرو اپنے گھر نہیں آنا چاہتی تو یہ ممکن ہے کہ وہ پولیس تھانہ میں آ کر کہہ دے کہ میں اپنی مرضی سے گھر چھوڑ کر آئی ہوں۔" ارجن سنگھ اپنی بات کا ردعمل نانا کے چہرے پر دیکھنے لگا۔ نانا خاموش رہے۔ ارجن نے پھر کہا۔ "اوپر سے کئی حکم ہوئے ہیں جلد یا بدیر سوہن سنگھ کی زمین ضبط کر لی جائے گی مگر میں نے آپ کی وجہ سے اس حکم پر فوراً عمل نہیں کیا۔"

نانا کھڑے ہو گئے۔ اب وہ شدید الجھن میں تھے ابھی کچھ ایسی ویسی بات کہہ کر وہ پولیس چیف سے بگاڑنا نہیں چاہتے تھے۔ شاید بات خراب ہو جائے انہوں نے جاتے ہوئے کہا۔

"میں سوچ کر کوئی راہ نکالوں گا۔"

اس جواب سے ارجن سنگھ کا ذہن بھی الجھ گیا۔ وہ نانا کو جاتے دیکھتا رہا۔

نانا' جگت کے گھر آ گئے۔ ماں جی' چندن اور ہزارہ سخت غصے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہزارہ نے کمر سے تلوار کھینچ لی دل میں کوئی فیصلہ کر لیا تھا۔ ماں جی اور چندن اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں نانا کو دیکھ کر ماں جی کو اطمینان ہوا۔

"شکر ہے باپو آ گئے۔" پھر نانا کو دیکھ کر بولیں۔ "باپو اسے سمجھایئے کل رات سے ضد کر رہا ہے کہ میں ارجن سنگھ کو قتل کر کے جگت کے ساتھ ڈاکو بن جاؤں گا۔"

نانا کے ذہن میں کھولتا ہوا غصہ اب باہر آ گیا۔

"لڑکے تلوار کو کھونٹی پر لٹکا دے۔ میں ارجن سنگھ سے مل کر آ رہا ہوں۔" ہزارہ نے ان کی بات پر عمل نہیں کیا مگر اس کا جوش ٹھنڈا ہونے لگا۔ ماں جی اور چندن نانا کی بات سننے کے لیے بے تاب تھیں۔

"کیا ہوا؟"

"وہ کہتا ہے جگت دشمن کی بیوی کو واپس کر دے تو وہ جگت کے باپو کو گھر بھیج دے گا۔"

"یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔" چندن کی زبان سے نکل گیا۔ نانا کو یہ بات کھٹک گئی مگر انہوں نے اظہار نہیں کیا۔

"ایسا حکم اسے اوپر سے دیا گیا ہے۔ دشمن کی عورت کو ساتھ رکھنے سے بہتر ہے کہ اسے قتل کر دے۔ جان چھوٹ جائے گی۔" چندن کا دل بیٹھ گیا۔ ماں جی خاموش رہیں۔ ہزارہ سنگھ تینوں کے چہروں کے تاثرات پڑھ رہا تھا۔ "ارجن سنگھ کہتا ہے کہ عورت خود آ کر پولیس تھانہ میں درج کرا دے کہ میں راضی خوشی گھر چھوڑ کر گئی ہے پھر اس بات کا فیصلہ ہو جائے گا۔" نانا نے ان لوگوں سے کہا۔

چندن کو اس بات میں پولیس کی چال نظر آ رہی تھی۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ ویرو صرف راضی خوشی ہی نہیں بلکہ شوہر کے ظلم سے تنگ آ کر بھاگ گئی ہے۔ اس کے پاس اس بات کا ثبوت ہے مگر اس نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ یہ بات نانا سے کہنا بالکل مناسب نہیں تھا۔ نانا نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"میں اسے پیغام بھیجتا ہوں کہ اگر وہ اپنے باپ کو چاہتا ہے تو ویرو کو واپس بھیج دے۔"

چندن کچھ کہنا چاہتی تھی مگر نانا نے اس سے کہا۔ "بہو تم اس بار مجھے نہیں روکو گی۔ اس نے جو کچھ کیا ہے وہ کس طرح ٹھیک نہیں۔" چندن چپ رہی اس نے محسوس کیا گھر میں جھگڑا شروع ہو جائے گا ہزارہ نے تلوار کھونٹی پر ٹانگ دی تھی۔

❁ ❁ ❁

مخبر نے آ کر جگت کو مطلع کیا کہ پولیس کیا چاہتی ہے جگت کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"کیا ویرو کو میں واپس بھیج دوں؟ اس درندے کے ہاتھوں میں' نہیں ایسا کسی طرح نہیں ہو گا۔" جگت کی مٹھیاں کس گئیں۔

"مگر نانا نے یہ حکم بھیجا ہے۔" مخبر نے کہا۔

جگت کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ "نانا۔" جگت نے سخت غصے سے کہا۔ "ویرو انہیں ہمیشہ سے کھٹکتی ہے مگر اس سلسلے میں میں ان کی بھی نہیں سنوں گا۔" جگت نے صاف بات کہہ دی۔

"میری وجہ سے مصیبت آ گئی ہے جگت۔" ویرو کچھ کہنا چاہتی تھی مگر جگت نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

"ویرو' تجھے کچھ نہیں کہنا میں ان سب کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ ویرو کو ساتھ رکھ کر میں باپو جی کو پولیس کے ہاتھوں سے چھڑا سکتا ہوں۔ اس قدر قوت میرے بازو

میں ہے۔" پھر بولا۔ "باپو کو کہاں رکھا گیا ہے؟"

"رتیا گاؤں کے برابر والے اسکول میں چھٹیوں کے دن ہیں اس لیے اسکول بند ہیں۔ چار چھ پولیس والوں کا پہرہ ہے۔"

"بس تم تیاری کرو۔ ارجن سنگھ کا میں دماغ درست کردوں گا۔" جگت نے دانت پیس کر کہا۔

ہنومان یہ سب چپ چاپ دیکھ رہا تھا۔ انتقام کو بھول جانے کے متعلق دیا ہوا ڈاکٹر کے سبق کا اثر جگت کے ذہن سے نکل گیا ہنومان کو یہ دیکھ کر بے حد مسرت ہونے لگی۔

❋ ❋ ❋
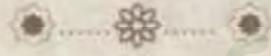
نانا، ماں جی اور چندن کو متعجب چھوڑ کر دھرم پور چلے گئے۔ ساس بہو کے دل گھبرا رہے تھے۔ دیر دگی واپسی کی بات پر جگت کس قدر جوش میں آئے گا یا پھر گاؤں کا جھگڑا گھر میں آگ لگائے گا۔ پھر پولیس کی نظر بندی میں جگت کے باپو کے کیا حال ہوں گے؟ ماں جی کو یہی فکر تھی انہیں محسوس ہو رہا تھا شاید ان کی زندگی ختم ہو جائے مگر اپنے شوہر کا چہرہ وہ نہیں دیکھ سکیں گی۔

جگت کے تایا جب گھر آئے، ماں جی چپکے چپکے رو رہی تھی۔ چندن باورچی خانہ میں کام کر رہی تھی۔ تایا کے قدموں کی آہٹ سن کر ماں جی نے جلدی سے آنسو خشک کر لیے مگر وہ اسے روتے دیکھ چکے تھے۔

"یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں جگت جیسے بہادر کی ماں آنسو بہا رہی ہے۔" پانی کا لوٹا رکھتے ہوئے ماں جی نے کہا۔

"یہ جگت کی ماں نہیں رو رہی بلکہ تمہارے بھائی کی بیوی رو رہی ہے۔"

پانی پیتے ہوئے تایا رک گئے۔ گھونٹ حلق کے نیچے اتارتے ہوئے بولے۔ "میں تمہارا مطلب سمجھ گیا ہوں۔ چھوٹا بھائی پولیس کی حراست میں ہے اور ہم عورتوں کی طرح بیٹھے ہوئے ہیں یہی کہنا چاہتی ہو؟"

"نہیں جیٹھ جی آپ ایسا نہ سمجھیں میں تو کہہ رہی تھی ان کے خیال سے دل بیٹھنے لگتا ہے۔"

"تم مجھے مطمئن کرنے کے لیے کچھ کہو مگر میں جاٹ کا بیٹا ہوں۔ جگت کا تایا اور سوہن سنگھ کا بھائی، سوہن اگر دو دن میں گھر نہیں آیا تو میں زندگی بھر منہ نہیں دکھاؤں گا۔ سمجھیں۔" تایا نے ہتھیلی میں پانی لے کر عہد کیا۔ ماں جی لرز گئیں۔ چندن لسی کا پیالہ رکھ کر دروازے کی آڑ میں کھڑی ہو گئی۔ تایا کہہ رہے تھے۔ "ابھی میں نے اپنے گھر اپنی ذات کے پانچ سات بڑے آدمی بلائے ہیں بیٹے کے گناہ کی سزا باپ کو ملے ایسا ظلم برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ کل وہ کسی اور کو پریشان کر سکتے ہیں۔ لہٰذا ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اگر ارجن سنگھ نہیں مانا تو اس صورت میں اوپر والے آفیسر سے بات کی جائے گی جس کے لیے شیخوپورہ کے وکیل شوبھا سنگھ کو ساتھ لے جائیں گے۔ ضرورت پڑنے پر عدالتی کارروائی کی جائے گی کیا ارجن سنگھ کے باپ کا راج ہے وہ جسے چاہے حراست میں لے لے؟"

"مگر جیٹھ جی پولیس چیف کا سامنا کر کے ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔" ماں جی نے فکر مندانہ لہجے میں کہا۔

"تم صرف دیکھتی رہو سب قانونی طور پر ہوگا۔ اس طرح کسی سے دبنا ضروری نہیں۔" تایا نے کہا پھر جاتے ہوئے وہ گھوم کر بولے۔ "میں رات کو تمہاری جٹھانی کو سونے کے لیے بھیجوں گا تم لوگ کسی بات کی فکر نہ کرو۔" جیٹھ کے ان الفاظ سے ساس بہو کو اطمینان ہو گیا۔ نانا سے تایا کا راستا انہیں بہتر دکھائی

دیا۔

دوسری شام کو پانچ بڑے آدمی شوبھا سنگھ وکیل کو ساتھ لے کر ارجن سنگھ کے پاس پہنچ گئے۔ دو دن ہو گئے مگر جگا کے باپ کو کوئی چھڑانے نہیں آیا اس کی وجہ سے وہ سخت الجھن میں تھا۔ سات آٹھ آدمیوں کو اکٹھے کر آتے دیکھتے ہی ارجن سنگھ نے انہیں ٹھنڈا کرنے یا ڈانٹ کر روانہ کرنے کا دل میں فیصلہ کر لیا تھا۔ کچھ دیر بحث ہوئی دلیلیں دی جانے لگیں مگر وکیل نے قانون کی رو سے سوہن سنگھ کے حراست میں لیے جانے کو چیلنج کر دیا۔

"اگر تم ہماری بات نہیں سنو گے تو ہم اوپر فریاد کریں گے۔" یہ بھی کہہ دیا تھا۔

ویرو کے خلاف بھڑکا کر اس نے نانا کو واپس کیا تھا مگر ان لوگوں نے ذرا ڈھیل نہ دی۔

"ویرو کو جگت نے اغوا کر لیا تو پولیس اس سے نمٹے سوہن سنگھ کو درمیان میں لانے کی کیا ضرورت ہے۔"

طاقت اور دھمکی کے بل پر چلنے والے ارجن سنگھ نے اپنی ذمہ داری پر سوہن سنگھ کو حراست میں لیا تھا اگر بات اوپر گئی تو اس صورت میں جواب دینا مشکل ہو جائے۔ جگت کے باپ کو حراست میں لینے کے بعد لوگ یہی کہتے کہ سنہا اس سے اچھا تھا ارجن سنگھ سکھ ہے پھر بھی اپنی ذات کے لوگوں کو پریشان کرتا ہے۔ اچھا کہلانے کی ارجن کی آرزو پر لوگوں نے پانی پھیر دیا پھر بھی جلدی نہ جھکنے کی خاطر اس نے سب سے کہا۔

"آپ لوگ جگت کو کیوں نہیں سمجھاتے کہ وہ ویرو کو چھوڑ دے۔"

"مگر ویرو اپنی مرضی سے جگت کے ساتھ نہیں گئی اس کا ثبوت کیا ہے؟" وکیل نے دلیل دی۔

"میں یہی تو کہہ رہا ہوں۔" ارجن سنگھ نے جلدی سے کہا۔ "ایک بار سامنے آ کر ویرو کہہ دے کہ اپنی مرضی سے گھر چھوڑ گئی ہے اس صورت میں جھگڑا ختم ہو جائے گا۔"

"اس کا ثبوت ہمارے پاس ہے۔" تایا نے جوش میں آ کر کہا۔ "اس کی جانب سے لکھے گئے خط میں اس نے بتایا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے گھر چھوڑ گئی ہے اسے کسی نے اغوا نہیں کیا۔"

"کس پتے پر اس نے خط لکھا ہے؟" ارجن نے گھبرا کر پوچھا۔ "کہاں ہے وہ خط؟"

تایا شاید کہہ دیں گے کہ ویرو نے چندن کو خط لکھا ہے اس ڈر سے وکیل نے جلدی سے کہا۔

"ابھی ہمارے پاس نہیں ضرورت پڑنے پر اسے عدالت میں پیش کیا جائے گا۔"

ارجن ہونٹ کاٹنے لگا بازی ہاتھ سے نکلتی ہوئی نظر آنے لگی۔ اسے معلوم تھا کہ ویرو نے اپنے شوہر موہن سنگھ کو بھی اس طرح کا خط لکھا ہے۔

کیا وہ خط ان لوگوں کے ہتھے لگ گیا ہوگا؟ ارجن سنگھ کا سر گھومنے لگا۔ "میں ابھی آ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر ارجن اندر والے کمرے میں چلا گیا۔ تایا وکیل کے سامنے مسکرا دیے۔

"اب ڈھیلا ہوا۔" وہ بڑبڑایا۔

ارجن سنگھ نے الماری کھول کر بوتل نکالی اور دو چار گھونٹ لے کر کوئی راستا نکالنے کی الجھن میں پڑ گیا۔ کچھ دیر بعد اس کا ایک اردلی کمرے میں آ گیا اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔

"سر ایک شخص پیغام لایا ہے۔"

ارجن سنگھ نے جلدی سے لفافہ کھولا اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ پھر پڑھنے لگا۔ اس کے چہرے پر مسرت جھلکنے لگی۔

"یہ کون دے گیا ہے؟ اسے مت جانے دو۔" یہ

کہہ کر اس نے اردلی دوڑایا' لفافہ جیب میں رکھ کر ہنستا ہوا باہر آ گیا۔
''میں آپ کی مدد کر سکوں گا مگر مجھے ایک دن کی مہلت اور چاہیے مجھے اپنے چیف کو سمجھانا پڑے گا۔ کل سورج غروب ہوتے ہی سوہن سنگھ اپنے گھر پہنچ جائیں گے۔'' ارجن سنگھ نے نرم لہجے میں کہا۔
''بس صاحب آپ کی مہربانی۔'' تایا نے خوش ہو کر کہا۔ ''ہمیں معلوم تھا کہ آپ ہماری بات سنیں گے۔'' سب جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔
ارجن سنگھ نے کہا۔ ''مگر ایک شرط ہے یہ بات کل شام تک کسی کو بتائی نہیں جائے گی یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس کا بڑے آفیسر کو پتا چل گیا تو معاملہ خراب ہو جائے گا۔''
''ہم اس کا یقین دلاتے ہیں جناب۔'' تایا نے ارجن سنگھ سے کہا۔ ''ہم سات کے علاوہ آٹھویں شخص کو پتا نہیں چلے گا۔'' وہ گئے تو دروازہ بند کر کے ارجن سنگھ نے جیب سے لفافہ نکال کر تیسری بار پڑھا لکھا تھا۔
''پولیس چیف ارجن سنگھ۔
جگا ڈاکو تحریر کرتا ہے کہ ویرو اگر تمہارے پاس آ کر یقین دلا دے کہ وہ اپنی مرضی سے گھر چھوڑ کر گئی ہے تو اس صورت میں تم نے میرے باپ کو چھوڑنے کا وعدہ کیا ہے تم اس شرط پر عمل کرو گے۔ اس اعتماد کے ساتھ ہم کل شام پانچ بجے گاؤں کے باہر بڑے پیپل کے درخت کے قریب ویرو کو بھیج دیں گے۔ اس کے ساتھ ہماری صرف ایک شرط ہے۔ ویرو تمہارے علاوہ کسی کو چہرہ نہیں دکھائے گی۔ وہ برقعہ پہن کر ریڑھے میں آئے گی تمہارا کوئی آدمی اسے ہاتھ نہ لگائے۔ یہ تمہیں دیکھنا ہے تمہیں اطمینان دلانے کے بعد وہ جہاں جاہے جا سکتی ہے۔ تم اسے روکو گے نہیں۔ ویرو کے پاس ایک پستول بھی ہوگا۔ اگر تم اس شرط پر عمل نہیں کرو گے تو وہ کسی کو بھی بھون دے گی۔ اس کی ذمہ داری تم پر ہوگی۔ کل شام پانچ بجے۔''
ارجن سنگھ خط پڑھ کر زور سے ہنس دیا پھر یاد آنے پر دروازہ کھول کر اپنے اردلی کو بلایا وہ دور سے ہانپتا ہوا آ رہا تھا۔
''جناب پیغام دینے والا شخص غائب ہو گیا۔'' اس نے اٹک کر کہا۔
ارجن سنگھ کو اس کی پروا نہیں تھی۔ ''اب میں سب سے نمٹ لوں گا۔'' وہ خط پڑھ کر ہی اس نے تایا سے چوبیس گھنٹے کا وعدہ کیا تھا۔ ویرو کے قابو میں آنے کے بعد سوہن سنگھ کو حراست میں رکھنا بے کار تھا۔ اسی وجہ سے تو اس نے یہ بات ظاہر نہ کرنے کا وعدہ لیا تھا۔ کچھ دیر کے لیے اس نے سوچا' یہ خط اسے بے وقوف بنانے کے لیے تو نہیں لکھا گیا ہے؟
مگر اس میں لکھی گئی شرائط کو دیکھ کر اسے اطمینان ہوا جگا یہ سمجھتا ہوگا کہ ویرو اسے اطمینان دلانے کے بعد واپس لوٹے گی مگر شاید وہ ارجن سنگھ سے اچھی طرح واقف نہیں۔
گھر میں داخل ہو کر اس نے ایک بوتل حلق سے نیچے اتاری۔ ویرو کو اس نے دو ایک بار دیکھا تھا۔ اس کا حسین سراپا اس کی نظروں میں گھومنے لگا۔ وہ نشے میں بڑبڑایا۔
''بے وقوف موہن سنگھ ایسی خوب صورت عورت کے لائق نہیں ہے۔'' پھر مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا بولا۔ ''کل کی رات رنگین ہو جائے گی۔'' پھر لفافے کو بوسہ دے کر جیب میں رکھ لیا۔
دوپہر تین بجے سے پیپل کے درخت کے نیچے سادہ لباس میں پولیس موجود تھی۔ پیپل کی گھنی چھاؤں میں مسافروں کے آرام کا قدرت نے انتظام کر دیا

تھا۔ کافی پرانا درخت تھا ارجن سنگھ دوپہر سے بے تاب تھا۔ چار بجے ہی اس نے ٹہلنا شروع کر دیا۔ گھنے درخت کی شاخوں پر کچھ رائفل بردار پولیس والے چھپے ہوئے تھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی بڑے تصادم کی تیاری کی گئی ہو۔ ویرو برقع میں پستول لے کر آنے والی تھی اس وجہ سے وہ چوکنے تھے۔ ساڑھے چار بجے ارجن سنگھ نے سب کو آڑ میں چھپ جانے کا حکم دیا۔ ہر پانچ منٹ بعد وہ جیب سے پاکٹ واچ نکال کر وقت دیکھ لیتا تھا۔ مگر گھڑی کی سوئی کسی مریل بیل کی طرح گھسٹتی نظر آ رہی تھی۔

پانچ بجے اور پیشانی پر ہتھیلی کی آڑ کر کے اس نے دور دور تک نظر دوڑائی مگر کوئی ریڑھا دکھائی نہیں دیا۔ اس نے سوچا کہ جیپ لے کر وہ سامنے جائے مگر یہ بھی ممکن تھا کہ جگا نے اسے بے وقوف بنانے کی کوشش کی ہو تقریباً چھ بجتے ہی دور سے ایک ریڑھا آتا ہوا دکھائی دیا۔

"ہوشیار جب تک ریڑھا آ کر رک نہ جائے چھپے رہو۔" ارجن سنگھ نے کہا پھر جب ریڑھا آدھے فرلانگ دور تھا وہ پیپل کے تنے کے عقب میں چھپ گیا۔ یہ امکان بھی تھا کہ جگا اس طرح اس کی جان لینا چاہتا ہو۔

پیپل کے درخت کے نیچے آ کر ریڑھے والے نے لگام کھینچ لی اور ریڑھا رک گیا۔

"جناب آپ کا مال آ گیا۔"

مال کا لفظ سن کر ارجن سنگھ کو خوشی ہوئی۔ ہاتھ میں پستول تھام کر اس نے آواز دی۔

"مال کو اس طرف بھیج دو۔" ریڑھے والے نے منہ اندر کر کے کچھ کہا اور فوراً ہی برقعے والی عورت ریڑھے سے اتر آئی۔ برقعہ اتنا لمبا تھا کہ اس کی کناری زمین پر گھسٹ رہی تھی۔ پھر بھی چلتے ہوئے اس کے پیر نظر آئے ارجن سنگھ کو اس کے پیروں سے پھول جھڑتے نظر آ رہے تھے۔

"نزدیک آ جاؤ۔" اس نے سخت مگر پیار بھرے لہجے میں کہا۔ وہ چھ قدم دور ہو گی جب اس نے جیب سے رومال نکالا اور چار رائفل برداروں نے برقعے والی کو گھیرا ڈال دیا۔ پانچ آدمیوں نے ریڑھے والے کو گھیر لیا۔ ریڑھے والے کے ہوش غائب ہوئے اس سے تو یہ کہا گیا تھا یہ خاتون پولیس چیف کی خاص مہمان ہیں۔ مگر اس کے بجائے یہاں بندوق کی نال سے اس کا استقبال ہوا تھا ارجن سنگھ نے پستول کی لبلبی پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"تمہارے پاس پستول ہے تو اسے ہاتھ نہیں لگاؤ گی۔ جس طرح کہوں اس طرح میری بات پر عمل کرو، سمجھیں۔" ارجن سنگھ نے گرجدار آواز میں کہا۔ برقعہ لرز رہا تھا۔ ارجن سنگھ خوش ہو گیا۔

"چلو، جیپ میں بیٹھ جاؤ۔" ارجن سنگھ نے کہا۔ "میرے کہنے پر عمل کرو گی تو میں تمہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچاؤں گا۔" برقعے والی کو جیپ میں سوار ہونے میں دقت ہوئی لہٰذا ارجن سنگھ نے اسے سہارا دیا اس نے بازو دبا کر دیکھا مگر دوسری طرف سے کوئی احتجاج نہیں ہوا ارجن سنگھ خوش ہو گیا۔

وہ شیخوپورہ تھانہ پہنچ گئے۔ ارجن سنگھ کے علاوہ کوئی نہیں سمجھ رہا تھا کہ برقعے میں کون ہے؟ پھر بھی اتنا انتظام کیا گیا تھا یہ دیکھ کر پولیس والوں کو یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ برقعے میں جگا ڈاکو نے اپنے آپ کو سپرد کیا ہے کیونکہ ارجن سنگھ کے چہرے پر مسرت تھی۔

جیپ سے اتر کر ارجن سنگھ برقعے والی شخصیت کو لے کر اندر والے آفس میں چلا گیا۔ پھر دو با اعتماد پولیس والوں کو اپنے ساتھ رکھ کر اس نے اندر کے دروازے بند کر دیے۔ اس کی خواہش تو ویرو کو اکیلے

میں دیکھنے کی تھی مگر اس نے خطرے کا احساس کر کے یہ قدم اٹھایا تھا۔ پسینہ صاف کر کے اس نے کہا۔

''اب برقع اتار دو۔''

برقعے والی نے سر ہلا دیا۔ ارجن سنگھ کو تعجب ہوا پھر سمجھ گیا۔

''شاید ان دونوں پولیس کانسٹیبلوں کی وجہ سے تمہیں اعتراض ہے؟'' پھر اس نے دونوں پولیس والوں کو عقب میں کھڑا کر دیا۔

''ویرو اب سوائے میرے کوئی تمہارا چہرہ نہیں دیکھ سکے گا۔'' پھر بھی برقعے والی شخصیت نے سر ہلایا۔ شانے اچھالے تو ارجن سنگھ کو غصہ آ گیا۔

''اب نخرے چھوڑ اور برقع اتار دے۔'' ارجن سنگھ نے کہا پھر آگے بڑھ کر برقعہ چھین لیا مگر چہرہ دیکھ کر ارجن سنگھ کے پیروں تلے زمین کھسکنے لگی اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ پیشانی پر گہری لکیریں نظر آنے لگیں۔ کیونکہ برقع میں ویرو کے بجائے اسے ایک شخص کا چہرہ نظر آیا تھا وہ شخص بری طرح کپکپا رہا تھا اس کے منہ پر کپڑا کس کا باندھ دیا گیا تھا پسینے سے اس کا جسم گیلا ہو رہا تھا رونی صورت بنا کر وہ ارجن کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ لباس سے وہ پولیس ڈیپارٹمنٹ کا آدمی نظر آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پیچھے سے باندھ دیے گئے تھے۔

''اس کا منہ کھول دو۔'' ارجن سنگھ نے گرج دار آواز میں کہا۔

پولیس والوں نے فوراً تعمیل کی۔ ارجن سنگھ نے زور سے ایک چانٹا اس کے رخسار پر جڑ دیا اسے چکر آ گئے۔ وہ نیچے بیٹھ گیا۔ پولیس چیف نے زور سے زمین پر پیر پٹخا، ہتھیلیاں مسلیں جیسے وہ اپنی ناکامی پر تڑپ رہا ہو۔ دراصل وہ چانٹا خود اس کے منہ پر پڑا تھا۔ شکست کا بھرپور چانٹا۔ پھر جنون میں آ کر اس کا کالر پکڑتا ہوا بولا۔ ''بتا یہ سب کیسے ہو گیا؟ وہ ریڑھے والا کون تھا؟''

بولتے ہوئے اس شخص کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

''تین چار ڈاکو مجھے دوپہر راستے سے اٹھا لے گئے شام کو ہاتھ پیر باندھ کر منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ پھر لمبا برقع پہنا کر ریڑھے میں بٹھاتے ہوئے مجھے دھمکی دی کہ شور کرنے کی ذرا سی کوشش پر ریڑھے والا تمہیں پھونک دے گا۔'' اس نے بتایا۔ ارجن سنگھ کچھ لمحے خاموش رہا پھر دانت پیس کر بولا۔

''جگا ڈاکو نے مجھ سے فراڈ کیا مجھے دغا دیا۔''

مگر وہ اس چال کی وجہ کے متعلق سوچنے لگا۔ اسے سوہن سنگھ یاد آ گیا۔

''کیا جگا نے اپنے باپ کو چھڑانے کے لیے یہ چکر چلایا ہے؟'' ارجن سنگھ کے ذہن میں یہ سوال گونج رہا تھا۔

مگر جیسے ہی وہ جیپ اسٹارٹ کر کے تھانہ سے باہر نکل رہا تھا ایک حوالدار دوڑتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔

''صاحب جلدی کیجیے۔'' وہ ہانپتا ہوا بولا۔

''کیوں کیا بات ہے؟''

''صاحب ویرو نے اپنے آپ کو پولیس کے سپرد کر دیا ہے آپ کو بلایا ہے۔''

''اچھا؟'' ارجن سنگھ کے ذہن میں یہ بات نہیں آ رہی تھی۔ ''کہاں ہے؟''

''اسی جگہ جہاں سوہن سنگھ زیر حراست ہیں اس نے کہا ہے اپنے چیف کو بلاؤ میں جگا سے جھگڑا کر کے پولیس کی حفاظت میں آئی ہوں۔'' حوالدار جلدی جلدی بتا رہا تھا۔

''کیا کہہ رہے ہو؟'' ارجن سنگھ نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ''اسے تم یہاں کیوں نہیں لائے؟''

''اس نے آنے سے انکار کر دیا کہہ رہی تھی ڈاکو

اسے دیکھ لیں گے تو جان سے مار دیں گے۔ صاحب جلدی کریں۔" حوالدار کے لہجے میں عاجزی تھی۔

"چلو تم بھی جیپ میں بیٹھ جاؤ۔" ارجن سنگھ نے کہا اور مزید چھ مسلح پولیس مین ساتھ لے کر جیپ دوڑا دی۔ راستے میں بار بار پوچھ کر اس نے اطمینان کرلیا کہ ویرو یقیناً وہاں آئی ہوئی ہے اور اس پر پولیس کا سخت پہرہ ہے حوالدار سے تمام یقین دہانی ہونے کے بعد ارجن سنگھ مسکرایا اور مونچھوں کو تاؤ دینے لگا۔

⊛ ❀ ⊛

جگت کے باپو، جس جگہ زیر حراست تھے وہ اسکول گراؤنڈ فلور کے چھت والے مکان میں تھا۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ کے کوئی مہمان آنے والے ہیں اور وہ اسکول میں ٹھہرائے جائیں گے اس طرح کا پروپیگنڈا کیا جارہا تھا۔ گاؤں کا ایک حوالدار اور چھ مسلح پولیس کانسٹیبل سوہن سنگھ کی نگرانی کررہے تھے۔ آخری ہنگامے کے بعد آٹھ دس دن تک جگا کی جانب سے بھی خاموشی رہی تھی۔ اس لیے ارجن سنگھ کو شک تھا کہ جگا زخمی ہے۔ سوہن سنگھ کو حراست میں لینے کے لیے یہی سوچ کر اس نے جلدی سے قدم اٹھایا تھا۔ زخمی جگا باپ کو چھڑانے کے سلسلے میں ویرو کو سپرد کردے گا اس نے یہی سوچا تھا۔

سوہن سنگھ کو جب گھر سے لایا گیا تھا تو انہوں نے سخت ناراضگی اور غصے کا اظہار کیا۔ سچویشن کافی بگڑ گئی تھی۔ "میں بھی ایک وقت میں صوبیدار تھا تم میرے ساتھ ایسی حرکت کیسے کرسکتے ہو۔" وہ گرم ہو کر بولے تھے۔

"مگر جب اسکول میں لاکر پولیس نے مہمان نوازی کا رول ادا کیا تو ان کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا دو تین دن بعد جب ارجن سنگھ ان سے ملنے آیا تو انہوں نے پوچھا۔

"مجھے یہاں رکوا کر تمہیں کیا ملے گا؟"

ارجن سنگھ نے ہلکے سے مسکرا کر کہا۔ "محترم یہاں آپ کو کیا دکھ ہے؟ کچھ دن ہمارے رسک پر آپ کو آرام کرنا ہے یہ سمجھ کر خاموش رہیں۔"

"مگر گھر والے فکرمند ہوں گے۔" سوہن سنگھ نے کہا تھا۔

"وہ فکرمند نہیں ہوں گے۔" ارجن سنگھ نے کہا۔ "آپ کے سسر کے ساتھ میری تفصیلی بات ہوچکی ہے۔ جس کی رو سے جگت ویرو کو ہمارے سپرد کردے گا اس بارے میں وہ بھی راضی ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے اس عورت کی وجہ سے مجھے قید کیا گیا ہے۔" سوہن سنگھ ویرو کا نام سن کر سرخ ہوگئے۔

"آپ اس طرح گرم نہ ہوں محترم۔" ارجن نے انہیں ٹھنڈا کیا۔ "نانا خود کہہ رہے تھے کہ دشمن کی عورت کو جگت اپنے ساتھ رکھے اس بات سے انہیں سخت اختلاف ہے۔ جگت نے ایسا کیوں کیا؟ میری سمجھ سے باہر ہے گھر میں بیوی ہونے کے باوجود غیر عورت کو اغوا کرنے سے آپ کے خاندان کی بدنامی ہوئی ہے۔" پھر آہستہ سے کہا۔ "پولیس ڈیپارٹمنٹ کو بھی اس اغوا کے کیس کو انجام تک پہنچانا ہے۔"

سوہن سنگھ پر ارجن کی بات سے کافی اثر ہوا جگت کے نانا نے پولیس کا ساتھ دیا تھا پھر انہیں کیا کہنا تھا؟ پھر بھی انہوں نے پوچھا۔

"پھر تم نے گھر کی تلاشی کیوں لی؟"

ارجن نے عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "ہمیں یہی ظاہر کرنا تھا۔" پھر جاتے ہوئے بولا۔ "کسی طرح آپ کو تکلیف نہ ہو حوالدار کو میں نے تاکید کردی ہے۔" پھر اس کے ہاتھ میں ایک کتاب دیتے ہوئے کہا۔ "گروگرنتھ لایا ہوں فالتو بیٹھے ہوئے

بھگوان کا نام لیں۔"

سوہن سنگھ کو پولیس چیف شریف آدمی دکھائی دیا۔ حکومت کی ملازمت میں ایسا بھی کرنا پڑتا ہے اس بات کا انہیں بھی تجربہ تھا۔ دشمن کی بیوی کو اغوا کر کے جگت نے مفت کا جھگڑا مول لیا تھا بابو یہ محسوس کرنے لگے۔

چوتھے دن دوپہر ان کے برآمدے میں حوالدار چارپائی پر بیٹھا تھا کہ بڑے پھاٹک کے قریب کسی عورت کو پولیس والوں سے بات کرنے کی آواز سنائی دی۔ دونوں کے درمیان کچھ بحث ہو رہی تھی پھر کچھ دیر بعد اس عورت کو وہیں روک کر ایک سپاہی حوالدار کے پاس آیا۔

"صاحب ایک عورت آپ سے ملنا چاہتی ہے۔"

"کون ہے مجھ سے اسے کیا کام ہے؟" حوالدار نے متجسس لہجے میں پوچھا۔

"صاحب وہ اپنا نام نہیں بتاتی کہتی ہے صاحب کا خاص کام ہے جلدی ملنا ہے۔" سپاہی نے بتایا۔

"جاؤ اسے بھیج دو مگر تم پھاٹک پر رہو گے اور گہری نگرانی کرو۔"

حوالدار نے اپنی پگڑی ٹھیک کر کے کمر پر پستول کا پٹہ درست کیا پھر آنے والی عورت کا تصور کرنے لگا۔ وہ دوپٹے سے چہرے کا پسینہ خشک کرتی ہوئی حوالدار کے قریب آ گئی۔ جوان' خوب صورت اور اچھے گھر کی عورت نظر آ رہی تھی۔ حوالدار نے سوچا کہیں جگا کی بیوی تو نہیں ہے؟ مگر وہ کس سلسلے میں آئی ہو گی؟ جگا کے باپ کی یہاں موجودگی کے متعلق اس نے کسی کو نہیں بتایا۔ پھر بھی وہ چوکس ہو کر بیٹھا رہا۔ وہ اس کے قریب کھڑی ہو گئی۔ دھوپ کی وجہ سے اس کا حسین چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ہانپنے کی وجہ سے اس کے سینے کا ابھار نظر کو روک رہا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے وہ گھبراہٹ کی وجہ سے پیچھے دیکھ لیتی تھی۔

"تم کون ہو؟ کس سے کام ہے؟" حوالدار نے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"صاحب...... صاحب......!" وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر ہچکچا کر رک گئی۔ پھر اندر کی جانب دیکھ کر پوچھا۔

"کوئی اندر ہے؟"

"کیا مطلب؟" حوالدار مشکوک ہو گیا۔ اس نے سخت لہجے میں کہا۔

"تم کون ہو اور یہاں کس کام سے آئی ہو؟"

وہ بہت زیادہ گھبرا گئی۔ "صاحب پولیس انسپکٹر اندر ہیں مجھے ان سے کام ہے۔" اس عورت نے کہا۔

"پہلے تم اپنا نام اور کام بتاؤ پھر میں جواب دوں گا۔" حوالدار کی آنکھوں سے تجسس جھلک رہا تھا۔

"میرا نام ویرو ہے۔" اس عورت نے کہا۔ "میں جگا ڈاکو کے پاس سے فرار ہو کر آئی ہوں۔"

یہ سن کر حوالدار سن ہو گیا۔ اس نے پہلے ویرو کو کبھی دیکھا نہیں تھا مگر اب اس کا نام سننے کے بعد اس کو دیکھنے سے زیادہ ضروری اس کی بات سننا تھا۔ پستول ہاتھ میں لے کر وہ جلدی سے بولا۔

"یہاں بیٹھو اور آرام سے بات کرو۔" حوالدار نے اسے چارپائی کے برابر زمین پر بیٹھنے کو کہا مگر وہ کھڑی رہی۔

"کیا آپ پولیس انسپکٹر ہیں؟"

"نہیں میں حوالدار تلوار سنگھ ہوں۔" وہ اکڑ کر بولا۔ "مگر جب تک تم مجھے پوری بات نہیں بتاؤ گی اس وقت تک پولیس انسپکٹر کی تم سے ملاقات نہیں ہو گی۔" حوالدار سوچ رہا تھا کہ ویرو اس کے ہاتھ لگ گئی ہے لہٰذا اس قضیے کو اسے ممکن حد تک اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہیے۔

"آپ کے ساتھ اکیلے میں بات کرنا پڑے گی۔"
ویرو نے نظریں جھکا کر کہا پھر آس پاس بدحواس نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "اگر ڈاکو میرا تعاقب کرتے ہوئے ادھر آ گئے اور میں دکھائی دے گئی پھر......!"

حوالدار کھڑا ہو گیا۔ ڈاکو اگر اس کے تعاقب میں ہوں تو اس صورت میں انعام و اکرام سے زیادہ خطرے کی توقع تھی۔

"چلو ہم اندر بیٹھ کر باتیں کریں گے۔" ویرو کے آگے چلتے ہوئے حوالدار نے کہا۔ پہرے پر موجود چار مسلح پولیس والے حوالدار کے ساتھ ایک عورت کو آتے ہوئے متعجب نظروں سے دیکھنے لگے۔ حوالدار نے ایک جوان کو قریب بلایا اور پھر ان کے کان میں کہا۔ "شاید ڈاکو اس طرف آئیں گے اس لیے چوکنے رہو۔"

حوالدار ویرو کو کمرے میں لے جا رہا تھا مگر اس کے قدم رک گئے وہ شرما کر بولی۔

"ہم دونوں کو اکیلے سمجھ کر شاید وہ لوگ کچھ اور سمجھ رہے ہوں گے۔"

حوالدار نے محسوس کیا یہ عورت کافی چالاک ہے ویرو حوالدار کا چہرہ دیکھتی ہوئی اس کے چہرے کے تاثرات پڑھنے لگی۔ پھر آہستہ سے بولی۔ "آج صبح کے وقت جگا کی پارٹی کے ساتھ جا رہی تھی بہت دن سے فرار کا موقع تلاش کر رہی تھی صبح حاجت کے بہانے کچھ دور ہٹ گئی اور ایک ریڑھا جا رہا اس میں چپکے سے سوار ہو گئی۔ جہاں ریڑھے کا راستہ دوسری طرف جاتا تھا۔ وہاں سے اتر کر چھ سات میل چھپتی چھپاتی اس طرف آئی تو مجھے پتا چلا کہ اسکول میں کوئی بڑے مہمان آنے والے ہیں اور یہاں پولیس کا کیمپ پڑا ہوا ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ میں گھر تک پہنچ نہیں سکوں گی ڈاکوؤں کے کسی مخبر کو پتا چل گیا تو وہ مجھے جان سے مار دے گا اس لیے پولیس کی حفاظت میں آ گئی ہوں۔"

ویرو نے گھبرائے ہوئے لہجے میں تفصیل سنا دی۔ حوالدار گہری نظروں سے اس کے چہرے کا جائزہ لیتا ہوا اس کی باتیں سننے لگا پھر پوچھا۔

"پھر تم گھر چھوڑ کر جگا کے ساتھ کیوں فرار ہو گئی تھیں۔"

"میرے خاندان سے جگا کی پرانی دشمنی ہے یہ آپ جانتے ہیں میں نے فیصلہ کیا کہ جگا کا اعتماد حاصل کر کے اسے کھانے میں زہر دے دوں گی یا دوسرے طریقے سے......!" ویرو کچھ دیر رک گئی۔ اس کی آنکھیں چاروں طرف گردش کر رہی تھیں۔ "مگر جگا کسی پر اعتماد نہیں کرتا اس لیے اسے ختم نہ کر سکی بلکہ الٹی پھنس گئی۔" ویرو کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

"اس کا مطلب ہے تم ڈاکوؤں کے ساتھ بھٹک رہی تھیں؟" حوالدار نے پوچھا۔

"جی ہاں وہ مجھے ذرا دیر الگ نہیں کرتے تھے۔" ویرو نے سر ہلا کر جواب دیا۔

"پھر تو تم ان کے متعلق تمام واقفیت رکھتی ہو گی؟" حوالدار نے نرم لہجے میں کہا۔

"کیوں نہیں میں پولیس کا ساتھ دے کر اسے ختم کرا دوں گی" ویرو نے خوش ہو کر کہا۔

"اچھا تو پھر یہ بتاؤ کہ ڈاکوؤں کا اڈہ کہاں ہے اور وہ لوگ کتنے آدمی ہیں؟" حوالدار نے جلدی سے پوچھا ویرو مسکرا دی۔

"پہلے تم مجھے انسپکٹر صاحب سے ملا دو پھر میں اپنے شوہر کے سامنے سب کچھ بتا دوں گی۔"

حوالدار ہونٹ کاٹنے لگا مگر اس وقت ویرو کو ناخوش کرنا مناسب نہیں تھا اس لیے اس نے کہا۔

"اچھی بات ہے پھر میرے ساتھ شیخوپورہ پولیس ہیڈ آفس چلو صاحب وہاں ملیں گے۔" حوالدار نے اٹھتے ہوئے کہا۔

ویرو بری طرح گھبرا گئی۔

"نہیں، نہیں......!" اس نے کپکپاتے لہجے میں کہا۔

"ڈاکو دیکھ لیں گے تو مجھے پھونک دیں گے تم صاحب کو یہیں لے آؤ اس وقت تک میں اسی جگہ چھپی رہوں گی۔" ویرو کے ان الفاظ نے حوالدار کو الجھن میں ڈال دیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اسے خود جانا چاہیے یا کسی کے ہاتھ انسپکٹر صاحب کو پیغام بھیج دے مگر نہیں وہ ایسی خوشخبری خود لے کر جائے گا۔ دوسرے کو فائدہ کیوں پہنچایا جائے؟" حوالدار نے سوچا' پھر وہ تیار ہو گیا۔

"میں تمہاری بات پر یقین کرتے ہوئے صاحب کے پاس جا رہا ہوں تم نے بھی کوئی غلط حرکت کی تو یہ سپاہی تمہیں گولی مار دیں گے سمجھیں۔" حوالدار نے ویرو کو ڈرایا۔

"صاحب آپ بھی دھمکی دے رہے ہیں' میں تو سوچ رہی تھی کہ ڈاکو ہی ایسے ہوتے ہیں۔" ویرو نے ایک ادا کے ساتھ کہا۔

"تم سمجھتی نہیں ہو سپاہی حکم کے تابع ہوتے ہیں۔ انہیں شک ہوا ایسا کوئی کام نہ کرنا۔" حوالدار نے اسے سمجھایا۔

"اچھی بات ہے مگر تم انہیں نہ بتانا کہ میں کون ہوں۔" ویرو نے ہنستے ہوئے کہا۔ گھوڑا تیار کرا کر حوالدار باہر آیا جاتے ہوئے اس نے پہریداروں سے کہا۔

"یہ عورت خاص اطلاع لے کر آئی ہے اسے ادھر اُدھر نہ ہونے دینا نہ اسے پریشان کرنا۔ سمجھے' میں ابھی صاحب کو لے کر آتا ہوں۔"

ایک میل کے فاصلے پر جا کر اس نے محسوس کیا کہ وہ ویرو کو کمرے میں بند کر آتا تو اچھا تھا مگر اب واپس لوٹنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ آگے بڑھنے لگا۔ اگر وہ لوٹتا تو شاید بازی الٹ جاتی۔

ویرو چوکنا نظروں سے جائزہ لے رہی تھی۔ اس نے سمجھ لیا کہ پولیس جس کمرے کے چکر لگا رہی ہے وہیں جگت کے باپو کو رکھا گیا ہے۔ کچھ دیر تک وہ برآمدے میں بیٹھ کر کچھ کنکریاں ہاتھ میں لے کر کھیلنے لگی۔ پولیس والوں کو اس کا کھیل دیکھ کر دلچسپی ہوئی۔ اتنی بڑی عورت کو ایک چھوٹی سی لڑکی کی طرح کنکری کا کھیل کھیلتے دیکھ کر ایک سپاہی قریب آ گیا۔ اسے اپنی جانب متوجہ پا کر وہ مسکرا دی وہ بالکل قریب آ گیا ویرو نے ترچھی نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"کنکری کھیلو گے؟" سپاہی ہنس دیا ویرو نے التجا کی۔ "مجھے پیاس لگی ہے پانی ملے گا۔"

پیاس کا لفظ سپاہی کو اچھا لگا۔ اس نے پیاسی نظروں سے اسے دیکھ کر کہا۔ "منگوا دیتا ہوں۔"

"نہیں مجھے بتاؤ میں لے آؤں گی۔" ویرو کھڑی ہو کر بولی۔

"مٹکا اندر والے کمرے میں ہے مگر تم وہاں نہیں جا سکتیں۔" سپاہی نے صاف صاف کہا۔

"اچھا کیا کوئی مہمان اندر ہے۔" ویرو نے معصوم لہجے میں پوچھا۔

"ہاں۔" سپاہی نے مختصر سا جواب دیا اور پانی کا پیالہ منگوا دیا۔ ویرو کو الجھن ہوئی۔ وہ جگت کے باپو کو اشارہ کرنا چاہتی تھی کہ تیار رہیں وہ لوگ آ رہے ہیں۔ پھر پانی پی کر اس نے ہاتھ میں تھامی کنکریاں زور سے ایک کے بعد ایک اسکول کی عقبی دیوار پر پھینکیں۔ اس طرح کھیلتے ہوئے دو چھوٹے پتھر اسکول کی دیوار پار کر

کے پیچھے کھیت میں گرے۔ یہ کھیت اسکول کی عقبی دیوار کے پاس تھا پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق جگت، بچن اور دوسرے چار ساتھی وہیں چھپے ہوئے تھے۔ ویرو کا اشارہ ملتے ہی گیٹ والی سمت سے دو آدمیوں کے آپس میں جھگڑا کرنے کی آواز آنے لگی۔ شور بلند ہوا جھگڑا بڑھ گیا۔ گالیاں سنائی دینے لگی۔ ایک سپاہی اور دو پہریدار دیوار پر چڑھ کر یہ دیکھنے جھکے کہ پیچھے کیا ہو رہا ہے مگر اسی لمحے نیچے لڑنے والے دو آدمیوں نے مٹھیاں بھر کر مرچیں ان کے منہ پر پھینکیں وہ آنکھیں ملتے ہوئے زمین پر گرے ان کی مدد کے لیے مزید دو سپاہی آ گئے۔ اتنی دیر میں دوسری جانب سے جگت اور بچن دیوار کود کر اندر آ گئے۔ جگت نے آواز دی۔

''خبردار! اگر کسی نے حرکت کی تو ہم پھونک دیں گے۔'' اسی لمحے دوسرے دو ساتھی اندر کود گئے۔ مرچوں نے پولیس والوں کو گھبرا دیا۔ وہ چھینکتے اور آنکھیں ملتے رہے۔ اتنی دیر میں ڈاکو انہیں گھیر چکے تھے مگر ابھی پھاٹک والوں کو گھیرنا باقی تھا۔ گھرے ہوئے سپاہیوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ جگت اور ویرو کمرے میں گئے۔ سوہن سنگھ شور سن کر چونک گئے مگر انہیں معلوم نہ تھا کہ جگت انہیں آزاد کرانے آیا ہے۔ باپ بیٹا گلے ملے۔ مگر جیسے ہی سوہن سنگھ کی نظر ویرو پر پڑی ان کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ وہ جگت سے دور ہٹ گئے۔

''باپو آپ یہیں رہیے گا میں سپاہیوں کو ٹھکانے لگا کر آتا ہوں۔'' جگت نے کہا۔

پھر بھی وہ کچھ نہیں بولے۔ جگت سمجھ گیا کہ ویرو کو دیکھ کر باپو ناراض ہیں۔ ویرو کو ساتھ لے کر وہ باہر آیا۔ اتنی دیر میں بچن کہیں سے ڈور حاصل کر کے تین پولیس والوں کو مضبوطی سے باندھ چکا تھا۔ چوتھے کو جگت نے دھمکایا۔ ''جو میں کہتا ہوں وہ کرو ورنہ جان سے مار دوں گا سمجھے۔'' جگت رائفل تانے اور بچن موٹا ڈنڈا پکڑے کھڑے رہے۔ سپاہی کپکپانے لگا جگت نے حکم دیا۔ ''باہر پہرے پر موجود شخص کو یہاں بلاؤ اسے ذرا سا اشارہ کیا تو میں تمہیں گولی مار دوں گا۔''

پولیس والے نے پہرے دار کو آواز دے کر ہاتھ کا اشارہ کیا۔ جگت اور بچن دیوار کی آڑ میں کھڑے ہو گئے۔ دوڑ کر آتے ہوئے پہریدار کے جوتے کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔ پہریدار اندر داخل ہوا اور ابھی کچھ پوچھنا چاہتا تھا کہ اس سے پہلے بچن نے عقب سے اس کی گردن میں ہاتھ ڈال دیا وہ چیخ اٹھا۔ بچن نے اس کی پشت پر ڈنڈے کی نوک لگا کر کہا۔ ''بندوق پھینک دو۔'' اس نے رائفل پھینک دی۔ فوراً ہی دو آدمی دوڑ کر جلدی سے گھوڑا اندر لے آئے۔ جگت نے اندر جا کر تین سپاہیوں کو کمرے میں دھکیل دیا اور اپنے باپو کو باہر لے آیا۔ بچن نے دو کو کھمبے سے باندھ دیا اور ان کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا سوہن سنگھ کو گھوڑے پر بٹھا کر جگت نے چیلنج کیا۔

''اپنے انسپکٹر سے کہہ دینا جگا اپنے باپو کو آزاد کرا کر لے گیا ہے اب اگر تم نے میرے کسی رشتے دار کو ہاتھ لگایا تو میں اس کے پورے خاندان کو ختم کر دوں گا۔'' پھر مزید کہا۔ ''اسے یہ بھی بتا دینا کہ ویرو یہاں اس لیے آئی تھی کہ تمہیں یقین ہو جائے کہ وہ بھی ہماری پارٹی کی ممبر بن گئی ہے۔'' پھر باہر کر آ کر بچن سے بولا۔ ''تم سب لوگ ویرو کو لے کر اڈے پر پہنچ جاؤ میں باپو کو کسی ریڑھے میں بٹھا کر آتا ہوں۔'' اور یہ سب کچھ ایک گزرتے ہوئے طوفان کی طرح ہو گیا۔

بیٹے نے خطرہ مول لے کر انہیں آزاد کرایا یہ ان کے لیے مسرت کی بات تھی مگر ان کے چہرے پر سنجیدگی نظر آنے لگی۔ جگت نے ان سے بات کرنے کی غرض سے کہا۔

"باپو آپ کو پولیس والے تنگ تو نہیں کرتے تھے۔"

"بالکل نہیں۔" سوہن سنگھ نے مختصر سا جواب دیا۔ جگت کو یہ اچھا محسوس نہیں ہوا مگر اس نے بھی چپ سادھ لی۔ رتیا کی سمت جاتے ہوئے ریڑھے میں بیٹھ کر اس نے باپو سے کہا۔

"باپو کیا اب بھی مجھ سے ناراض ہیں؟" جگت کا محبت بھرا لہجہ دیکھ کر باپ کا دل پگھل گیا۔ مگر ویرو کا خیال کرتے ہوئے پھر ان کے چہرے پر سختی آ گئی۔

تم نے مجھے آزاد کرایا اس سے خوشی ہوئی۔ مگر تم دشمن کی مفرور عورت کو ساتھ کیوں لائے؟"

جگت کے دل کو باپو کے الفاظ سن کر دکھ ہوا مگر وہ نرم لہجے میں بولے۔

"اب وہ دشمن کی عورت نہیں رہی۔"

"تو کیا وہ تمہاری ہوگئی ہے۔" باپو کے منہ سے اچانک نکل گیا جگے کی آنکھیں پھیل گئیں۔ غصے میں وہ کہہ دینا چاہتا تھا کہ

"ہاں میری ہوگئی ہے۔" مگر کچھ بولے بغیر ہونٹ کاٹتا ہوا گھوڑی پر چڑھ گیا۔ پھر پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر اس نے گھوڑی دوڑا دی۔ سوہن سنگھ اسے نظروں سے اوجھل ہونے تک دیکھتے رہے۔

❁ ❀ ❁

حوالدار کے ساتھ جیپ میں آتے ہوئے ارجن سنگھ نے راستے سے موہن سنگھ کو ساتھ لینا ضروری سمجھا کیونکہ اس نے کہا تھا کہ اپنے شوہر کی حاضری میں جگا کے متعلق اطلاع دے گی۔ یہ بات اسے حوالدار نے بتائی تھی۔ پھر رتیا گاؤں بھی راستے میں پڑتا تھا۔ اس لیے وقت ضائع کرنے کا سوال نہیں تھا۔ گھر سے روانہ ہوتے ہوئے موہن سنگھ چاچی کو خوشخبری دینے سے خود کو نہ روک سکا۔

"چاچی، ویرو پولیس کی حراست میں ہے ڈاکوؤں کے پاس سے فرار ہو کر آئی ہے۔ میں اسے لے کر ابھی آتا ہوں۔" اس کے کہنے پر چاچی مسرت سے دیوانی ہوئی۔ شکار ہاتھ آ رہا تھا۔

رتیا سے آدھے میل کے فاصلے پر آتے ہوئے ریڑھے کو کراس کر کے ارجن کی جیپ تیز رفتاری سے دوڑتی ہوئی آگے نکل گئی۔ ارجن سنگھ یا حوالدار نے پیچھے مڑ کر لمحہ بھر بھی دیکھ لیا ہوتا تو انہیں ریڑھے میں سوہن سنگھ بیٹھے نظر آتے مگر کامیابی کا نشہ جب چڑھ جاتا ہے تو آدمی کو کسی جانب دیکھنے کا ہوش نہیں رہتا۔

اسکول کے پھاٹک کے قریب آ کر جیپ کھڑی ہوگئی۔ حوالدار کو تعجب ہوا پہرے دار کیوں حاضر نہیں ہوا؟ ارجن سنگھ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"عورت کی خدمت میں اندر چلا گیا ہے گیا؟"

پھر جیپ رکتے ہی وہ لوگ کود کود کر اترتے۔ ارجن سنگھ دوڑتا ہوا پھاٹک میں داخل ہوگیا۔ موہن سنگھ اور حوالدار اس کے عقب میں دوڑ رہے تھے مگر اندر داخل ہوتے ہی ارجن سندھ کے پیروں کو جیسے زمین نے پکڑ لیا۔ پول سے دو پولیس والے بندھے ہوئے تھے جن کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ وہ تھرا کر رہ گیا۔ حوالدار کے سامنے اس نے آنکھیں پھیلا کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ ارجن سنگھ نے بایاں پیر اٹھا کر حوالدار کے پیٹ میں ٹھوکر مارنی چاہی مگر پھر وہ گرج دار آواز میں بولا۔ "بڑے ٹھاٹھ سے مجھے خوشخبری سنانے دوڑ آیا تھا۔ یہاں میری عزت کو نیلام کرادیا۔

حوالدار کے پیر کانپ رہے تھے۔ ارجن سنگھ نے پھر چیخ کر کہا۔ "اب ان کے منہ کھولو تاکہ تمہاری اور میری ناموس کی داستان سننے کو ملے۔"

موہن سنگھ کا چہرہ سفید ہو رہا تھا وہ یہ سوچ کر آیا تھا

کہ ویرو کو گھر لاتے ہی سخت سزا دے گا پولیس والوں کو رسیوں کی قید سے آزاد کیا گیا تو انہوں نے سارا واقعہ بتایا۔

"ہاں اب تم بھی گھر جا کر چوڑیاں پہن لو۔" ارجن سنگھ کا غصہ آسمان سے باتیں کر رہا تھا

"دوسرے تین سپاہی کہاں گئے؟" حوالدار نے پوچھا۔

"اس کمرے میں ڈاکو انہیں باندھ کر گئے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے جگا نے اپنے باپ کو چھڑانے کے لیے یہ چال کھیلی تھی۔" ارجن سنگھ سوچتے ہوئے بولا۔

"جی ہاں جناب آدھے گھنٹے پہلے جگا اسے لے گیا۔" ایک پولیس والے نے بتایا پھر اسی نے ارجن سنگھ کو جگا کا پیغام سنایا۔ ارجن سنگھ کا رکا ہوا ہاتھ سپاہی پر اٹھ گیا اور ایک زوردار چانٹا سپاہی کے منہ پر پڑا۔

"بزدل تم اس طرح تذکرہ کر رہے ہو جیسے بہادری کی بات ہو۔"

ارجن سنگھ فوراً جیپ میں بیٹھ گیا ڈاکوؤں کا تعاقب کرنے کے لیے حوالدار اور دو پولیس والے ساتھ لیے۔ موہن سنگھ احمقوں کی طرح منہ پھاڑے دیکھ رہا تھا۔ گھر پہنچنے کے لیے اس کے پیروں میں جان نہیں تھی۔

❁ .... ❁ .... ❁

چاچی نے پندرہ منٹ میں پورے گاؤں کو بتا دیا کہ ویرو ڈاکوؤں کے پاس سے فرار ہو کر پولیس کی حفاظت میں آ گئی ہے۔ اس وقت جگت کے گھر پر اس کے تایا بھی بیٹھے ہوئے تھے ارجن سنگھ نے وعدہ کیا تھا لہٰذا سورج غروب ہونے سے پہلے سوہن سنگھ یقیناً گھر آ جائیں گے اسی اطمینان پر تایا گھر آ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ مگر شام ڈھلنے کے باوجود جب سوہن سنگھ کی آمد کا پتا نہیں چلا تو وہ کافی بے چین ہو گئے۔ اسی دوران ویرو والی بات سنائی دی اس لیے بھی الجھن میں گرفتار ہو گئے۔ تایا نے سوچا یقیناً ارجن سنگھ کو پتا تھا کہ ویرو پولیس کی حفاظت میں آ جائے گی تبھی اس نے چوبیس گھنٹے میں سوہن سنگھ کو رہا کرنے کا وعدہ کیا تھا جب وہ ارجن سنگھ کے پاس تھے اس وقت ایک پیغامبر خاص پیغام لے کر آیا تھا اس سے پر پوری کڑی مل گئی۔ مگر چندن بے چین ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ویرو نے ایسا کیوں کیا؟ جگت سے الگ ہو کر وہ بھاگ آئی ہو گی۔ ماں جی کا دماغ تو اس چکر کو سمجھنے میں ناکام رہا تھا مگر چندن نے جیسے ہی لالٹین جلا کر دروازے کے درمیان لٹکائی تو اس کے اجالے میں سوہن سنگھ برآمدہ میں داخل ہوتے ہوئے نظر آئے چندن کے چہرے پر مسرت چھا گئی۔

"لو...... وہ آ گئے۔" تایا نے ہنس کر کہا۔ ماں جی جگت کے باپو کو نظر بھر کر دیکھنے لگیں۔ ان کا خیال تھا کہ سوہن سنگھ کا جسم سوکھ گیا ہو گا مگر وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھے۔ انہوں نے فوراً پانی کا لوٹا سوہن سنگھ کے قریب رکھا۔ سوہن سنگھ نے ہاتھ منہ دھو کر دو گھونٹ پانی پیا پگڑی کھونٹی پر رکھ دی اور چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"ارجن سنگھ نے اپنا وعدہ پورا کیا۔" تایا نے بات شروع کرتے ہوئے کہا۔

"کون سا وعدہ۔" سوہن سنگھ کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

"تم کو رہا کرنے کا۔"

"مگر مجھے اس نے رہا نہیں کیا بلکہ جگت نے آ کر رہا کرایا ہے۔"

"اچھا؟" تینوں نے ایک ساتھ کہا جگت کی ماں بیٹے کی بہادری پر واری ہو گئی۔ چندن کا دل مسرت سے ڈولنے لگا۔

"یہاں تو ہم نے یہ سنا تھا کہ دشمن کی بیوی پولیس کی حفاظت میں آ گئی ہے؟" تایا نے پرتشویش لہجے میں سوال کیا۔

"تم نے غلط سنا ہے۔" سوہن سنگھ نے غصیلے لہجے میں کہا۔ "وہ جگت کے ساتھ مجھے رہا کرانے آئی تھی۔" چندن کے لیے یہ دگنی مسرت تھی مگر سسر کے الفاظ سن کر اس کے دل کو دھچکا سا لگا۔

"اب جگت اسے دشمن کی بیوی نہیں مانتا۔ میں نے اس سے کہہ دیا کہ وہ دشمن کی نہیں تو کیا تیری بیوی ہے؟"

تایا کو دوسری فکر لگ گئی۔

"اب کیا ہوگا؟"

یہی سوال چندن کے دل میں کھٹک رہا تھا۔

***

سب ساتھی خوش تھے۔ ارجن سنگھ کو دوہری شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ چال کامیاب ہوئی تھی پھر ویرو نے ہمت کر کے جس طرح حوالدار کو بے وقوف بنا کر جگت کے باپو کو چھڑانے میں اپنا کردار حسن وخوبی سے ادا کیا اس سے جگا کو اپنے کام میں آسانی ہوئی تھی۔ مگر جگت خود اس خوشی میں شامل نہیں تھا۔ ویرو کے متعلق باپو کے کہے ہوئے الفاظ اس کے لیے سوہان روح بن گئے تھے۔ پہلے باپ دادا کے دشمنوں سے عداوت، پھر پولیس سے جنگ، اب کیا گھر والوں سے بھی لڑنا پڑے گا۔ کیا ویرو کو آسرا دینا گناہ تھا؟ وہ ایک عورت کی مجبوری کیوں نہیں سمجھتے؟

نشہ کر کے تمام ساتھی بھنگڑا ڈالنے میں مشغول تھے۔ جب کہ ویرو اور جگت ہنومان کے بستر کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ ہنومان کا دل بھی خوشی سے لبریز تھا مگر اپنی حالت دیکھ کر اس کا چہرہ اتر گیا۔ اب وہ ڈاکے ڈالنے میں ان کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ یہ خیال بار بار اسے پریشان کر رہا تھا۔ کیا اسے ساری زندگی دوسروں کے سہارے زندہ رہنا پڑے گا۔ کسی قسم کی دوڑ بھاگ نہیں۔ پولیس سے مقابلے میں گولیوں کی سنسناہٹ، ڈاکہ ڈالنے کے لیے چھاپے ڈالنا یہ سب کچھ اب صرف ایک خواب بن گیا تھا۔ گولی کے زخم بھر گئے تھے مگر کمر اکڑ گئی تھی۔ وہ بمشکل بیٹھ سکتا تھا۔ ساتھیوں کو مست ہو کر رقص کرتے ہوئے دیکھ کر اس کے پیر بھی حرکت کر رہے تھے مگر اب وہ کبھی اس طرح رقص نہیں کر سکے گا۔ یہ سوچ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ویرو نے پوچھا۔

"ہنومان ویر آپ کی آنکھوں میں آنسو کیوں؟"

ہنومان کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ "ویرو بہن یہ تو مسرت کے آنسو ہیں میرے دوست جگت کا نام مشہور ہوا یہ دیکھ کر اطمینان سے مر سکوں گا۔" ہنومان نے کہا۔

"بہادر کی زبان پر مرنے کی بات اچھی نہیں لگتی ویر جی۔" ویرو نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"دیکھنا مہینے دس دن میں تم کھڑے ہو جاؤ گے۔"

سامنے بھنگڑا ہو رہا تھا۔ برابر میں ویرو اور ہنومان باتیں کر رہے تھے مگر جگت کسی دوسری دنیا میں تھا۔ وہ چپ بیٹھا ہوا تھا۔ ویرو جانتی تھی کہ جگت کے باپو نے اسے دیکھ کر منہ پھیر لیا تھا اس وقت سے وہ بھی دل ہی دل میں ڈر گئی تھی۔ اس نے جگت کا غمگین چہرہ دیکھ کر اندازہ کیا تھا کہ یقیناً باپ بیٹے میں اس کے سبب تلخ گفتگو ہوئی ہوگی لیکن جگت سے اس کی تصدیق کرنے کے لیے تنہائی کی ضرورت تھی۔ موسم گرما کی رات نصف منزل سے گزر چکی تھی۔ اب رات میں کچھ خنکی آ چکی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کی دھیمی دھیمی لہریں سونے والوں کو تھپکیاں دے رہی تھیں۔ مگر جگت بستر میں تڑپ رہا تھا۔ وہ بار بار پہلو بدل کر سونے کے لیے جدوجہد

کرنے لگا۔ اچانک اسے محسوس ہوا کوئی اس کی چارپائی پر بیٹھا ہے۔

"ویرو، تم اس وقت یہاں؟" چاند کے ہلکے اجالے میں ویرو کو دیکھ کر جگت چونکا۔ "کیا نیند نہیں آئی۔"

"میں بھی آپ سے یہی پوچھنے آئی ہوں۔ میں دور کھڑی دیکھ رہی تھی کہ آپ بار بار پہلو بدل کر سونے کی کوشش کررہے ہیں۔ شام کو بھی میں نے آپ کو اداس دیکھا تھا کیا بات ہے۔" ویرو نے بے چین لہجے میں پوچھا۔

جگت غور سے ویرو کو دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ اس کی آنکھوں سے درد اور پیار جھلک رہا تھا۔ جگت خاموش رہا۔ لہٰذا ویرو پھر بولی۔

"دیکھیں آپ کو کتنا پسینہ آرہا ہے۔" ویرو نے دوپٹے کے پلو سے جگت کا چہرہ خشک کرتے ہوئے کہا۔

"ارے آپ کا جسم تو دہک رہا ہے۔ اتنا تیز بخار ہونے کے باوجود بھی آپ خاموش ہیں۔ مجھے کیوں نہیں بتایا؟" یہ کہہ کر جگت کے سر کے قریب بیٹھ کر اس کا سر دبانے لگی۔ ویرو کے ہاتھوں کی چوڑیوں کی جھنکار سنائی دینے لگی۔ اس آہنگ میں ایک عجیب سا جادو تھا۔ عورت کے لمس نے اس پر عجیب کیفیت طاری کردی تھی۔ وہ ویرو کو پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ ویرو نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔

"کیا دیکھ رہے ہیں؟ پلکیں بند کر کے لیٹ جائیں ابھی نیند آجائے گی۔"

سعادت مند بچے کی طرح جگت نے آنکھیں بند کرلیں۔ لیکن کچھ دیر بعد خود بخود آنکھیں کھل گئیں وہ مسکرا کر بولا۔

"آنکھیں بند کرنے کے باوجود بھی تم ہی نظر آتی ہو تو تمہیں کھلی آنکھوں سے کیوں نہ دیکھوں؟" جگت کی آواز میں شرارت تھی۔

ویرو نے اس کا دھیان ہٹانے کے لیے کہا۔

"آپ نے مجھے بتایا نہیں کہ شام سے اداس کیوں ہیں؟ کیا بابو سے کوئی بات ہوگئی؟"

"جب تم سمجھ ہی گئی ہو تو کیوں پوچھتی ہو؟"

"مجھے آپ کی زبانی معلوم کرنا ہے۔" ویرو نے کہا۔ "بابو مجھے جن نظروں سے دیکھ رہے تھے کیا میں اتنی ہی خراب ہوں جگت۔"

"تم کیوں دل میلا کرتی ہو ویرو؟" جگت کا ہاتھ ویرو کی کلائی کی جانب بڑھ گیا۔ اس کے ہاتھ رک گئے۔ چوڑیوں کی جھنکار خاموش ہوگئی۔ جگت کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

"ساتھ رہ کر جدائی کیوں ویرو؟" جگت نے ویرو کی ہتھیلی کو اپنے پنجے کے درمیان دبایا۔ جگت کے جسم میں برقی رو دوڑنے لگی۔ ویرو اپنا ہاتھ نہ کھینچ سکی۔

"وہ لوگ تمہیں دشمن کی عورت کہتے ہیں تم کو الگ کرنا چاہتے ہیں، میں یہ سب فاصلے ختم کرنا چاہتا ہوں ویرو۔" دونوں جذبات کی رو میں بہہ رہے تھے۔ انہیں بات کرنا اچھا محسوس نہیں ہورہا تھا۔

"جگت سنگھ۔" ویرو کے ہونٹ شدت سے کپکپائے۔ "فاصلے کتنے ہی کم ہوں مگر انتقام کی آگ کم نہیں ہوتی۔" اس کے بعد وہ یہی سوچتے رہ گئے انہیں کیا کرنا چاہیے۔ ویرو بھرائے ہوئے لہجے میں صرف اتنا کہہ سکی۔

"میں جب سے پیدا ہوئی ہوں نحوست میرے گرد منڈلا رہی ہے میرے جنم کے فوراً بعد ایک بھائی چیچک سے مرگیا۔ باپ کا کھیت ضبط ہوگیا جس گھر میں بیاہ کر آئی وہ گھر برباد ہوگیا۔ اب میری پرچھائیں

آپ پر......!

جگت نے جلدی سے دوسرا ہاتھ ویرو کے سرخ ہونٹوں پر رکھ دیا۔

"ویرو تم اپنے آپ کو احساس کمتری میں کیوں مبتلا کر رہی ہو؟ مجھے یہ باتیں نہیں سننی سمجھیں؟" جگت کے ہاتھوں کے نیچے ویرو کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ اس کپکپاہٹ میں بڑی پیاس تھی۔ محبت کی پیاس۔ جگت کا ہاتھ شانے تک پہنچ گیا۔ ان کی رگوں میں برقی رو کی طرح خون دوڑنے لگا۔ جگت نے ویرو کا شانہ دبایا۔ پھر جذبات سے مغلوب ہو کر اسے جھٹکے سے اپنے قریب کر لیا۔ جگت کا چہرہ قریب ہوتے ہی ویرو کی آنکھیں برسنے لگی۔ گرم آنسوؤں کے قطرے جگت کے رخسار پر بہنے لگے۔ جگت کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔

"ویرو تم رو رہی ہو؟"

جگت کے ہاتھ کے جھٹکے سے جیسے ہی وہ اس کے سینے سے ٹکرائی اس کی چوڑی چھناکے سے ٹوٹ گئی۔ ٹوٹی ہوئی چوڑی کا ایک ٹکڑا فرش پر گرتے ہی عجیب سا شور ہوا اور اس کی آواز جگت اور ویرو کے دلوں کو چیر گئی۔

"ویرو جا سو جا۔" جگت نے کہا اور پہلو بدل کر لیٹ گیا۔ اس کی آواز میں دکھ جھلک رہا تھا۔ ویرو کھڑی ہو گئی اور جگت کے دونوں پیروں کو چھوتی ہوئی بھاری قدموں سے آگے بڑھ گئی باقی رات جگت اور ویرو نے جاگ کر گزاری۔ صبح کے وقت دونوں کے دلوں اور پلکوں پر بوجھ تھا۔

❁ ......❀...... ❁
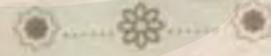
کرپال اور ہوشیار کو ڈاکے سے متعلق خبر فراہم کرنے کے لیے صبح سے بھیجا گیا تھا۔ کافی رات تک وہ واپس نہیں لوٹے تو جگت اور بچن کا دل گھبرانے لگا۔ دونوں بھیس بدل کر گئے تھے پھر بھی انہیں خوف محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں پولیس کے چکر میں نہ آ جائیں۔ خان ڈوگرا کے ایک زمیندار کے گھر ڈاکہ ڈالنے کا پروگرام بنایا گیا تھا۔ وہ بڑی آسامی تھی لہٰذا کافی مال ہاتھ لگنے کی امید تھی۔ ساتھ ہی ہوشیاری کی ضرورت بھی تھی۔ کیونکہ زمیندار نے دو شکاری کتے پالے ہوئے تھے جو چار چوکیداروں سے زیادہ تھے۔ خود زمیندار اچھا نشانے باز تھا۔ کرپال اور ہوشیار کو مفصل معلومات حاصل کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ تقریباً صبح چار بجے دونوں واپس لوٹے ان کے پیر لڑکھڑا رہے تھے۔ لہٰذا یہ سمجھنے میں مشکل پیش نہیں آئی کہ دونوں نشے میں ہیں۔ جگت اس حرکت کے ہمیشہ خلاف تھا۔ باہر جا کر گروہ کے کسی بھی شخص کے لیے نشہ کرنا منع تھا تاکہ وہ نشے کی حالت میں گروہ کا ٹھکانہ نہ بتا دے یا کسی دوسرے مشکل میں نہ پھنس جائیں۔ کرپال اور ہوشیار نے نا صرف اس حکم کو توڑا تھا بلکہ ان کی باتوں سے پتا چل رہا تھا کہ وہ کسی موتی بائی کے کوٹھے پر بھی رہے تھے۔ وہ نشے میں کہہ رہے تھے۔

"موتی بائی حسن کی دیوی تھی۔ کیا اس کا جوبن تھا۔ شباب اس کے جسم سے پھوٹ رہا تھا۔"

جگت کا دماغ گھوم گیا۔ اس نے آنکھیں نکالتے ہوئے دونوں کو گھورا کرپال اور ہوشیار اس کے غصے سے آگاہ ہو گئے لیکن پھر بھی نشے میں اس کی پروا کیے بغیر بکواس جاری رکھی۔ جگت کے ہاتھ حرکت میں آ گئے اس کا جی چاہا کہ وہ انہیں ایک ایک چانٹا جڑ دے مگر بچن نے معاملہ سنبھال لیا۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

⌘